بلاد فلسطین و شام

عہد حکومت اسلامی

Stringe, G. Lee

سلسلۂ نصاب عربیات علمیہ جامعہ عثمانیہ

بلاد فلسطین و شام

(عہد حکومت اسلامی)

تصنیف

جی۔ لی اسٹرینج

ترجمہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی

رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

۱۳۵۱ھ م ۱۳۴۱ف م ۱۹۳۲ء

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب پیلسٹائن ایکسپلوریشن فنڈز کمیٹی (لندن) کی
اجازت سے جس کو حق اشاعت حاصل ہے اُردو میں
ترجمہ کر کے طبع وشایع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

بلاد فلسطین و شام (عہد حکومت اسلامی)

حصہ اول

حصّۂ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فلسطین و بلاد شام

عہد حکومت اسلامی

جزو اوّل

مقدمہ

عرب جغرافیہ نویس

ماخذ تک رسائی کی غرض سے ذیل میں ایک فہرست ان عرب مورخین اور جغرافیہ نویسوں کی دیجاتی ہے۔ جن کی کتابوں سے آیندہ اوراق میں اقتباسات کئے گئے ہیں۔ پھر عربی متون کے جس نسخے سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کی کیفیت کے ساتھ ساتھ اجمالاً مصنفین کے سوانحی حالات بھی شامل کردئے ہیں۔ ان کے یا ان کی کتابوں کے متعلق زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو وہ علی العموم ہر نسخے کے، جس سے ہم نے معلومات اخذ کی ہے، مقدمہ میں ملجائیگی تاریخ اور جغرافئے پر قدیم سے قدیم عربی کتابیں نویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہیں، کیونکہ واضح رہے کہ مسلمانوں نے تالیف و تصنیف کا کام ہجرت سے پوری دو صدیاں گزر چکنے کے بعد آغاز کیا تھا۔ البتہ اس قرن سے یعنی نویں صدی کے قریب قریب

مقدمہ

وسط سے لیکر پندرھویں صدی مسیحی تک ، بہت ہی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے یکے بعد دیگرے ان مصنّفوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے شام و فلسطین کی مختلف ولایات کا بعض اوقات کافی تفصیل کے ساتھ ، حال بیان کیا ہے ۔ ان کی کل تعداد بیس سے اوپر ہے سب مسلمان ہیں اور تقریباً سبھی نے عربی میں اپنی کتابیں تالیف کی ہیں ۔

فہرست طویل ہے ۔ لیکن یہ بتا دینا چاہیئے کہ جن کتابوں کا ذیل میں ذکر ہے ، ان میں سے اکثر خود مصنّف کے مشاہدات یا ذاتی معلومات پر مشتمل نہیں ہیں ۔ عرب مصنّف اپنے متقدمین سے جس افراط کے ساتھ چیزیں اڑا لیتے ہیں ، وہ قابل تعجّب ہے ۔ اور اس زیر بار منّت ہونے کا ہمیشہ ، جیسا چاہیئے ، اعتراف بھی نہیں کرتے ۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلے جو کچھ کسی نے لکھا ہے وہ سب اپنی کتاب میں داخل کرلے اور جن بیان کردہ مقامات میں مصنّف کا خود گزر ہوا ہے ، وہاں کے عینی مشاہدات کا اضافہ کرکے کتاب کو جہاں تک ممکن ہو جامع اور مکمل بنادے ۔ یہ ہم سرقے نئی معلومات کی فراہمی میں تو ضرور کوتاہی کا موجب ہوتے ہیں لیکن ایک لحاظ سے خالی از فائدہ نہیں ہیں کہ ان کی بدولت منقولہ عبارات کا اصل سے مقابلہ ہوسکتا ہے اور کاتبوں کی اغلاط نیز بہت سے محو شدہ حصّے درست کئے جاسکتے ہیں ۔

ہمارے مآخذ کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

(۱) ابن خُرداد بہ ۔ یہ مصنّف ایرانی نژاد تھا جیسا کہ اُس کے باپ کے نام سے ظاہر ہے کیونکہ قدیم فارسی میں " خُرداد بہ " کے معنی ہوں گے ' خورشید کا اچھا عطیہ ۔ (جس طرح یونانی نام " ہیلیو دورس " ہوتا) ابن خرداد بہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں پیدا ہوا (جو نویں صدی عیسوی کے مطابق ہے) اور بغداد میں عبّاسی خلیفہ المعتمد کے دربار میں پھلا پھولا ۔ صوبہ جبال (قدیم مدیہ) میں وہ رئیس برید کا عہدہ رکھتا تھا اور یقیناً اپنے ماتحتوں کی واقفیت ہی کی غرض سے اُس نے کتاب " مسالک والممالک " تالیف کی جو مسلمانوں کے سب سے قدیم جغرافی رسالے کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے ۔ اُس کی عربی عبارتوں کے ترجمے ہم نے اُس نسخے سے نقل کئے ہیں ، جو سی باربیئر دِ مینارد نے " ژورنل ایشیاتیک " بابت ۱۸۶۵ء میں شائع کیا تھا ۔

(۲) بلاذری کی تصنیف مذکورہ بالا کتاب سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتی ہے اور صرف

ثانوی حیثیت سے اُسے جغرافی کہہ سکتے ہیں یہ دراصل اسلامی فتوحات کے سب سے قدیم تاریخی حالات ہیں، جو ہم تک پہنچے۔ مصنّف بغداد میں پیدا ہوا اور خلیفۂ اعظم المامون کے عہد میں تعلیم و تربیت پاکر اُس کے دو جانشینوں تک زندہ رہا۔ یہ دونوں، یعنی المتوکل اور المستعین اس کے بڑے قدردان تھے۔ بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان ۸۶۹ء کے قریب تالیف کی اور ۸۹۲ء میں وفات پائی۔ افسوس ہے کہ اسکی کتاب جغرافی حالات سے قریب قریب معرّیٰ ہے اور مقامات کے ناموں کے سوا اور کچھ اُس میں نہیں ہے۔ البتہ مصنف نے صفوفِ جنگ کی آراستگی اور جنگ میں حصّہ لینے والوں کی سوانح کی جزئیات لکھنے میں پورا زورِ قلم صرف کردیا ہے۔

اسکے ترجمے کتاب فتوح البلدان کے اُس نسخے سے ہم نے لئے ہیں جسے گیبزی (Goeje) نے لائیڈن سے ۱۸۶۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۳) قدامہ جس نے اسلامی سلطنت کے محاصل پر ۸۸۰ء کے قریب کتاب لکھی، مسیحی الاصل تھا مگر اکثر معاصرین کی طرح اسے بھی فائدہ اسی میں نظر آیا کہ اسلام قبول کرلے۔ بغداد کے محکمۂ مالگذاری میں اسے محاسب کی خدمت سپرد تھی اور اسکی زندگی کے متعلق ہمیں سوائے اسکے اور کچھ علم نہیں کہ وہ ۹۴۰ء میں فوت ہوا۔ اسکی کتاب کا ترجمہ اور جستہ جستہ اصل عربی عبارتیں میک جی ڈسلین نے کتاب الخراج کے نام سے ۱۸۶۲ء کے ژورنل ایشیاٹیک میں دی ہیں اور ہماری کتاب کے باب اوّل میں شام کی مالگذاری کی جزئیات اُس سے لیکر درج کی گئی ہیں۔

(۴) یعقوبی۔ (جو ابن واضح بھی کہلاتا ہے) مورخ بھی ہے اور جغرافیہ نویس بھی۔ اپنی تاریخ میں جو بہت قدیم ہے یعنی ۸۷۴ء میں لکھی گئی، اُس نے قبّۂ صخرہ کی نسبت بتایا ہے کہ اسے خلیفۂ عبد الملک نے تعمیر کیا اور جو اسباب تعمیر کے محرک ہوئے ان کی بھی تصریح کی ہے۔ اِن مشہور و معروف عمارات کے بننے کا یہ سب سے پہلا بیان ہے جو ہم تک پہنچا ہے اور اُس سے مسٹر فرگسن متوفی کے اُس قول کی تردید ہوتی ہے کہ یہ گنبد دراصل کوئی بازنطی گرجا تھا۔

یعقوبی کا جغرافیہ اُس کی تاریخ کے بہت دن بعد تقریباً ۸۹۱ء میں تالیف ہوا۔ افسوس ہے کہ اب یہ مکمّل نہیں ملتا۔ تاہم شام پر جو فصل لکھی ہے وہ خاصی طرح

مکمّل ہے۔ کتاب میں دیکھنے کے لائق وہ یادداشتیں ہیں کہ جو عرب قبائل کی مختلف بستیوں پر کہ وطن سے اٹھکر شام میں آبسے تھے، مصنّف نے لکھی ہیں ورنہ سوائے ولایات کے نام اور ان کے بڑے بڑے شہروں کی فہرست کے اس میں کوئی بات کام کی نہیں ملتی۔ البتہ یہ نام اس اعتبار سے مفید ہیں کہ ان سے اُس ابتدائی عہد کے بڑے شہروں کا ہمیں علم ہوتا ہے۔

یعقوبی کے ذاتی حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ بظاہر وہ مصر میں پیدا ہوا زندگی کا ابتدائی زمانہ خراسان اور مشرق بعید میں گزرا اور آخر میں وہ پھر اپنی ولادت گاہ میں یعنی دریائے نیل کے کنارے آرہا۔

اس کے "جغرافیے" کی اے ڈبلیو ٹی جوئن بول نے لائیڈن میں ترتیب و تدوین کی (۱۸۶۱ء) اور اسی نسخے سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ اسکی "تاریخ" کو جو یعقوبی کے دوسرے عرف ابن واضح کے نام سے ہے، ایم ٹی ہوزسٹما نے لائیڈن میں ۱۸۸۳ء میں مدوّن کیا۔

(۵) ابن الفقیہ مغربی ایران کے شہر ہمدان کا باشندہ اور بغداد کے خلیفہ المعتضد کے عہد کا آدمی ہے اس نے ۹۰۳ء کے قریب جغرافیے کی متفرق معلومات پر ایک عجیب طرح کی کتاب لکھی تھی مگر افسوس ہے کہ سوائے ایک خلاصے کے اصل کتاب ہمارے پاس نہیں پہنچی اور یہ خلاصہ بھی کسی شخص علی شیرازی نامی نے، جس کے نام کے سوا اور حالات کا مشکل سے پتہ چلتا ہے، محض خود رائی سے اپنے مذاق کے موافق تیار کر لیا تھا۔ ابن الفقیہ یروشلم کے حرم کی بہت احتیاط سے کیفیت بیان کرتا ہے اور وہی پہلا عرب مصنّف ہے جس نے بعلبک کے بڑے پتھروں کی کیفیت لکھی اور انکا طول و عرض بیان کیا۔ اسکی تصنیف کا یہ خلاصہ "ببلو تھیکا جیوگ رافورم ارے بی کورم" مرتبہ ایم جی ڈیگیزی کی پانچویں جلد ہے۔ (مطبوعہ لائیڈن ۱۸۸۵ء)

(۶) اسکے بعد فہرست میں ایک ہسپانوی عرب ابن عبد ربّہ کا نام آتا ہے جو ۸۶۰ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا اور ۹۴۰ء میں وہیں وفات پائی۔ اس نے نہایت دلچسپ تاریخی کتاب لکھی ہے جو قاہرہ کے مطبوعہ نسخے کی تین جلدوں میں مکمل ہوئی۔ اس میں ماقبل اسلام عرب اور دیگر اقوام کے رسم و رواج اور معاشرت کی جزئیات بیان کی ہیں۔ کتاب کا نام عقد الفرید (چیدہ موتیوں کی مالا) ہے اور اس کے ایک باب میں حرم بیت المقدس کا بڑی تفصیل سے منظر دکھایا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ خود

مصنّف اس مقدّس شہر میں آیا تھا یا نہیں۔ اُس کے بیان کے بعض حصّے بالکل وہی ہیں جیسے ابن الفقیہ کی مذکورۂ بالا کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض جزئیات اس سے اختلاف بھی رکھتی ہیں:

کتاب، بولاق (قاہرہ) میں العقد الفرید کے نام سے سنہ ۱۲۹۳ھ (سنہ ۱۸۷۶ء) میں طبع ہوی ہے:

(۷) **مسعودی**:- تمام عربی علم ادب کی سب سے دلچسپ تاریخی کتابوں میں سے ایک مسعودی کی "مروج الذہب" (= سونے کی چراگاہیں) ہے جو تخلیق عالم سے شروع ہوتی ہے اور دنیا بھر کی تاریخ کے متعلّق عربوں کو جو کچھ معلوم تھا اسے سنہ تالیف یعنی سنہ ۹۴۳ء تک دہراتی ہے:۔ مصنّف آٹھویں صدی مسیحی کے اواخر میں بغداد میں پیدا ہوا اور جوانی میں بہت دُور دُور تک پھرا۔ ملتان و اقطاع ہند کی سیر کی اور دوسری مرتبہ ہندوستان و سراندیب جاتے ہوئے ایران سے گزرا اور پھر مدغاسکر کے راستے بغداد واپس آیا۔ ۹۲۶ء میں اُس نے فلسطین کی سیاحت کی اور ایک عرصہ تک انطاکیہ میں وقت گزارا۔ اس کے بعد سنہ ۹۵۵ء کے قریب وہ مصر آکے بس گیا اور وہیں دوسرے سال وفات پائی۔ اُس کا انتقال فسطاط میں ہوا جسے اب پرانا قاہرہ کہتے ہیں۔ روایات تاریخی کے ان کثیر مجلّدات میں جا بہ جا جغرافی معلومات بکھری ہوی ہے اور زمانۂ تالیف کی قدامت، مصنّف کی حدت نظر اور تبحّر علمی کی بنا پر کافی قدر و قیمت رکھتی ہے:

مروج الذہب کے عربی متن کو فرانسیسی ترجمے کے ساتھ سی باربیر دمینارد اور پی دکورتیل نے سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۸۷۷ء تک نو جلدوں میں شائع کیا اور اسی متن سے ہم نے عبارتیں (انگریزی میں) ترجمہ کی ہیں:

(۸) و (۹) اصطخری (زمانۂ تالیف سنہ ۹۵۱ء) اور ابن حوقل (زمانۂ تالیف سنہ ۹۷۷ء) کا نام ایک ساتھ لینا ضروری ہے کیونکہ ثانی الذکر نے جو زیادہ مشہور ہوا، صرف پہلے مصنّف کی کتاب میں ترمیم کرکے اور کچھ بڑھا کے اپنے نام سے مرتّب کر لیا تھا۔ یہی دہری کتاب پہلا باقاعدہ عرب جغرافیہ ہے۔ اس میں ابن خردادبہ کی کتاب کی طرح محض راستوں کا حال نہیں ہے نہ صرف محاصل کی فہرست دیدی ہے جیسی کہ قدامہ کی کتاب میں ہے۔ بلکہ ترتیب کے ساتھ اسلامی خلافت کی ہر ولایت، وہاں کے بڑے بڑے قصر اور قابل دید مقامات کا احتیاط سے

مقدمہ

حال بیان کیا ہے۔ اصطخری، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اصطخر (پرسی پولس) کا باشندہ تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ میں یہ کتاب اُن نقشوں کی تصریح کی غرض سے لکھتا ہوں جو ۹۲۱ء کے قریب کسی بلخی آدمی نے کھینچے تھے اور بدنصیبی سے اب مفقود ہیں۔ اصطخری اور ابن حوقل کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ دونوں سوداگر تھے اور تجارت کے سلسلے میں دُور دُور پھرے ہیں۔ انکی زندگی کے باقی تفصیلی حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ایم۔ جی دگیتری کے عربی جغرافیوں کے سلسلۂ کتب میں اصطخری اور ابن حوقل کی کتابیں ۱ اور ۲ کی صورت میں چھپی ہیں۔ ہم نے دونوں میں سے جس کا بیان زیادہ مفصل دیکھا۔ اسی کا ترجمہ لیا ہے اور یہ تفصیل ہر جگہ تو نہیں مگر اکثر ابن حوقل ہی کی کتاب میں پائی گئی ہے۔

(۱۰) المقدسی (یعنی بیت المقدس کا باشندہ) یروشلم کی پیدائش ہے (۹۴۶ء) اسے عمدہ تعلیم کی فضیلت حاصل ہے۔ عمر کے بیسویں سال حج بیت اللہ سے مشرف ہوا اور پھر ارادہ کر لیا کہ اپنا وقت جغرافیے کے مطالعے کیلئے وقف کر دیگا۔ اس علم کی ضروری واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے اس نے کئی سیاحتیں کیں جو بیس سال سے زیادہ زمانے تک پھیلتی ہیں اور جن کی بدولت وہ ہر اسلامی ملک میں ہو آیا۔ ان سے فارغ ہو کر اور کہیں ۹۸۵ء میں جا کے، وہ اپنی کتاب لکھنے بیٹھا جس میں تمام اقالیم اور مقامات کا، جہاں جہاں مصنف گیا تھا، باترتیب حال درج ہے۔ فلسطین اور خاصکر اپنے مولد یروشلم کی جو کیفیت اس نے لکھی ہے وہ کتاب کا بہترین حصہ ہے۔ جو کچھ لکھا وہ مصنف کا ذاتی مشاہدہ ہے اور مختلف قوموں کے رسم و رواج نیز مختلف ملکوں کی طبیعی خصوصیات پر اس کا بیان دیکھکر ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتنا فہمیدہ اور گہری نظر کا آدمی تھا اور اس ہوش مندی نے کتابی اور فطرتِ انسانی کے دقیق علم سے مزید قوت پائی تھی۔

مقدسی کا ترجمہ میں اس سے پہلے بزم کتب زائرین فلسطین کی مطبوعات کے سلسلے میں مرتب کر چکا ہوں اور یہ ترجمہ گیتری کے مذکور بالا سلسلۂ کتب کی تیسری جلد سے کیا گیا ہے۔ اور یہاں بھی اسی متن کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔

(۱۱) مقدسی سے کچھ اوپر نصف صدی بعد اور پہلی جنگ صلیبی سے تقریباً نصف صدی پیشتر ایرانی سیاح ناصر خسرو مکہ شریف جاتے ہوئے فلسطین سے گزرا۔ ۱۰۴۷ء میں وہ یروشلم آیا اور

مقدمہ

اس مقدّس شہر اور حوالیٔ حرم کی بہت ہی مفصّل کیفیت لکھی جو اس اعتبار سے نہایت بیش بہا ہے کہ مجاہدینِ مسیحی کے آنے سے پہلے کا سب سے آخری بیان یہی ہے۔ ناصر خسرو بلخ کی نواح میں سنہ ۱۰۰۳ء میں پیدا ہوا اور ابتدائی عمر میں ہندوستان کی سیاحت کی جہاں وہ مشہور و معروف سلطان محمود غزنوی کا وابستۂ دولت تھا۔ اسکے بعد وہ حج کے لئے روانہ ہوا اور اسی موقع پر فلسطین سے گزرا اور یروشلم کی سیاحت کی۔ اس کے سفرنامے کا وہ حصّہ جو بیت المقدس کے متعلّق ہے، اصل فارسی سے میں نے ترجمہ کیا اور کتبِ زائرینِ فلسطین کے سلسلہ میں تھوڑے دن ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ اصل فارسی متن جو میں نے استعمال کیا، اس کا متحفِ برطانیہ کے دو قلمی نسخوں سے مقابلہ کر لیا گیا ہے (or 1991 ad. 18418)

سی شیفر نے بھی سفرنامہ کے نام سے فرانسیسی ترجمہ اور اصل فارسی متن پیرس میں چھاپہ ہے (سنہ ۱۸۸۱ء) لیکن برطانی متحف کے نسخوں میں بعض جدید اور اہم عبارتیں اور بھی درج ہیں اور ان سے فرانسیسی ترجمے کی بہت سی گتھیاں صاف کرنے میں مدد ملی ہے۔

(۱۴) ابنِ بطلان نے انطاکیہ اور بعض اور شامی شہروں کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، اس کا ہمیں صرف ان اقتباسات کی بدولت علم ہوا جو یاقوت کی بڑی جغرافی قاموس (دیکھو نمبر ۱۶) میں منقول ہیں۔ اور ہمارے مغربی کتب خانوں میں مشرقی قلمی کتابوں کے جو ذخیرے ہیں، ان میں اصل کتاب بظاہر کہیں محفوظ نہیں ہے۔

یاقوت، ابنِ بطلان کے رسالے سے جو اس نے اپنے دوست ابوالحسین ابن ہلال ابن المحسن الصّابی کو بغداد بھیجا تھا، بلفظہ عبارتیں نقل کرتا ہے۔ اور بیان کرتا ہے کہ یہ رسالہ "سنہ ۴۴۰ھ کے کچھ سال بعد" لکھا گیا تھا۔ لیکن خود رسالے میں ایک تاریخ کے اتفاقیہ آ جانے سے پتہ چلتا ہے کہ ابنِ بطلان انطاکیہ سے ضرور سنہ ۴۴۳ھ (= سنہ ۱۰۵۱ء) میں گزرا ہوگا۔ اصل میں وہ خود ایک مشہور نصرانی عرب طبیب اور بغداد کا باشندہ تھا۔ سنہ ۴۳۹ھ (= سنہ ۱۰۴۷ء) میں وطن سے مصر روانہ ہوا کہ قاہرہ میں اپنے مصری رقیب، طبیب ابن رضوان سے ملاقات کرے۔ وہاں سے استنبول جا کر وہ انطاکیہ کے راستے وطن واپس جاتا تھا کہ پیرانہ سالی اور عقلِ انسانی کی بے حقیقتی دیکھ کر تارک الدنیا راہب ہو گیا اور چند روز بعد انطاکیہ ہی میں وفات پائی (سنہ ۴۴۴ھ = سنہ ۱۰۵۲ء)

(۱۳) جغرافیہ نویس اور نیز یورپ میں غالباً دوسرے سب عرب جغرافیہ نویسوں کی

مقدّمہ

نسبت زیادہ مشہور ہے۔ مدّت دراز پہلے، یعنی ۱۵۹۲ء ہی میں اسکی کتاب رومہ میں چھاپ دی گئی تھی۔ کتاب کی تالیف بھی ۱۱۵۴ء میں صقلیہ کے نارمن بادشاہ راجر ثانی کے حکم سے ہوئی جس کے دربار میں ادریسی مقیم تھا۔ اس کا مولد سبطہ لیکن والدین ہسپانوی عرب تھے۔ اُس نے بہت سیاحتیں کیں چنانچہ بیان کرتا ہے کہ انگلستان و فرانس کے ساحل دیکھے اور عرصے تک لزبن میں رہا۔ اس نے فلسطین کا بہت خوب حال لکھا ہے اور یروشلم کی نسبت جو کچھ کہا ہے وہ خاص طور پر دلچسپ ہے کیونکہ یہ اُس زمانے کا حال ہے جب کہ اس مقدس شہر پر مسیحی مجاہدین قابض تھے۔ بعض مصنّفین لکھتے ہیں کہ ادریسی ۱۱۱۶ء میں ایشیائے کوچک آیا تھا لیکن اس کے بعد اور جنوب میں جانے یا فلسطین کی خود سیاحت کرنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ لہٰذا ضرور ہے کہ اسکی معلومات اُن کتابوں سے جو راجر کے دربار میں دستیاب ہوئیں، اور یا ولایتِ مذکور کی سیاحت کرکے آنیوالوں سے ماخوذ ہوگی ؛

عربی متن جس سے یہ ترجمے کیے گئے ہیں "ڈی پیلیستینہ ویرین" کے جرمن سالناموں میں (جلد ہشتم، ۱۸۸۵ء) جے گلڈمسٹر کا شائع کردہ ہے ؛

(۱۴) ایک اور مسلمان جس نے حروبِ صلیبیہ کے زمانے میں فلسطین کے مقامات کا حال لکھا، علی ہروی ہے جس نے ۱۱۷۳ء میں "مقامات زیارات" پر ایک چھوٹی سی کتاب تحریر کی تھی۔ اسکی سب سے کارآمد فصل وہ ہے جس میں حبرون کا تذکرہ کیا ہے اور اسی میں غار مکفلہ کی زیارت کرنے کا حال لکھا ہے ؛ علی ہراتی یا ہروی ایرانی النسل تھا مگر کتاب عربی میں لکھی ہے اور ابتک طبع نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا ایک عمدہ قلمی نسخہ اوکسفورڈ کے بوڈلین کتب خانے میں موجود ہے M. S. E. D. Clarkii 17 Clv., Uri آیندہ اوراق میں جو ترجمے دیے ہیں وہ اسی نسخے سے کیے ہیں ؛ علی نے حلب میں، جہاں آبسا تھا اور یہ کتاب بھی وہیں لکھی، ۱۲۱۵ء میں انتقال کیا ؛

(۱۵) ۱۱۸۵ء میں، یعنی صلاح الدینؒ کے بیت المقدس کو دوبارہ فتح کر لینے کے دو سال بعد، فلسطین کے شمالی حصّے کی ہسپانوی عرب سیّاح (ولادت بمقام ولینشیہ ۱۱۴۵ء) ابن جبیر نے سیاحت کی۔ وہ غرناطہ سے ۱۱۸۳ء میں سیّاحی کو نکلا تھا اور پہلے مصر تک آیا۔ پھر دریائے نیل کے راستہ جنوب میں بڑھکے صحرا سے ہوتا ہوا بحر قلزم کی بندرگاہ

مقدمہ

عیذاب پر پہنچا اور وہاں سے مکۂ معظمہ اور کچھ دن بعد مدینۂ منورہ آیا۔ اس مقام سے عرب کو عبور کرکے وہ کوفہ و بغداد پہنچا (آخر الذکر شہر کی اس نے نہایت دلچسپ کیفیت لکھی ہے) پھر دجلے کے کنارے کنارے موصل آکے حلب کو پلٹ آیا۔ یہاں سے وہ دمشق گیا اور دمشق سے عکے آکر جہاز میں بیٹھ لیا اور آخر میں بعر قرطاجنہ میں ہسپانیہ کی سرزمین پر لنگر انداز ہوا (۱۱۸۵ء) ہماری کم نصیبی کہ اس نے یروشلم کی سیر نہیں کی حالانکہ اس سفر کے بعد دو مرتبہ اور مشرق کی سیاحتیں کیں اور آخری دفعہ واپس آتے ہوئے سکندریہ (مصر) میں وفات پائی ؛ جن مقامات کو دیکھا، انکا بیان نہایت شگفتہ اور تفصیلی حالات سے مالامال ہے اگرچہ تکلف آمیز انشاپردازی کی بنا پر، اس کے سفرنامے کا لفظی ترجمہ پڑھنا سخت تکلیف دہ ہو جائے گا ؛ کتاب کے چھٹے باب میں دمشق کی کیفیت درج ہے اور زمانۂ وسطیٰ میں اس شہر کا سب سے مشرح بیان یہی ہے جو ہم تک پہونچا ؛

ابن جبیر کے (روزنامچے یا) سفرنامے کا عربی متن پروفیسر ولیم رائٹ نے لائیڈن سے ۱۸۵۲ء میں چھاپا تھا اور ہمارے ملخص ترجمے میں اسی کتاب کے اوراق کا حوالہ دیا گیا ہے ؛

(۱۶) اپنی بے قیاس دماغ کاوی اور ضخیم تصانیف کے لحاظ سے مسلمان جغرافیہ نویسوں میں سب سے اول رتبہ یقیناً یاقوت کو ملنا چاہئے۔ وہ نسلاً یونانی اور غلام تھا اور اپنے آقا سوداگر کے ہاں بغداد میں تعلیم و تربیت پاکر جوان ہوا۔ اس کے تفصیلی حالات زندگی کا بیان موجب طوالت ہوگا۔ اسی قدر کہنا کافی ہے کہ اپنی جہاں گردی کے مختلف زمانوں میں وہ حلب، موصل، اربیل اور مرو میں پھرا مرو ان دنوں کتب خانوں کی کثرت کی بنا پر مشہور تھا مگر ہمارے سیاح کو چنگیز خاں کا لشکر آتے ہی وہاں سے (۱۲۲۰ء میں) بھاگنا پڑا۔ ایران کو طے کرتا اور عراق عرب سے گزرتا ہوا وہ آخر میں شام آیا اور حلب میں سکونت اختیار کرلی جہاں ۱۲۲۹ء میں اس کی وفات ہوئی ؛ اس کی جغرافی قاموس جس میں بہ ترتیب حروف تہجی ہر شہر و مقام کا حال لکھا ہے جہاں کی نسبت مصنف کوئی واقفیت حاصل کر سکا۔ ۱۲۲۵ء میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ کتاب جغرافی معلومات کا خزانہ ہے اور اسکی جتنی قدر کی جائے کم ہے کیونکہ مغرب میں ہسپانیہ سے لے کر مشرق میں ماوراء النہر اور ہندوستان کے آگے تک اس کتاب میں تمام اسلامی ممالک و بلاد کا،

مقدمہ

جیسے کہ وہ تیرھویں صدی (عیسوی) میں نظر آتے تھے، شرح وبسط سے حال بیان کیا ہے جغرافی اور تاریخی دونوں قسم کی کثیر معلومات کا، جن کی یہ کتاب حامل ہے، کسی قدر اندازہ شاید یہ لکھنے سے ہوجائے گا کہ عربی متن جو جرمن انجمن مستشرقین کے خرچ سے شائع ہوا، بڑی تقطیع کے چار ہزار صفحات میں ہے اور اگر ضروری حواشی کے ساتھ انگریزی ترجمہ کیا جائے تو اس کے دُگنے تگنے حجم میں سمائے گا۔

یاقوت نے ایک مفید فرہنگ جغرافی ہمناموں کی بھی مرتب کی ہے، جس میں مختلف مقامات کا حال درج ہے جو ایک سے نام رکھتے تھے۔

جغرافیے کی یہ لغتِ کبیر "معجم البلدان" (یعنی حرف وار لغت جغرافیہ) کے نام سے موسوم ہے۔ اسے پروفیسر وسٹن فلیٹ نے چھ جلدوں میں مدوّن اور لائپزگ سے سنہ ۱۸۶۶ء میں شائع کیا۔ ہمناموں کی لغت "المشترک" کی بھی اسی مستشرق نے تدوین کی اور وہ گوٹن جن سے سنہ ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔

(۱۷) یاقوت کی لغت کبیر کی تکمیل سے تین چوتھائی صدی کے بعد، اس کتاب کی ایک شخص صفی الدین نامی نے تلخیص کی۔ اس نے کہیں کہیں خود چند نام بڑھائے لیکن یاقوت نے مقامات کی جو کیفیت درج کی تھی، اسے اڑا دیا اور ہر نام کے ساتھ اصل کتاب کی صرف ایک ایک سطر رہنے دی۔ اس کتاب کا نام مراصد الاطلاع (مرصد بمعنی کمین گاہ) ہے اور خود صاحبِ تلخیص صفی الدین کی النسبت ہمیں کچھ علم نہیں۔ تاہم اس کتاب کا قریبی زمانہ یقیناً سنہ ۱۳۰۰ء ہوگا کیونکہ وہ عکّے کی دوبارہ تسخیر کو قریبی زمانے کا واقعہ بتاتا ہے۔ مراصد کے متن کی اشاعت ٹی جی جے جوین بول نے کی تھی (لائیڈن سنہ ۱۸۵۹ء) لیکن اس کے چھپنے کے بعد پروفیسر وسٹن فلیٹ نے ایک دوسرے نسخہ کا مقابلہ اور تصحیح کی جو لارڈ لینڈ سے کا مملوکہ تھا اور اس میں مطبوعہ نسخے سے بعض عبارتیں زیادہ تھیں چنانچہ انھیں وسٹن فلیٹ نے اپنے شائع کردہ معجم البلدان کی پانچویں جلد (صفحہ ۱ تا ۳۲) میں داخل کردیا ہے۔

(۱۸) دمشقی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، دمشق میں پیدا ہوا (سنہ ۱۲۵۶ء) اور اپنے وطن کی ایک بے سروپا سی کیفیت (سنہ ۱۳۰۰ء کے قریب) لکھی۔ لیکن محاربین صلیبی کے رخصت ہونے کے بعد ملک کی جو حالت ہوگئی تھی، یہ کتاب اس کے متعلق بہت سی

مقدمہ

عجیب جزئیات بہم پہنچائی ہے۔ مصنف سُلطان بیبارس کا معاصر تھا اور حروبِ صلیبی کی تاریخ کے سلسلے میں یہ کتاب ضرور کارآمد ہے۔ دمشقی نے صفد میں (۱۳۲۶ء میں) وفات پائی۔ اصل کتاب پیٹرس برگ میں ایم۔اے۔ ایف مہرن نے چھپوا دی ہے اور اسی سے ہم نے ترجمے کئے ہیں۔

(۱۹) ابو الفدا جو ایک وقت میں امیر حماہ، اور صلاح الدین اعظم کا مجد عزیز بھی ہوتا تھا، دمشقی کی نسبت کہیں اعلیٰ قابلیت کا جغرافیہ نویس ہے۔ شام و فلسطین پر جو باب اُس نے لکھے ہیں، اکثر بیشتر حصہ کسی سے نقل نہیں کیا ہے، بلکہ چونکہ یہاں وہ اپنے وطن کا حال بیان کر رہا ہے، لہٰذا ذاتی مشاہدہ سے لکھتا ہے۔ اس کی کتاب ۱۳۲۱ء میں اتمام کو پہنچی۔ مصنف کا سن پیدائش ۱۲۷۳ء اور وفات ۱۳۳۱ء ہے۔ اس نے قلاوون، لاجون اور ملک الناصر مالکہ مصر کا زمانہ دیکھا اور ۱۳۱۰ء میں والی حماہ مقرر ہوا۔ اور اسی شہر میں وفات پائی۔

جغرافیہ ابو الفدا کا عربی متن رینو اور دِسلین نے شائع کیا ہے (پیرس ۱۸۴۰ء) اور اسی نسخے سے ہمارے ترجمے مقتبس ہیں۔

(۲۰) ابن بطوطہ البربری کو اپنی سیاحتوں کی حیرت انگیز وسعت کے لحاظ سے وینس کے مارکو پولو[1] کا ہمرتبہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کی ولادت ۱۳۰۴ء کے قریب طنجہ میں ہوی اور پچیس برس کی عمر میں وہ سفر کے لئے چل کھڑا ہوا۔ ان سیاحتوں کا وہ مفصل حال، ہمارے لئے لکھ گیا ہے جس کی تحریر ۱۳۵۵ء میں عمل میں آئی۔ اس جگہ زیادہ سے زیادہ صرف اسکے راستے کا مختصر سا خاکہ دیا جاسکتا ہے کہ مراکش سے چل کر اس نے علی الترتیب تونس، طرابلس، اور مصر کی سیر کی وہاں سے فلسطین و شام ہو کر وہ حجاج کے ہمراہ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ گیا اور پھر عراق عرب کے راستے ایران کی سیاحت کر کے بغداد چلا آیا۔ یہاں اور پھر موصل میں چند مہینے بسر کئے اور موصل سے دوبارہ مکہ شریف کا سفر کر کے یمن کی سیاحت کی اور وہاں سے واپس مصر چلا آیا۔ مصر سے وہ جہاز میں ایشیائے کوچک گیا۔ قسطنطنیہ، کریمیہ، استراخان

---

[1] مارکو پولو ۱۲۹۵ء میں وینس واپس آیا اور سفرنامہ ۱۳۰۰ء کے قریب اس زمانے میں مرتب کیا جب کہ وہ جنیوا میں قید کر دیا گیا تھا۔

مقدمہ

خوارزم، تاتار، ماوراء النہر، افغانستان سے ہوتا ہوا آخر میں ہندوستان پہنچا جہاں دہلی میں بہت دن تک مقیم رہا۔ ہندوستان سے چین جاتے ہوئے، جہاز کے راستے جزائر مالدیپ وسراندیپ (لنکا) کی سیر کی اور واپسی میں سماٹرا کو بھی دیکھا عرصے تک بحرِ ہند میں گشت کرکے وہ ایک مرتبہ پھر مکہ معظمہ آیا اور اُس تبرک مقام سے براہ سوڈان وٹمبکٹو، فاس یعنی وطن کو مراجعت کی۔ بعد میں وہ ہسپانیہ بھی گیا تھا اور آخر فاز میں بڑی عمر پاکر ۱۳۷۷ء میں عالم جاودانی کی راہ لی ؛

ابن بطوطہ نے جو حال فلسطین کا بیان کیا ہے وہ اکثر مقام پر تعجب انگیز ہے اور بیت المقدس کے تذکرے میں بعض جزئیات ایسی لکھی ہیں، جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ لیکن طرزِ تحریر میں بہت لفاظی اور تصنّع ہے اور اپنے پیشرو ابن جبیر سے اس قدر عبارتیں نقل کی ہیں کہ بجائے خود ایک ماخذ کی حیثیت سے یہ کتاب کچھ بہت کارآمد نہیں رہی ؛

ابن بطوطہ کا اصل سفرنامہ فرانسیسی ترجمے کے ساتھ سی دفرامری اور بی آر سنگوی نتی نے "سوسائٹی ایشیاٹیک" کے خرچ سے چار جلدوں میں چھاپ دیا ہے (پیرس، ۱۸۷۹ء) اور اسی نسخے کے ہماری کتاب میں اقتباسات ہیں ؛

(۲۱) "مثیر العزام" (یعنی سفرِ شام وارضِ مقدس کے ارادے کو بھڑکانے والی) یروشلم کے ایک باشندے جمال الدین احمد کی تصنیف ہے جس نے ۱۳۵۱ء میں بیت المقدس کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ یہ چھپی نہیں مگر اس کے نہایت عمدہ قلمی نسخے پیرس کے قومی کتب خانے میں موجود ہیں جن سے ہم نے ترجمے کئے ہیں۔ ان نسخوں کی مفصل کیفیت اور جمال الدین کے حالات زندگی کے لئے میں اس مضمون کا حوالہ دیتا ہوں جو میں نے سیوطی پر لکھا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں چھپ چکا ہے (جلد نوزدہم۔ سلسلۂ جدید۔ صفحہ ۲۵۰) سیوطی کے ضمن میں ذکر آنے کا سبب یہ ہے کہ سیوطی جمال الدین کی عبارتیں نقل کرتا ہے ؛

(۲۲) اسی نام کی ایک دوسری مثیر ابوالفدا اسحٰق حبرونی کی تصنیف ہے جو ۱۴۳۰ء میں فوت ہوا۔ اس نے بیت المقدس کے حرم شریف اور انبیا کے گنبدوں کا حال لکھا ہے۔ اصل کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی اور جن قلمی نسخوں سے ترجمے کئے گئے ہیں انکا مشرح احوال کا میرے مذکورۂ بالا مضمون میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے ؛

(۲۳) شمس الدین سیوطی (اسے اپنے مشہور ز ہم عرف جلال الدین سیوطی کے ساتھ

مقدمہ

خلط ملط نہ کر دیا جائے) ۱۴۷۰ء میں یروشلم آیا اور کچھ ہی بعد بیت المقدس کی کیفیت "اتحاف الاخصّا" کے نام سے تحریر کی۔ کتاب میں مسجد اقصیٰ کے فضائل بیان کئے ہیں مگر مذکورۂ بالا مشیروں سے بہت کچھ اڑایا ہے جیسا کہ میں مطولہ مضمون رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں لکھ چکا ہوں۔ ترجمے میں سیوطی کی کتاب کے ذکر میں اسی رسالے (جلد نوزدہم، سلسلۂ جدید) کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۲۴) **مجیرالدین،** فہرست میں آخری مصنف ہے اور ہر چند اوپر کے تینوں خطط نویسوں سے زیادہ مشہور ہوا لیکن حقیقت میں بہ زیادہ تر صرف دونوں مشیروں کے مصنفوں اور سیوطی کی عبارتوں کو بلفظہا نقل کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کتاب "الانس الجلیل" کے نام سے ۱۴۹۶ء میں تحریر ہوئی اور انیچ سوار نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ شائع کیا ("ہسٹوار وژروسلیم اے دِ ہا برون" پیرس ۱۸۷۶ء) مطبع بولاق قاہرہ میں اصل عربی کتاب بھی چھپ گئی (۱۲۸۳ھ = ۱۸۶۶ء) اور ہمارے ترجموں میں اسی متن کے صفحات کا حوالہ آتا ہے۔

اپنے پیش رووں کی عبارتیں نقل کرنے کے علاوہ مجیرالدین مساجد و مدارس ومقابر، اور بیت المقدس کی خانقاہوں اور مقدس مقامات کی کیفیت نیز مختلف بازاروں اور گلی کوچوں کا، جیسا کہ پندرھویں صدی کے اواخر میں ان کی صورت تھی، احوال لکھتا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں شہر کے تفصیلی آثار جنھیں مجیرالدین لکھتا ہے، نظر انداز کر دئے اور صرف ان عبارتوں کا ترجمہ کیا جن میں حوالی حرم کی پرانی عمارات اور دیگر مقامات کی نسبت کوئی جدید کام کی بات موجود ہے اور جو قدیم تر مصنفوں کے بیانات کو پڑھنے کے بعد ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

مذکورۂ بالا ماخذ کے علاوہ، میں نے تاریخی واقعات کی تصدیق میں طبری اور ابن اثیر کی بڑی تاریخوں سے بھی استناد کیا ہے۔ ان میں سے پہلی تاریخ کا متن آجکل ایم جے ڈی گوئیری کی ادارت میں بمقام لائیڈن شائع ہو رہا ہے۔ اور اسی کی مختلف جلدوں کے ہماری عبارات میں حوالے دئے گئے ہیں۔ ابن اثیر کے وقائع سی جے تورن برگ نے

مقدمہ

اصل عربی میں لائیڈن سے چودہ جلدوں میں شائع کئے ہیں (۱۸۶۷ء تا ۱۸۷۶ء) اور مباحث فلسطین غربی ذخیرۂ اکتشافاتِ فلسطین (P. E. F.) کی مختلف مطبوعات کا، جس صورت میں کہ وہ میموائرز کے اندر (تین جلدوں میں) چھپ چکی ہیں، نیز جیرو سلم والی کتاب اور اسپیشل پیپرز اور کوارٹرلی اسٹیٹ منٹ کے اوراق کے بھی جابجا حوالے ملیں گے اور اسی طرح مجلس متونِ زائرین فلسطین (P. P. T.) کی اُن مطبوعات سے مدد لی گئی ہے جو مجاہدین صلیبی یا قدیم مسیحی زائرین کے عہد میں ارضِ مقدس کے حالات بیان کرتی ہیں۔

بابِ اوّل

شام و فلسطین

نام الشام ـ خصوصیات طبیعی ـ آب وہوا ـ پیداوار ـ
اخلاق، رسم ورواج ـ میلے ـ ساحل کی چوکیاں ‏٭
ملکی تقسیم: جُند یا فوجی اضلاع ـ جند فلسطین ـ تیہ یا
دشتِ آوارگان ـ لجفار ـ جُند الاردن ـ غوَر ـ جندِ دمشق ـ
غوطۂ دمشق، حوران، بتنیہ، جَولان، جیدور، اور حولہ ـ
بلقا ـ الشراۃ ـ الجبال ـ جندِ حمص ـ جُندِ قنسرین ـ جُندِ عواصم ـ
الثغور ـ شام کی نو مملکتیں ‏٭ خراج ومحاصل ـ اوزان ومکیال ‏٭

سیریا، نام سب سے اوّل یونانیوں نے اس قطعۂ ملک کو دیا تھا جو صور (یا ٹائر) کے گرد ونواح میں ہے۔ آگے چل کے پوری ولایت کو اسی نام سے پکارنے لگے لیکن عربوں نے کبھی بحر متوسط کے مشرقی کنارے کے علاقے کے واسطے یہ عام نام اختیار نہیں کیا۔ کوہستانی زمین اور میدانوں کا یہ وسیع وسرسبز علاقہ جو شام و فلسطین کے نام سے معروف ہے، شمال میں سلیشیہ کے دروں سے لے کے جانب جنوب صحرائے مصر تک پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں سمندر اور مشرق میں صحرائے عرب سے محدود ہے۔ عربوں نے اسے الشام کہا جو ایک قدیم عربی لفظ ہے بمعنی چَپ، (یا شمال") جب کہ قائل طلوع آفتاب کے رُخ کھڑا ہو۔ ایک اور وجہ تسمیہ جس میں زیادہ خیال آفرینی کی گئی ہے مقدّسی وغیرہ نے لکھی ہے کہ "کہتے ہیں سوریہ کو شام کہنے کا باعث

یہ ہے کہ وہ کعبہ شریف کے بائیں ہاتھ پر واقع ہے اور حجاز کی طرف سے ادھر آئے تو جانب چپ یا شمال کی جانب ہوگا۔ یا یہ کہ اس ملک میں بہت سے خوشنما مقامات ہیں جنھیں ہم "شامات" کہتے ہیں بمعنی سُرخ، سفید و سیاہ۔ (اور یہ وہ کھیت اور باغ ہیں جنھیں رخسار محبوب کے خال سے مشابہ سمجھا جاتا ہے)" (مقدسی-۱۵۲)

یہی مصنف آگے چل کے لکھتا ہے کہ

"شام بہت خوب مقام پر واقع ہے۔ طبیعی اعتبار سے ملک کو چار خطّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا وہ ہے جو بحرِ متوسط کے ساحل پر ہے۔ یہ مسطح علاقہ ہے جس میں ایک دوسرے کے بعد ریگستانی قطعات آتے ہیں اور بیچ بیچ میں مزروعہ اراضی آجاتی ہیں۔ اس خطّے میں الرملہ اور دوسرے ساحلی شہر واقع ہیں؛ دوسرا خطّہ پہاڑی اور گھنے درختوں کا ہے جس میں بہت سے چشمے بہتے ہیں اور جابجا دیہات اور مزروعہ کھیت ہیں۔ اس ٹکڑے میں منجملہ دوسرے بلاد کے یہ واقع ہیں: بیت جبرال یروشلم۔ نابلس۔ اللجون۔ کابل۔ قادص بلدہ بقاع و انطاکیہ؛ تیسرا خطّہ غور۔ (اُردن) کی وادیوں کا ہے جس میں دیہات اور ندّیوں کی کثرت ہے اور نخلستان، کھیت اور نیل کی کیاریاں بھی بہت ہیں۔ اس حصّے کے شہروں میں ویلہ، تبوک، صغر، ریحا، بیسان، طبریہ اور بانیاس ہیں؛ چوتھا خطّہ صحرا کے کنارے کا ہے۔ یہاں کے پہاڑ بلند و بے گیاہ ہیں۔ آب و ہوا بیابان کے موسم سے ملتی ہے مگر اس میں بہت سے گاؤں اور ان میں پانی کے چشمے اور جنگلی درخت موجود ہیں۔ شہروں میں مآب عمان، اذرعہ، دمشق، حمص، تدمور و حلب داخل ہیں" مقدسی-(۱۸۶)

"شام کی آب و ہوا معتدل ہے بجز اُن انقطاع کے جو ولایت کے وسطی خطّے میں، الشراہ اور الحولہ کے درمیان واقع ہیں۔ یہی گرم علاقہ ہے جہاں نیل، موز اور کھجور کی کاشت کرتے ہیں۔ ایک دن جب کہ میں ریحا میں مقیم تھا، طبیب غسان کہنے لگا "تم نے یہ وادی دیکھی؟" (یعنی وادی اردن غور) میں نے کہا "ہاں" تو پھر کہنے لگا کہ یہ یہاں سے حجاز تک چلی گئی ہے وہاں سے یمامہ، عمان اور حجر تک۔ پھر موصل کے بائیں جانب (یعنی غرب میں) بصرہ و بغداد سے گزر کے الرقہ تک پہنچ جاتی ہے اور ہر جگہ گرمی اور نخلستان کی وادی ہے۔"
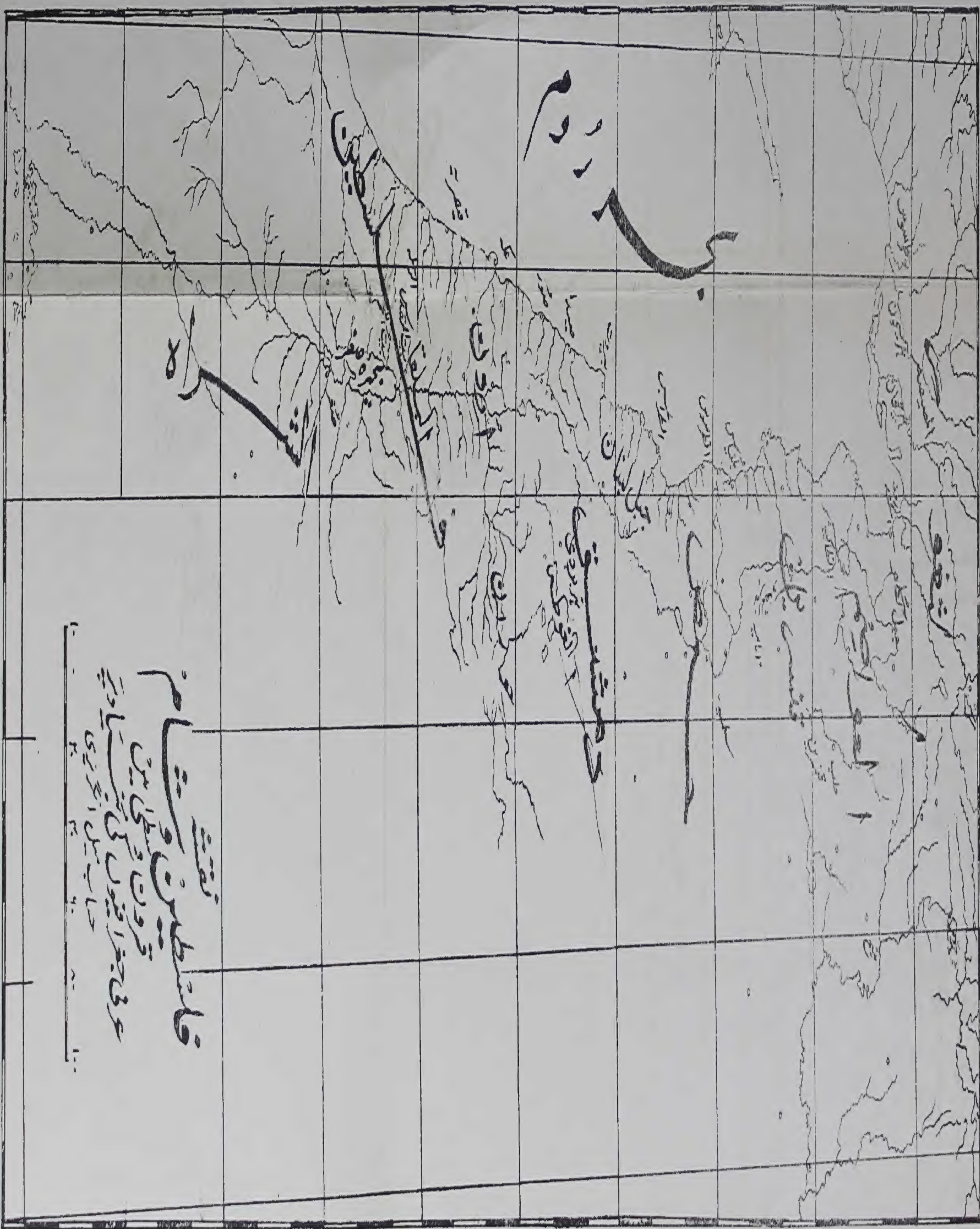
نقشہ
فلسطین و شام
قرون وسطی میں
عربی جغرافیوں کی بنیاد پر
حساب میل انگریزی

بحر روم
الثغور
العواصم
قنسرین
حمص
جبل لبنان
دمشق
الغوطہ
حوران
اردن
البلقاء
فلسطین
الشراۃ

شام میں سب سے ٹھنڈی جگہ بعلبک اور اس کی حوالی ہے۔ چنانچہ کہاوتوں میں بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے جاڑے سے پوچھا کہ تجھے کہاں پائیں گے؟ اس نے کہا بلقا میں۔ انھوں نے پھر کہا کہ اگر وہاں تو نہ ملے؟ تو جاڑے نے جواب دیا کہ "بے شبہ بعلبک تو میرا گھر ہے"!

۱۶

"ملک شام برکتوں کی سرزمین، ارزانی کا مقام ہے جہاں میوؤں کی کثرت اور ارباب تقدس کی بستی ہے۔ شمالی ولایت، جو یونانیوں کی سلطنت سے قریب ہے۔ ندیوں اور کھیتیوں سے مالامال ہے۔ یہاں کا موسم سرد ہے جنوبی ولایت پہلے سے بھی اچھی اور میووں کی شادابی اور نخلستان کی کثرت کے باعث، زیادہ خوشگوار ہے۔ لیکن سارے ملک شام میں کوئی دریا ایسا نہیں جس پر کشتیاں چلتی ہوں بجز چھوٹی ندرقوں کے"۔ (مقدسی - ۱۷۹)

"یہ سرزمین شام خشک انجیر، عام روغن زیتون، سفید روئی، رملہ کی نقابوں اور اسی طرح سفرجل (بہی) صنوبر کا پھل یا جوز (جسے قضم قریش کہتے ہیں) عینونی، دوری، انگور، تریاق، ترذوغ (ایک پھل) اور یروشلم کے گلاب کے باغوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ پھر جاننا چاہئے کہ خود صوبہ فلسطین کے اندر اکھتی چھتیس پیداواریں ایسی ہوتی ہیں کہ کسی اور سرزمین میں وہ سب یکجا نہیں ملتیں۔ ان میں بھی سات تو ایسی ہیں کہ سوائے فلسطین کے اور کہیں نہیں ہوتیں۔ پھر سات وہ ہیں جو دوسری ملکوں میں شاذ و کمیاب ہیں۔ باقی بائیس گو اس ایک صوبے میں یکجا ہوتی ہیں، دوسرے ملکوں میں بھی الگ الگ سب پائی جاتی ہیں۔ ان میں پہلی سات یہ ہیں: قضم قریش، سفرجل یا صیدانی سیب، عینونی اور دوری انگور، کافوری آلوچہ، انجیر جسے سباعی کہتے ہیں نیز دمشقی انجیر۔ بعد کی سات چیزیں یہ ہیں:- نیلوفر، جمیز (ایک قسم کا انجیر) خرنوب یا کرنب، عناب، ہاتھی پیچ، نیشکر، سیب۔ اور باقی بائیس چیزیں جو دوسری ملکوں میں بھی ملتی ہیں یہ ہیں:- کھجوریں - زیتون - میٹھا نیبو - بیر - نارنگی - تفاح (= کھیلا کھیلی) - نبق - جوز - لوز - ہیلون (مارچوبہ) موز - سماق - گوبھی - کمات (دگرمتا) لوبیہ (بیج، زرد آلو بیز، ثلج - دودھ -

باب اوّل

عاصمی انگور۔ شہد۔ تین تمری۔ مزید براں وہ مربّا جسے قُبیط کہتے ہیں کہ اس نام کا دوسری جگہ بھی ملیگا مگر یہ ذائقہ کہیں نہ ہوگا۔ اسی طرح کا ہو (سلات) کو اہوآز (ایران) کے سوا ہر جگہ معمولی ترکاری سمجھتے ہیں لیکن فلسطین میں وہ نہایت عمدہ کھانا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ بصرے میں بھی اسے عام ترکاریوں پر فضیلت دیتے ہیں" (مقدسی۔ ۱۸۱)

۱۷ ان میں سے بعض ناموں کی صراحت کردینی چاہیئے:۔ عربی لفظ تریاق ایک یونانی اصطلاح "تھریاکوس" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "زہریلے جانوروں کے کاٹے کی دوا" اس کو راب اور بہت سے مختلف قسم کے مفردات ملا کے بناتے تھے۔

قضم قریش کو لغات میں ایک قسم کے چھوٹے صنوبری درخت کا پھل لکھا ہے۔

نیشکر کی ازمنۂ وسطیٰ میں شام و فلسطین کے اکثر حصوں میں کاشت ہوتی تھی خاص کر ساحلی شہر طرابلس (دیکھو جزو دوم: طرابلس) اور یردن غور کے گرم علاقے میں آج بھی اس ضلع میں سیّاح کو جا بجا گنّا پیلنے کے کولھووں کے ٹوٹے پھوٹے نشان ملیں گے جنھیں وہ "طراحین السکر" کہتے تھے مغرب کے ملکوں میں نیشکر کی کاشت، ایران کی ولایت خوزستان سے پہنچی اور تمام ازمنۂ وسطیٰ میں شہر شوستر (قدیم سوس) وسیع پیمانے پر شکر سازی کے لیے مشہور تھا۔ شکر صاف کرنے کے فن کا عربوں میں ہر جگہ بہت رواج تھا اور ان کے دور حکمرانی میں نیشکر کی کاشت اور شکر سازی، مشرق میں ہندوستان سے لیکر مراکش تک دُور دُور پہنچی اور مسلمانوں کے ہسپانیہ اور صقلیہ فتح کرنے کی بدولت اس کا یورپ میں بھی رواج ہوگیا۔

نارنج (نارنگی) کے متعلق گیلیسیو کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان وہ ملک ہے جہاں سے یہ پھل پہلے مغربی ایشیا میں پہنچا اور پھر یورپ آیا۔ ہندوستان میں بہت قدیم زمانے سے اس کی کاشت ہوتی تھی اور نویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے قبل اس کی تلخ صنف کا بظاہر عربو

کو علم ہو چکا تھا اور وہ اسے جنوب مغربی ایشیا میں لے آئے تھے۔ مسعودی اپنی ۳۳۲ھ (۹۴۳ء) کی تحریر میں نارنج اور سنترے کے پرورش پا جانے کی نسبت حسب ذیل شہادت قلمبند کرتا ہے:-

"نارنجی کا درخت (شجر النارنج) اور گول سنترے (الترج المدور) کا پیڑ سن ۳۰۰ھ (۹۱۲ء) میں ہندوستان سے لا کے سب سے پہلے عمان میں لگایا گیا۔ وہاں سے کاروان اسے بصریٰ اور پھر عراق و شام میں لائے۔ اب طرسوس اور شام کے دوسرے سرحدی شہروں میں گھر گھر اس درخت کو کثرت سے بوتے ہیں۔ انطاکیہ، شام کے ساحلی مقامات اور مصر و فلسطین میں بھی، جہاں تھوڑے دن پہلے انھیں کوئی نہ جانتا تھا، خوب کاشت ہونے لگی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہاں آ کے اس درخت میں وہ مہک اور ذائقہ اور رنگ بھی نہیں رہا جیسا کہ ہندوستان میں تھا۔ اس کا سبب موسم اور پانی اور سرزمین کا فرق ہے جو اس کے وطن ہندوستان جیسی یہاں نہیں ہیں" (مسعودی دوم - ۴۳۸)

۱۸ یبروج الصنم کو عربی میں لفاح بھی کہتے ہیں۔ مغربی علمائے نباتات میں اس کا نام (Fructus at, ropa Mandragora) ہے عرب اسکی جڑ کو یبروج کہتے تھے۔ یہ زہریلی ہوتی ہے، مگر اس کا پھل کھاتے ہیں۔

مقدسی نے مصر کے حال میں نبق کی نسبت لکھا ہے کہ یہ پھل زعرور (کنار س) کے برابر بڑا ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی گریاں ہوتی ہیں اور مزے میں شیریں ہے۔ اس پھل کے ساتھ ایک قسم کی میٹھی لئی نیدہ ملا کے سرکیوں پر سکھا لیتے ہیں کہ وہ اس میں لپٹ جاتی ہے نیدہ اسی قسم کی چیز ہے جیسے سمنو لیکن زیادہ باریک تیار کرتے ہیں" (مقدسی - ۲۰۴) سمنو وہی حلوا ہے جو آجکل بھی تمام ایران میں مشہور ہے اور نیدہ نام کی مٹھائی سے اب بھی مصر کے قصبہ منشیہ کی شہرت ہے۔

قبیط جسے قباط و قبا د بھی کہتے ہیں، ایک قسم کا مربا ہے اور اسے خرنوب کی شکر میں پستے بادام ڈال کے تیار کرتے تھے۔

باب اول

مقدسی نے دسویں صدی عیسوی میں شام کی تجارت کا حال بیان کیا ہے :-

" شام میں بہت خاصی تجارت ہوتی ہے "۔

فلسطین سے زیتون، چھوارے، کشمش، خرنوب کے سوت ملے ریشم کے کپڑے، صابن اور رومال آتے ہیں۔ یروشلم سے پنیر، روئی، عینونی اور دوری انگور کی مشہور کشمش، اعلیٰ درجے کے سیب اور موز لاتے ہیں۔ موز آرغنے کے مثل ہوتا ہے مگر چھلکا اتار یئے تو اندر سے خربزے کی طرح کا گودا نکلتا ہے۔ گو اس سے زیادہ اور ذائقہ میں بہتر ہوتا ہے۔ وہ جوز جسے قضیم قریش کہتے ہیں اور جس کی اور کہیں نظیر میسر نہیں، یہیں سے آتی ہے۔ اس کے علاوہ آئینے، فانوس اور سوئیاں بھی یروشلم سے لاکے بیچتے ہیں "۔

ریحا سے عمدہ قسم کا نیل آتا ہے "۔

صغر بیسان سے نیل اور کھجور اور ایک قسم کی راب جسے دبس کہتے ہیں، آتی ہے۔

عمان سے غلہ، بھیڑیں اور شہد۔

طبریہ سے، قالین، کاغذ اور کپڑا۔

قدس سے، وہ پارچہ جنھیں تنیسہ اور بلعیسیہ کہتے ہیں۔ نیز رسیاں کر

صور سے، شکر، کانچ کے منکے، کانچ کے برتن مخروطا اور ڈھلے ہوئے۔

مآب سے، بادام (گری)

بیسان سے، چاول۔

دمشق سے یہ سب چیزیں آتی ہیں: تازہ پیلا ہوا روغن زیتون، بلعیسیہ کپڑا، کارچوب، روغن بنفشہ ادنیٰ قسم کا، برنجی ظروف، کاغذ، جوز، چھوارے، اور کشمش۔

حلب سے روئی کپڑا، چھوارے، خشک ترکاریاں اور سرخ کھریا جسے الغرہ کہتے ہیں۔

بعلبک میں چھوارے کی مٹھائی بنتی ہے جسے ملبن کہتے ہیں "۔ (مقدسی - ۱۸۰)

۱۹

باب اول

اوپر کی فہرست میں بعض چیزیں صراحت کی محتاج ہیں :-

دبس وہ شیرہ ہے جسے پھل ابال کر تیار کرتے ہیں۔ یہ اکثر ایسی کھجوروں یا کشمش سے بنایا جاتا ہے جو اپنے ہموزن پانی میں ڈبو کر اور جوش دیکر چھوڑ دیجاتی ہیں تاکہ گرمی سے پانی آہستہ آہستہ خشک ہو جائے۔ اس کے بعد انھیں دھوپ میں سکھا لیتے ہیں جس سے ایک گاڑھا گاڑھا رس رہ جاتا ہے

جس کاغذ کا اوپر ذکر آیا وہ قطنی کاغذ ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں اسے "کارتا داامس کینا" یا "بامبی کینا" کہتے تھے اور عربوں نے تسخیر سمرقند ۷۰۴ء کے وقت سے اس فن کو سیکھ لیا تھا۔ اگرچہ رومہ میں یہ کاغذ بہت شروع یعنے دسویں صدی عیسوی سے برتا جانے لگا تھا تاہم تمام یورپ میں اس کا عام استعمال سترھویں صدی کے وسط سے کچھ بہت پہلے نہیں ہوسکا اور ململی کاغذ سب سے اول چودھویں صدی میں بنایا گیا۔

وہ کپڑا جسے منیر کہتے تھے دھرے بانے کا ہوتا اور پائیداری میں مشہور تھا۔ یہ زیادہ تر شیراز اور رے (ایران) میں تیار کیا جاتا تھا جہاں اسے "ڈے بود" موسوم کرتے تھے۔ بلعیسیہ کے متعلق لغت کی کتابوں میں کوئی تفصیلی تحریر نہیں ہے۔

سُرخ کھریا جو مغرۃ کہلاتی تھی اصل میں ایک معدنی شئے ہے جسے ازمنہ وسطیٰ میں دواساز خاص خاص مرکبات بنانے میں بہت استعمال کرتے تھے خاص کر مثلاً نے اور امراض جگر کے نسخوں میں جس کی تعریف دیوس اوری کس نے بھی کی ہے۔

ملبن نامی مٹھائی کا یہودی طبیب بے موئی ڈس نے (عبرانی) میں "ملبن" ۲۰

۱؎ اس (کارطا بومبی کی نا) کے روئی سے بننے کی روایت عام طور پر کی جاتی ہے لیکن حال میں ایم بریکی کوئے نے اس کی تردید کی ہے۔ اس محقق کے قول کے مطابق بومبی کی ناسن اور پرانے رسیوں کے فرسودہ ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا۔ دیکھو اس کی کتاب "لالی زاند پیلیو گرافیک دوبیپر د کوتن"۔ جنیوا ۱۸۸۶ء۔

باب اول

کے نام سے تذکرہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اسے انجیر دبا کر چھوٹی اینٹوں کی صورت میں تیار کرتے تھے۔

شام کی معدنی پیداواروں کے ذکر میں مقدسی بیان کرتا ہے کہ "بیروت کے اوپر پہاڑوں میں لوہے کی کانیں ہیں اور حلب کے قریب لال کھریا جسے مغرہ کہتے ہیں ملتی ہیں۔ یہاں اس کی اعلیٰ قسم پائی جاتی ہے مگر عمان میں کہ وہاں بھی یہ دستیاب ہوتی ہے اتنی اچھی نہیں ہوتی۔ تمام شام میں بہت سے پہاڑ سرخی مائل رنگ کے نظر آتے ہیں جن کا پتھر سنگ سمقہ (یا سرخ دودھیا) کہلاتا ہے اور آسانی سے کھود لیا جاتا ہے، سفیدی مائل پتھر کے جسے حوارہ (یا سفید کھریا) کہتے ہیں پہاڑ بھی ہیں۔ یہ نرم ہوتا ہے اور اسے چھتوں کی سفیدی یا مہتابیوں کی درز بندی کے کام میں لاتے ہیں، فلسطین میں عمدہ سفید عمارتی پتھر کے کھدانے ہیں اور بیت جبریل کے قریب کئی مقام پر سنگ مرمر پایا جاتا ہے۔ غور کے اضلاع سے گندک اور اسی قسم کی بعض معدنیات لاتے ہیں۔ اور بحر لوط سے سفوف کی صورت میں نمک آتا ہے۔ بہترین شہد یروشلم کا ہوتا ہے جہاں شہد کی مکھیاں جنگلی پودینہ (سعتر) چوستی ہیں اور اسی طرح جبل عاملہ کا شہد بہترین ہوتا ہے۔ اچار کی وہ قسم جسے مری کہتے ہیں سب سے اچھی اریحا میں بنتی ہے" (مقدسی۔ صفحہ ۱۸۱)

مری جس کا اوپر ذکر آیا وہ اچار ہے جسے مچھلی یا گوشت کو نمک کے پانی میں ڈال کر تیار کرتے ہیں۔ اس میں طبی خواص بھی ہیں جن کا جالینوس، دیوس کوری لس وغیرہ نے خاص تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ رومی لوگ یا روم یا مریہ کے نام سے اسے جانتے تھے۔ ایک مصنف الحافظ نام اسے مسالوں کا بادشاہ کہتا ہے۔

مقدسی لکھتا ہے کہ "شام میں پانی عام طور پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ مگر بانیاس کے پانی میں تلین کا اور صور کے پانی میں قبض کا خاصہ ہے۔ بیسان کا پانی بھاری اور برا ہوتا ہے اور صغر کے پانی سے خدا پناہ میں رکھے بیت الرام کا پانی نفرت کے قابل ہے لیکن اتنا ہلکا اور اچھا پانی جیسا اریحا میں ہوتا ہے

باب اوّل

کہیں نہ ملے گا۔ رملہ کا پانی زود ہضم مگر نابلس کا ثقیل ہوتا ہے۔ دمشق اور بیت المقدس کا پانی اتنا ثقیل نہیں کیونکہ ان شہروں کا موسم اس قدر خشک نہیں ہے" (ص۱۸۴)

شام کے عام رسم و رواج کی نسبت مقدسی کا بیان حسب ذیل ہے:-

"شام کی مسجدوں میں عام قاعدہ ہے کہ چراغ ہر وقت روشن رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کو مکہ شریف کی طرح زنجیروں میں لٹکائے رکھتے ہیں۔ ہر صوبے کے صدر مقام میں سرکاری خزانہ بڑی مسجد میں رکھا جاتا ہے یعنے ستونوں کے اوپر ایک کمرہ بنا کے روپیہ اس میں رکھ دیتے ہیں۔ اور ان کی مسجدوں کا، سوائے اریحا کی ایک مسجد کے، طریقہ یہ ہے کہ صحن کے بعد اصل عمارت میں دروازے لگاتے ہیں جنھیں بند کر کے عمارت کو صحن سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور خود صحن میں پتھر کا فرش ہوتا ہے۔ ساری ولایت میں صرف طبریہ کی بڑی مسجد کے صحن میں کنکر کا فرش ہے۔

21

میناروں کو چوکور تعمیر کرتے ہیں اور مسجدوں کی چھتیں سلامی دار[1] (مغطی) رکھتے ہیں جو جملان بھی کہلاتی ہیں (بمعنی شتر پشت)، مسجد کے سب دروازوں پر اور باہر بازاروں میں بھی وضو کے حجرے بنے ہوتے ہیں۔

وہ مسیحی تہوار جن کو سال کے مختلف موسموں کی تقسیم کے لیئے شام کے مسلمان بھی مناتے ہیں حسب ذیل ہیں:-

عید نوروز، اعتدال ربیع کے موقع پر اور باعتبار تقویم قدیم سال کے آغاز پر ہوتی ہے، عید عنصرہ (وہٹسن ٹائیڈ) گرمی کے زمانے میں اور عید میلاد موسم سرما میں، عید بربارہ (چوتھی کانون اول = دسمبر) برسات کے موسم میں مناتے ہیں اور لوگوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ جب "بربارہ ولی کی عید آئے تو راج چاہے تو انند کے تار بجائے" اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے گھر خاموش بیٹھے۔ اور عید قلندس (پہلی کانون ثانی = جنوری) میں اس کے متعلق بھی یہ

[1] دیکھو باب سوم جہاں مقدسی کا مسجد اقصیٰ کے متعلق بیان نقل کیا ہے۔

باب اول

مثل کہتے ہیں وہ جب قلندس آئے تو گھر بیٹھے اور آگ جلائے"۔ عید صلیب (ماہ ایلول = ستمبر کی ۱۳-۱۴) انگور توڑنے کے زمانے میں، اور عید لد (یا سینٹ جارج کا تہوار، ۲۳ نیسان = اپریل) تخم پاشی کے وقت ہوتی ہے۔

شام میں یونانیوں کے شمسی مہینے استعمال کئے جاتے ہیں انکے نام یہ ہیں:- تشرین اول و ثانی (اکتوبر و نومبر) کانون اول و ثانی (دسمبر و جنوری) شباط (فروری) آذار (مارچ) نیسان اپریل) ایار (مئی) حزیران (جون) تموز (جولائی) آب (اگست) اور ایلول (ستمبر)"(مقدسی ۱۸۲)

پھر مقدسی لکھتا ہے کہ "ایسا بہت کم سننے میں آیا ہے کہ شام کے کسی فقیہ نے کوئی نئی بات مسائل میں نکالی ہو یا یہاں کے کسی مسلمان نے کوئی کتابت کی ہو بجز طبریہ کے جہاں کے کاتب ہمیشہ سے مشہور چلے آتے ہیں۔ ورنہ شام میں جیسا کہ مصر کا حال ہے، تمام کاتب نصاریٰ ہیں کیونکہ مسلمان اپنی مادری زبان کے بھروسہ پر، ادب کو اس محنت سے حاصل نہیں کرتے جیسے غیر قوم والے۔

۲۲

یہاں صراف، رنگ ساز، ساہوکار اور دباغ بھی زیادہ تر یہودی ہیں اور طب اور کتابت کرنے والے عام طور پر نصاریٰ ہوتے ہیں۔

شامی لوگ نہایت خوش لباس ہیں، یعنی عالم اور عامی دونوں گروہ کے لوگ نیچے کوٹ جنھیں رداً کہتے ہیں پہنتے ہیں اور گرمیوں میں بھی ہلکے کپڑے استعمال نہیں کرتے البتہ جوتی ایک تلے کی ہوتی ہے۔

شامی اُون کے بہت بھاری برساتی کوٹ جنھیں مِمطر کہتے ہیں پہنتے ہیں یہ سامنے سے کھلے ہوتے ہیں، اور ان کے طیلسان گولائی لئے ہوئے نہیں ہوتے رملہ میں بڑے سوداگر عام طور پر مصری گدھوں پر سوار ہوتے ہیں جن کے چار جامے بہت اچھے ہوتے ہیں اور صرف امرا یا رؤسا ہی یہاں گھوڑے رکھتے ہیں، دیہاتیوں

ؑ اس مقام پر انگریزی کتاب میں عربی سے جو ترجمہ نقل کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ ہم نے اصل کتاب کو سامنے رکھکر اس کا ترجمہ کر دیا۔ مترجم۔

باب اول

اور کاتبوں کا لباس ایک اونی صدری ہے جسے درعہ کہتے ہیں۔ یروشلم اور نابلس کے آس پاس کے دیہات میں کسان صرف ایک کرتا (کسا) پہنتے ہیں اور نیچے کوئی شلوار نہیں ہوتی" (مقدسی ۱۸۲ و ۱۸۳)

طیلسان جس کا اوپر ذکر آیا اس زمانے میں قاضیوں اور علما کا مخصوص سر کا لباس تھا، اس میں ایک نقاب (= ترحہ) معمولی دستار کے اوپر سے نیچے کندھوں تک پڑی ہوتی تھی۔ اسے عام طور پر ململ یا اور کسی باریک کپڑے سے بناتے تھے۔ اصل لفظ مقور ہے جس کا ہم نے "گولائی لیے ہوئے" ترجمہ کیا۔ اس کے دوسرے معنی کلف دار کے بھی ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر یہ اس گولائی یا خلا کے معنی میں آتا ہے جو پگڑی کے اوپر بن جاتا ہے۔ دُرّعہ (جسے مدرعہ بھی کہتے تھے) چھوٹی صدری ہوتی تھی جس کو سامنے سے کھلا رکھتے تھے گو اس میں بٹن بھی ہوتے تھے کہ ضرورت ہو تو لگا لیے جائیں۔ یہ اونی یا سوتی کپڑے کی رنگین بنائی جاتی تھی۔

کسا عبا کرتا یا پیرہن ہے جو گردن سے قریب قریب پاؤں تک پہنچتا ہے۔ یہ سفید یا رنگین ہر طرح کے کپڑے کا ہوتا تھا۔ فلسطین کے فلاحین کا لباس آج بھی بالکل وہی ہے جیسا کہ مقدسی نے اوپر بیان کیا۔ زمانۂ وسطیٰ کے مصنفوں کو پڑھتے وقت وہ لوگ جنھوں نے جدید شام کی سیاحتیں کی ہیں، یہ دیکھ کر بار بار حیران ہو جائیں گے کہ جو رسم و رواج ان مصنفوں کے مشاہدے میں آئے وہ آج تک بجنسہ چلے آتے ہیں علی الخصوص تنوروں کے متعلق ذیل کا بیان کلیۃً اس حالت کے مطابق ہے جو آج بھی کوہ کارمل کے دروزی دیہات میں نظر آتی ہے:-

۲۳

مقدسی لکھتا ہے "کہ شام والوں میں تنور کا رواج ہے اور گاؤں والے ایک خاص قسم کے تنور سے جسے طابون کہتے ہیں، کام لیتے ہیں۔ یہ روٹی پکانے کے واسطے چھوٹے چھوٹے زمین میں گڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کناروں پہ کنکر جما کے اندر اور منہ کے اوپر لیپے گی آگ سلگا دی جاتی ہے۔ پھر جب کنکر حرارت سے خوب سرخ انگارا ہو جاتے ہیں، تو ان پر روٹی ڈال کر

باب اول

پکائی جاتی ہے، شام میں سور کی روٹی پکانے والے بھی ہیں اور بیا رہ بھی پکتا ہے (یعنی پھلیاں دودھ اور شہد میں۔) زیتون کی پھلی کو کھل جانے کے بعد ابال کر بگھار لیتے ہیں اور یہ کھانا زیتون کے ساتھ کھانے کے لئے بازاروں میں بکتا ہے۔ لوبئے کو نمک میں سکھا لیتے ہیں اور یہ بہت کھایا جاتا ہے تخم خرنوب سے ایک قسم کی مٹھائی بنتی ہے جسے قبیط کہتے ہیں اور نیشکر کی بنی ہوئی مٹھائی کا نام، فرق کرنے کے لئے ناطف رکھ لیا ہے۔ (یعنی شیرینی) سردیوں میں میٹھے مکھن کے کلچے پکاتے ہیں جن کا نام زلابیہ ہے یہ سموسے کی طرح اندر بھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن دوسری جگہ جو میوہ بھر کر اوپر چلیپا بناتے ہیں، شام میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ رسم و رواج شامیوں کے اکثر اسی قسم کے ہیں جیسے مصریوں کے مگر خال خال رسمیں عراق اور اقور (یعنی جنوبی اور شمالی عراق) والوں سے ملتی ہیں" (مقدسی ۱۸۳)

و فلسطین کے تمام ساحل پر پہرے کی چوکیاں جو رباط کہلاتی ہیں بنی ہوئی ہیں جہاں فوجی بھرتی ہوتی ہے۔ یونانیوں کے جنگی جہاز اور کشتیاں (شوانی) بھی ان بندرگاہوں میں آتی ہیں اور مسلمان قیدیوں کو لاتی ہیں جنھیں فدیئے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ تین قیدیوں کا فدیہ ایک سو دینار ہوتا ہے[1] ان سب بندرگاہوں میں یونانی جاننے والے لوگ ملتے ہیں کیونکہ یہ نامہ و پیام کے لئے یونانیوں کے پاس جاتے ہیں اور مختلف اجناس کی خرید و فروخت ان سے کرتے ہیں۔ یونانی جہاز کے نمودار ہوتے ہی رباط والے تری بجاتے ہیں۔ رات ہو تو برج پر روشنی کا مینار جلاتے ہیں اور دن ہو تو خوب دھواں کرتے ہیں۔ ہر رباط سے ساحل سے لیکر پائے تخت رملہ تک، تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مینار بنے ہوئے ہیں جن میں ایک جماعت تعینات رہتی ہے۔ جس وقت یونانی جہاز آتے ہیں تو برج کے لوگ جو ساحل سے قریب ترین

---

[1] یہ قریب قریب سولہ اشرفی فی سیر ہوا لیکن زمانہ حال کے روپے میں یہ رقم ۵ پونڈ کے قریب ہوگی۔ دیکھو صفحہ ۴۸ ۔

ہوں مینار پر آگ روشن کرتے ہیں پھر اس کے قریب کے برج والے اور پھر اگلے برج والے تا آنکہ مشکل سے کوئی گھنٹہ ایسا گزرتا ہے کہ پائے تخت میں تُرئی اور برجوں پر ڈھول نہ بجتے ہوں۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمندر کے کنارے رُباط تک آئیں۔ چنانچہ وہ جوق در جوق ہتھیار لیئے ہوئے دوڑتے ہیں اور گاؤں کے جوانوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔ تب فدیہ ادا ہونا شروع ہوتا ہے۔ بعض لوگ قیدی کو پورا فدیہ دے کے چھڑا لیتے ہیں مگر بعض جو اتنے دولت مند نہیں ہوتے، چاندی کے درہم یا انگوٹھی چھلے یا اور اسی قسم کی کوئی قیمتی چیز بطور چندہ پھینکتے ہیں یہاں تک کہ یونانی جہازوں میں جتنے قیدی ہیں سب چھڑا لیئے جاتے ہیں۔ فلسطین کے ساحلی مقام جہاں قیدیوں کو اسی طرح چھڑانے کا رواج ہے، یہ ہیں غزہ، میماس، عسقلان، ماحوزِ ازدود، ماحوزِ ینا یافہ اور ارسوف" (مقدسی ۱۷۷)

ملکی تقسیم

جس وقت ساتویں صدی مسیحی کے نصف اوّل میں عرب فتوحات کا سیلاب عظیم شام پر امنڈ آیا اور یہ ملک بائی زنطی قبضے سے عربوں نے چھینا تو حملہ آوروں کی فوجیں اسی معروف کاروان کے راستے آئیں جو مکہ اور مدینہ شریف سے دمشق آتا ہے اور اب بھی شام کے حاجی اسی راستے حجاز سے اپنے شہروں میں واپس پہنچتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے جو اقطاع اسلام کے زیر نگیں آئے وہ اردن اور بحر لوط کے مشرق کے علاقے تھے اور جب تک دمشق اور اس کا شمالی علاقہ قبضہ میں نہ آگیا جابیل، صوبۂ اردن کے نشیبی میدان اور فلسطین میں مسلمان نہ پھیل سکے۔ لیکن دمشق کے اوپر کے اضلاع جن میں عسقلان۔ حلب اور امیسر (حمص) کے بلاد عظمیٰ واقع ہیں فتح ہوتے ہی مذکورہ بالا اضلاع کی تسخیر میں کچھ دیر نہ لگی اور اس طرح فتح شام کی تکمیل

باب اول

ہو گئی ؎

فن ملک داری کے ماہر اعظم خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے جس وقت اسلامی سلطنت کا نظم و نسق درست کیا تو حملہ آوروں کے اسی راستے کی بناء پر مفتوحہ علاقوں کی مختلف اضلاع میں تقسیم کی؟ شام تین صوبوں میں منقسم ہوا۔ ہر صوبہ جند کہلاتا تھا جس کے معنی سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ہیں۔ شام میں اس لفظ کو "فوجی اضلاع" کے معنی میں استعمال کیا گیا جہاں سپاہیوں کی ایک خاص جمعیت کی چھاونی رہتی تھی اسی لیے حسب ذیل پانچ صوبے

۲۵

بنے :-

جند دمشق اور شمال میں جند حمص اور جند قنسرین دمشق کے مغرب اور جنوب مغرب میں اُردن کا ضلع جند الاردن کہلاتا تھا جس میں جلیل، خلیج جلیل اور بحر لوط تک کے پست میدان تھے۔ پھر اس کے مغرب میں فلسطین خاص کا علاقہ یا جند فلسطین تھا جس میں عکہ کے میدان عظیم کے جنوب میں خلیج اُردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی حد پر سمندر تھا اور جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔

ولایت دمشق کے شمالی اقطاع عربوں کی فتح کے پہلے پانچ سال میں ایک ہی جند میں شامل رہے جو اپنے صدر مقام کے نام پر جند حمص کہلاتا تھا۔ جس وقت بنی امیہ کے پہلے خلیفہ حضرت معاویہؓ (۶۶۱ تا ۶۸۹) اپنے حریف حضرت علیؓ پر غالب آئے اور شمالی عراق کے لوگوں کو ان سے توڑ کر اپنا مطیع کر لیا، تو انھوں نے اس علاقہ کو جہاں یہ عراقی بس گئے تھے جند قنسرین کے نام سے ایک علٰحدہ ضلع بنا دیا۔ یہ دمشقی کا بیان ہے جو ایک عرصے بعد کا (۱۳۰۰ء) مصنف ہے۔ قدیم مورخ بلاذری (۸۷۹ء) اس کے خلاف یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے بیٹے خلیفہ یزید نے ان علاقوں کو حمص سے علٰحدہ علٰحدہ کر کے قنسرین کا نیا جند بنایا تھا (بلاذری ۱۳۲) یاقوت نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ جلد سوم ص ۴۳) نیا صوبہ اپنے صدر مقام (یعنی قدیم کالکیس) کے نام پر قنسرین موسوم ہوا۔ حلب عسقلان

باب اول

اور منبج کے اقطاع اس میں شامل کر دئے گئے۔

اس طرح پانچ جندوں میں تقسیم ہونے کے بعد شام امویوں کی دمشق کی خلافت کے تمام زمانے میں اسی طرح رہا۔ اس خاندان کے زوال اور عباسیوں کے عروج کے بعد، جنھوں نے دجلہ پر بغداد کو اپنا دار الخلافہ بنایا، شام کی حدود میں خلیفہ منصور اور اس کے جانشینوں کی فتوحات سے بہت کچھ اضافہ ہو گیا اور عہد ہارون الرشید میں، ۱۷۰ھ /۷۸۶ء کے قریب قنسرین کے جند کو جو ضرورت سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا، دوبارہ تقسیم کرنا ضروری معلوم ہوا۔ چنانچہ ایک نیا جند بنایا گیا جس میں ایرانی سرحد کی طرف مغرب میں انطاکیہ سے لیکر مشرق میں حلب اور منبج تک کا علاقہ شامل تھا اسے جند العواصم کہتے تھے۔ عواصم، عاصم بمعنی حصار کی جمع ہے، اس سے بھی اوپر کے رخ اور خاص سرحد پر ایک اور ضلع الثغور (یعنی سرحدی قلعے) قائم کیا گیا۔ سرحدی قلعوں کو بھی اکثر مغرب میں ثغور شام اور مشرق کی طرف والوں کو ثغور عراق کہتے تھے۔ ضلع بھر میں قلعوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا جو شام کی مشرقی سرحد کی حفاظت کرتے اور رومیوں کی یورشوں کو روکنے کے لئے بنائے گئے تھے یہ سلسلہ مغرب میں طرسوس، اذنہ (ادانہ) اور مصیصہ سے (جہاں ملطیہ اور حصن منصور اس لڑی کی ابتدائی کڑیاں تھیں) مشرق میں فرات کی بالائی وادیوں تک پھیلتا تھا جہاں سموسطہ اور بالس نامی قلعے تھے (دمشقی ۱۹۲ و ۲۱۴)

۲۶

لیکن یہ کچھ عرصہ بعد کی تقسیم تھی۔ شروع میں جو پانچ جند بنائے گئے، وہ قریب قریب اسی تقسیم کے مطابق تھے جو قدیم سے رومی اور بازنطی سلطنت نے کر رکھی تھی فتوحات عرب کے وقت تک یہ تقسیم موجود تھی اور تھیودوسیس کے دستور العمل میں جو پانچویں صدی عیسوی کی کتاب ہے، اس کا حال لکھا ہے۔

فلسطین خاص کے اقطاع، جن میں یہودا اور سامریہ بھی شامل تھے، پہلے "پیلس ٹینا پرائما"، کا صوبہ تھا اور "سیزاریہ" اس کا صدر مقام

باب اول

تھا۔ اب اسی علاقہ کا نام جُند فلسطین ہو گیا اور صدر مقام رملہ قرار پایا۔

"پیلس ٹینا سیکنڈا"، جس میں دونوں جلیل اور پیریہ کا مغربی حصہ داخل تھا اور اسکیتھوپولس (: بیت شین۔ بیسان) اس کا مستقر تھا، اب جُند الاردن موسوم ہوا اور نیا صدر مقام طبریہ میں بنا۔

"پیلس ٹینا ٹرٹیا" میں ادومیہ اور اربیا پیٹریا شامل تھے۔ عربوں نے اس کا کچھ حصہ تو جُند دمشق میں لے لیا اور کچھ جند فلسطین میں محسوب ہونے لگا۔

"فنیشیہ پرائما" جس کا صدر مقام صُور تھا اور "فنیشیہ سیکنڈا" اردن کے مشرق میں بہت سی دور دست اراضی کے ساتھ (بروئے تقسیم جدید) دمشق کے وسیع جند میں آگئے۔

اس کے شمال میں "سیریا سیکنڈا"، کو جس کا دارالسلطنت اپامیا تھا عربوں نے حماۃ اور حمص کے جندوں میں بانٹ دیا اور آخری ولایت "سیریا پرائما"، جس کا دارالحکومت انتیوک تھا۔ جند حلب یا قنسرین بن گئیں اگرچہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شام کا یہ وہ ٹکڑا تھا جو آگے چلکر جند العواصم کے نام سے جداگانہ ضلع بنایا گیا۔

۲۷ ان جنود اور شمالی صوبوں کا عرب جغرافیہ نویسوں نے حسب ذیل طریق پر حال لکھا ہے:۔

اصطخری اور ابن حوقل دسویں صدی میں تحریر کرتے ہیں کہ "جند فلسطین جند اردن، جند دمشق، جند حمص، جند قنسرین اور پھر جند عواصم اور ثغور شام کے صوبے ہیں۔ شام کی حدود اربعہ یہ ہیں:۔

مغرب میں بحر روم، مشرق میں ایلہ سے فرات تک کا صحرا پھر اس دریا کے کنارے کنارے رومی سرحد۔ شمال میں ممالک روم۔ جنوب میں ملک مصر وتیہ بنی اسرائیل۔

مصر کی طرف شام کا سب سے جنوبی مقام رفح ہے، شمال میں روم کی طرف انتہائی سرحدیں ثغور کی ہیں جو قدیم زمانے میں عراق کے قلعے کہلاتے

باب اول

تھے، ان کے نام یہ ہیں :۔ ملطیہ، الحدث، مرعش، الهارونیہ، الکنیسہ، عین زربہ، المصیصہ، اذنہ اور طرسوس، ہم تمام قلعوں کو عام طور پر شام میں داخل سمجھتے ہیں لیکن گو ان میں سے بعض ہمیشہ شام کے قلعے مانے جاتے تھے تاہم بعض ایسے بھی ہیں جن کو اکثر ثغور عراق کہا جاتا تھا مگر حقیقت میں یہ سب شامی ہیں کیونکہ فرات کے اس جانب (یعنے مغرب میں) جو علاقہ ہے وہ سب شام ہی میں داخل ہے۔ بہر حال یہ واضح رہنا چاہیے کہ ملطیہ سے مرعش تک جن قلعوں کے نام ہم نے شروع میں لکھے ہیں وہ عموماً عراق کے قلعے کہلاتے ہیں اس لئے کہ ان میں ہمیشہ عراق والوں کی فوجیں متعین کیجاتی ہیں جو وہاں سے یونانیوں کے علاقے میں چھاپے مارتے رہتے ہیں۔ ورنہ فی الواقع یہ قلعے ولایت عراق میں داخل نہیں ہیں،، (اصطخری ص۵۵۔ ابن حوقل ص۱۰۸)

چودھویں صدی میں فرنگیوں کا تسلط دور ہونے کے بعد ابو الفدا بیان کرتا ہے کہ

"ہمارے زمانے میں ارمینیہ خورد کی مملکت جسے بلادِ سیس کہتے ہیں شام کی حدود میں داخل ہے لہذا شمالی سرحد فرات کے کنارے بلیس سے قلعات نجم، البیرہ، قلعۃ الروم، سیمسیاط، حصن منصور، بهسنی اور مرعش سے گزر کر پھر بلادِ سیس و طرسوس و بحر متوسط تک آتی ہے،، (صفحہ ۲۲۶)

(۱) جند فلسطین اور ماتحت اضلاع۔

۲۸

اس ضلعے کے تحت میں الجفار اور تیہ (یعنے بنی اسرائیل کی سرگردانی کا دشت) کے ضلعے تھے جو دونوں مصری سرحد پر واقع ہیں۔ یعقوبی کہتا ہے کہ جند فلسطین کا قدیم دار الحکومت لُدّ (Lydda) تھا۔ پھر خلیفہ سلیمان نے شہر رملہ کی بنیا ڈالی اور اسے دار الحکومت بنایا، لُدّ کو زوال آگیا کیونکہ اس کی تمام آبادی نئے دار الحکومت الرملہ میں منتقل کردی گئی[۱]

[۱] دیکھو اس کتاب کا باب ہشتم :- الرملہ

باب اول

پھر یعقوبی جس نے نویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب لکھی ہے بیان کرتا ہے کہ "فلسطین کی آبادی میں قبائل لخم، جذام، عاملہ، کندہ، قیس، اور کنانہ کے عرب شامل ہیں"۔ (صفحہ ۱۱۶-۱۱۷)

اصطخری اور ابن حوقل لکھتے ہیں کہ "ولایات شام کا سب سے مغربی حصہ ہے، رفح سے اللجون تک اس کی سب سے زیادہ لمبائی اتنی ہے کہ ایک سوار دو روز میں اسے طے کرے، اور یافہ سے اریحا تک صوبے کا عرض طے کرنے کے لئے بھی اتنا ہی وقت درکار ہوگا، فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط کا علاقہ، الجبال اور الشراہ ایلہ تک فلسطین میں شامل ہیں اور اسی کی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر الذکر دونوں ضلعے جداگانہ ولائتیں ہیں مگر ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں۔

فلسطین کو بارش اور شبنم سیراب کرتے ہیں۔ اس کے درخت اور مزروعہ اراضی کو مصنوعی آب پاشی کی حاجت نہیں چنانچہ صرف نابلس ایسا مقام ہے جہاں آپ آب رواں سے یہ کام لیتے ہوئے دیکھیں گے۔ ولایات شام میں فلسطین سب سے زرخیز ہے۔ اس کا دارالحکومت اور بڑا شہر رملہ ہے لیکن بیت المقدس بھی عرض و طول میں اس کے قریب قریب پہنچتا ہے۔ فلسطین میں چھوٹا علاقہ ہونے کے باوجود قریب قریب بیس مسجدیں ہیں جن میں خطبۂ جمعہ کے لئے منبر بنے ہوئے ہیں"۔ (اصطخری، ص ۵۶ و ۵۷ ابن حوقل ۱۱۱ تا ۱۱۳۔ منقولہ از ریسی وابوالفدا)

فلسطین کے وہ شہر جنہیں عرب سپہ سالار عمرو ابن العاص نے حملے کے وقت تسخیر کیا، یہ تھے:- غزہ، سبسطیہ (سامریہ) نابلس، قیساریہ، لد، یبنی، عمواس، یافا، رفح اور بیت جبرین اس آخری شہر پر فاتح نے علاقہ محدود کر دیا اور اسے اپنے ایک مولی کے نام پر عجلون موسوم کیا (بلاذری ۱۳۸)

تیرھویں صدی میں یاقوت لکھتا ہے کہ "مصر کی طرف شام کی سب سے آخری ولایت فلسطین ہے۔ اس کا دارالحکومت یروشلم ہے۔ عسقلان، رملہ

باب اوّل

غزّہ، ارسوف، قیسریہ، نابلس، ریحا، عمان، یافہ اور بیت جبرین بڑے شہر ہیں۔ فلسطین کا بڑا حصہ پہاڑی ہے۔ مگر کہیں کہیں میدانی قطعات بھی ملتے ہیں۔ قرآن شریف میں اس ولایت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا گیا ہے:۔ "ونجیناہ ولوطًا الی الارض التی بارکنا فیھا للعالمین" (سورۂ انبیا۔ آیت ۷۰) یعنے ہم نے ابراہیمؑ اور لوطؑ کو نجات دی اس زمین کی طرف جس میں ہم نے مخلوقات کے لئے برکتیں رکھی ہیں۔ "فلسطین ابن سام ابن ارم ابن سام ابن نوحؑ کے نام پر فلسطین کہا گیا لیکن دوسرے شجرے بھی بیان کئے جاتے ہیں" (یاقوت: سوم ۔ ۹۱۳ مراصد دوم ۔ ۳۶۲)

تیہ کا ضلع بھی فلسطین میں داخل ہے۔ اس کی نسبت اصطخری لکھتا ہے کہ:۔

"تیہ بنی اسرائیل کو تقریبًا چالیس فرسخ طویل اور اسی قدر عریض بتاتے ہیں۔ اس میں بہت کچھ حصہ ریگستان، کچھ ہٹپڑ اور کہیں کہیں نخلستان اور پانی کے چشمے ملتے ہیں۔ اس کی سرحد پر ایک طرف جفارہ کا ضلع اور دوسری طرف کوہ سینا اور اس کا ضلع ہے۔ تیہ کے شمال میں بیت المقدس کی حوالی اور فلسطین کے دوسرے اقطاع ہیں۔ جنوب میں اس کی سرحد مصر کے ضلع ریف کے اِدھر اور بحر قلزم کی جانب صحرا میں ہے" (اصطخری ۔ ۵۳ ۔ ابن حوقل ۱۰۴)

مقدسی لکھتا ہے کہ "تیہ یا دشت بنی اسرائیل کی ٹھیک ٹھیک حدود کے بارے میں کلام کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل وثوق قول یہ ہے کہ شام و مصر کے درمیان کا یہ وہ ریگستانی علاقہ ہے جس کا ہر سرا دوسرے سے چالیس فرسخ کی مسافت رکھتا ہے۔ ہر جگہ ریتی کے اقطاع، نمک کی دلدلیں، اور سنگ سرخ کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں، البتہ کہیں کہیں نخلستان اور پانی کے چشمے بھی مل جاتے ہیں۔ اس ضلعے کی حدود یہ ہیں کہ ایک طرف جفار کا ضلع، دوسری طرف کوہ سینا ہے۔ مغرب میں سرحد کا خط مصری ولایت الریف سے ملا ہوا چلا گیا ہے اور اس کے مقابل میں تیہ شام تک وسیع ہے۔ اسی کے درمیان سے مکہ معظمہ کا راستہ گزرتا ہے۔" (مقدسی ۔ ۱۷۹)

باب اول

ادریسی کا بیان یہ ہے: "التیہ بحر شام و بحر قلزم کے درمیان کی سرزمین ہے۔ یہ کوئی سات منزل تک کی وسعت رکھتا ہے اور فحص التیہ (یعنی بادیہ گردی کا خطہ) موسوم ہے کہ موسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل یہیں سرگرداں پھرے تھے۔ وہ چالیس برس تک پھرتے رہے اور نہ کسی شہر میں پہنچ سکے نہ مکان میں۔ نہ اس عرصہ میں کوئی شخص لباس بدل سکا نہ کسی کے قد قامت میں بیشی معلوم ہوئی۔ اس خطہ تیہ کا طول چھ دن کی مسافت کے قریب ہوگا۔" (ادریسی - ۱۰۲۱) یاقوت نے اسی عبارت کا خلاصہ لکھدیا ہے اور کوئی نئی بات اضافہ نہیں کی (جلد اول - ۹۱۲؛ مراصد، اول ۱۲۳)

دمشقی لکھتا ہے کہ "تیہ بنی اسرائیل کے صحرائی اضلاع میں اسرائیلی آبادیاں یہ ہیں: - قدس، حویرق، الخلصہ، خلوص، السبع اور المدرہ۔ اور یہ سب تیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔" (صفحہ ۲۱۳)

الجفار کے ضلعے کو بھی اکثر فلسطین میں شمار کرتے تھے۔ اصطخری نے اس کی کیفیت یہ بیان کی ہے: - "الجفار (بمعنی گڑھے یا کوئیں) نامی ضلع وہ قطعۂ ملک ہے جو مصر کے بحرہ تنیس کی حدود سے حدود فلسطین تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ مسلسل اور خوشرنگ ریتی کی زمین ہے جس میں جا بجا نخلستان و قری اور کہیں کہیں چشمے ملتے ہیں۔ جفار کی حدود اربعہ پر بحر متوسط، دشت تیہ، فلسطین اور بحیرۂ تنیس اور وہ متصلہ اقطاع واقع ہیں جو مصر کے ریف سے قلزم کے کناروں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس ضلعے میں بالشت بالشت بھر کے افعی ایسے پائے جاتے ہیں کہ ریتی سے اچھل کر شغدف میں بیٹھے ہوئے آدمی کو کاٹ لیتے ہیں۔ مصری تاریخوں میں روایت کرتے ہیں کہ فراعنہ کے زمانے میں جفار کو ہر جگہ بستیوں سے معمور کیا گیا تھا۔" (اصطخری - ۵۲ - ابن حوقل، ۱۰۳ - یاقوت اور صاحب مراصد نے بھی اسے نقل کیا ہے -)

(۲) جند الاردن (ولایت یردن)

اس کے تحت میں غور کا ضلع، یعنی رود اردن کا کڑاڑا اور بحر لوط کا

علاقہ ہے۔ ولایت اُردُن کا صدر مقام طَبریہ (طبریاس) ہے۔ ابن الفقیہ لکھتا ہے کہ: "اس کے اضلاع میں طَبریہ، سامرہ (سامریہ یعنی نابلس)، بیسان، فحل، جرش، عکّہ، القدس اور صور شامل ہیں" (صفحہ ۱۱۶۔ نقل کردہ ادریسی ۱۲ وغیرہ)

یعقوبی کا بیان ہے کہ غور (یا اُردُن کا کڑاڑا) "ولایت دمشق کا دور دست ضلع ہے اور اس کا صدر مقام ریحا ہے" (۱۱۳)

اصطخری و ابن حوقل لکھتے ہیں کہ "غور آل لوط کا ملک اور بحیرۂ عفونت (= بحر لوط) کا علاقہ ہے۔ فلسطین کے باقی سب اقطاع اس سے بلند ہیں اور ان کا پانی بہ کر یہیں آتا ہے۔ غور بحیرۂ طبریہ سے شروع ہوتا ہے اور بیسان سے ہوتا ہوا زُغر و ریحا کے آگے بحر لوط تک پھیلا ہوا ہے۔ لفظ "غور" کے معنی دراڑ کے ہیں جو دو پہاڑوں کے بیچ میں زمین کو چیر دے۔ اس علاقے کے اندر نخلستان، چراگاہیں، چشمے اور ندیاں ہیں۔ یہاں جو برف گرتی ہے وہ منجمد حالت میں رہنے نہیں پاتی۔ بیسان تک غور، ولایت اردن میں مگر اسکے جنوب میں فلسطین کے اندر داخل ہے۔ پھر یہی عمیق وادی اور جنوب میں پھیلتی اور آخر کار ایلہ تک پہنچتی ہے" (اصطخری ۵۶ و ۵۸۔ ابن حوقل ۱۱۱ و ۱۱۳۔ نقل کردہ ابو الفدا)

ادریسی لکھتا ہے کہ "الغور میں دیار قوم لوط اور بحر منتفن شامل ہیں یعنی زغر سے بیسان و طبریہ تک کا سارا علاقہ۔ غور کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پہاڑیوں کے دو سلسلوں کے درمیان کی وادی ہے۔ شام کا تمام پانی بہہ کر یہاں آتا ہے اور جمع ہو کر ایک بڑی ندی (اُردُن) بن جاتا ہے جس کا منبع طبریہ کے قریب وہاں کی جھیل (بحیرۂ طبریہ) ہے۔

شام کی دوسری ندیاں اُردُن میں آگرتی ہیں جیسے نہر یرموک، بیسان کی ندیاں، اور وہ جو مآب کے ضلع سے، یا بیت المقدس یا روضۂ ابراہیم علیہ السلام کے پہاڑوں سے، نیز وہ جو نابلس سے بہ بہ کے آتی ہیں۔ یہ سب غور میں یکجا ہوتی اور پھر بحیرۂ زغر یا بحر لوط میں جا گرتی ہیں۔

وادی غور میں اریحا، معہ عمتا و بیسان نہایت عمدہ شہر ہیں۔ غور میں سب سے بڑی پیداوار نیل کی ہوتی ہے۔ اس کے باشندے گندمی بلکہ بعض بعض تو خاصے سیاہ فام ہوتے ہیں"۔ (ادریسی ۳)

یاقوت کہتا ہے کہ "غور بہت سے ہیں، کیونکہ اس کے معنی دراڑ کے ہوتے ہیں غور اردن یروشلم اور دمشق کے درمیان کا علاقہ ہے۔ اس کا طول تین منزل اور عرض نصف دن کی مسافت سے بھی کم ہے۔ اس میں رود اردن گزرتی ہے۔ جھیل طبریہ بالائی سرے پر اور زیرین سرے پر بحر لوط واقع ہیں۔ اس کا بڑا شہر بیسان اس کے کنارے پر آباد ہے۔ یہ بہت گرم اور نشیبی علاقہ ہے۔ یہاں سب سے زیادہ نیشکر کی کاشت کرتے ہیں[1]۔ اس کے شہروں میں عفریتوں کا شہر، اریحا بھی ہے۔ غور کے مغربی یا جنوبی سرے پر بحر متعفن اور مشرقی یا شمالی سرے پر بحیرۂ طبریہ ہے"۔ (جلد سوم، ۸۲۳ - مراصد دوم ۳۲۲)

یاقوت لکھتا ہے کہ "طبریہ، بیسان، بیت راس، جادر، صفوریہ، صور، عکہ، وغیرہ کے "کورات" (یعنی اضلاع) ولایت یردن میں داخل ہیں۔ بیسان، افیق، جرش، بیت راس، الجولان، عکہ، صور اور صفوریہ ان سب کو پہلی فتح کے وقت عرب سپاہ نے تسخیر کیا"۔ (اول - ۲۰۱)

(۳) جند دمشق

ولایت دمشق کے تحت میں شہر کے گرد کا وسیع میدان غوطہ اور جنوب کے اکثر اضلاع داخل ہیں جو غور یردن اور بحر لوط کے مشرق میں واقع ہیں۔

یعقوبی لکھتا ہے کہ "ولایت دمشق غور، حوران اور بثنیہ کے مشرقی اقطاع پر مشتمل ہے۔ ان میں بلقا، (جنوبی حصہ) غور اور الجبال سب سے بعید اضلاع ہیں۔ (صفحہ ۱۱۳)

ابن الفقیہ بیان کرتا ہے کہ "ولایت دمشق کے کورات یہ ہیں:-

[1] یہ تیرھویں صدی کا ذکر ہے۔

باب اول

اقلیم صنیر، کورہ جبیل، اضلاع بیروت، صیدا، بثنیہ، حوران، جولان۔ بلقا کا بعید ضلع اور غور کے بعض اقطاع بھی ان میں داخل ہیں۔ آگے چل کے کورہ مآب جبال الشراہ، بُصریٰ، عمان، الجابیہ، اور قریتین پھر الحولہ اور البقاع ہیں۔ دمشق کے ساحلی شہر یہ ہیں:۔ صیدا، بیروت، طرابلس، عرقہ اور صور اس آخری شہر، صور، کی مسجد دمشق کے اور خراج (مالگزاری) ولایت یردن کے متعلق ہے" (ابن الفقیہ، ۱۰۵۔ زمانۂ تحریر ۲۹۰ھ ۹۰۳ء)

ادریسی لکھتا ہے کہ "اردن کے مشرق میں ولایتِ دمشق واقع ہے۔ اس کے کورے یہ ہیں:۔ غوطہ کا میدان، حوالی دمشق میں۔ سر زمین بعلبک، البقاع، اقلیم لبنان، کورۂ جونیہ اور حولہ۔ اضلاع طرابلس، جبیل، بیروت، صیدا، بثنیہ، حوران، جولان، حوالی البلقا، کورہ جبرین غور، مآب، عمان، الشراہ، اور بُصریٰ اور جابیہ کے اطراف کی زمین"

ولایتِ دمشق کے مشرق میں صحرائے شام پھیلا ہوا ہے، جنوب میں ارض سماوہ (یعنی عرب کا صحرائے بزرگ) ارض عاد ہے اور شمال میں عواصم و قنسرین کی ولایات ہیں (ادریسی ۲۱ منقول از ابن خرداذبہ ۷۲)

الغوطہ یا الغوطہ (غین مفتوح) یعنی "باغات کی زمین" شہر دمشق کے گرد کے ضلعے کا نام ہے۔ یعقوبی کے زمانے میں، نویں صدی عیسوی کے ختم کے قریب تک، یہاں اسی قدیم غسانی نسل کے بہت سے قبیلے آباد تھے جس کے بادشاہ عربوں کی فتح سے پہلے ان ملکوں پر حکمران رہے" (صفحہ ۱۱۳)

مقدسی لکھتا ہے کہ غوطہ ایک دن کی مسافت کے برابر وسیع ہے (یعنی عرض و طول میں تقریباً ۳۰ میل) اور اس کی خوشنمائی بیان سے باہر ہے" (۱۶۰)

یاقوت جو تیرھویں صدی کا مصنف ہے، اس کا بیان یہ ہے کہ "الغوطہ کا میدان دور میں اٹھارہ میل ہے اور ہر طرف خصوصاً شمال میں اونچے اونچے پہاڑ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ بہت سی ندیاں اسے سیراب کرتی ہیں اور اس کے کھیتوں اور باغوں کو ان سے پانی دیتے ہیں۔ جو پانی بچ رہتا ہے وہ دمشق کے مشرق میں ایک جھیل اور دلدلوں میں چلا جاتا ہے۔ ہر جگہ پانی کی

باب اول

کثرت ہے - اتنا نشاط انگیز کوئی مقام نہ ہوگا - زمین کی چار جنتوں میں سے ایک جنت یہ ہے" (جلد سوم ۸۲۵ ؛ مراصد دوم - ۳۲۴)

حوران اور البثنیہ

یعقوبی ۸۹۱ء میں تحریر کرتا ہے کہ حوران کا صدر مقام بُصریٰ ہے (۱۱۳)
اصطخری اور ابن حوقل دسویں صدی میں لکھتے ہیں کہ :-
"ولایتِ دمشق کے دو بڑے ضلعے حوران اور البثنیہ ہیں - ان کی مزروعہ زمینیں بارانی ہیں - ان ضلعوں کی حدود نہرین تک جو بلقا کے ضلع میں واقع ہے اور عمان تک وسیع ہیں - اس کے متعلق تاریخ کی کتابوں میں[1] ہم لکھا دیکھتے ہیں کہ نمرا بہترین حوضوں میں ہے اور یہ حوض بُصریٰ اور عمان کے درمیان ہے -
(اصطخری، ۶۵ ؛ ابن حوقل ۱۲۴)-
ان مصنفوں کا اشارہ بے شبہ "آب نمریم" کی طرف ہے اور ممکن ہے اسے یہودیوں کے ماخذوں سے اخذ کیا ہو - کیونکہ "آب نمریم" یوشع نبی کی اور "نمرہ" تورات کی ایک اور سورت میں مذکور ہے - حوض یا تالاب کا ذکر پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ گویا وہ قدیم سے ان علاقوں میں موجود تھا - لوگ اس کے پانی کو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے بڑھ کر شیریں بتاتے تھے - یہ واضح رہے کہ ماورائے اردن ضلعے میں نمرین کا جا بجا نام آتا ہے -
یاقوت نے (تیرھویں صدی عیسوی میں) حوران کو ایک بڑا ضلع بتایا ہے جو دمشق کے جنوب میں واقع اور نہایت سرسبز ہے اور جس میں دیہات کی کثرت ہے (جلد دوم ۳۵۸ ؛ مراصد، اول - ۳۲۸)
اصطخری، یاقوت اور مقدسی وغیرہ لکھتے ہیں کہ حوران و بثنیہ سے دمشق تک

---

[1] محولہ عربی کتابوں میں "جاءنی الخبر" درج ہے جس کے معنی حدیث نبوی کے ہونگے نہ کہ تاریخ کے۔ مترجم

دو دن کی راہ ہے؛ البثنیہ کا صدر مقام اذرعہ ہے (یعقوبی، ۱۱۳)
یاقوت لکھتا ہے کہ "البثنیہ یا البثنہ دمشق کے قریب کا ضلع ہے۔ کہتے ہیں البثنہ اذرعات اور دمشق کے درمیان ایک گاؤں ہے جہاں یعقوب علیہ السلام مبعوث ہوئے" (اول - ۴۹۳؛ مراصد اول - ۱۲۶)

الجولان

یعقوبی ۸۹۱ء میں تحریر کرتا ہے کہ الجولان کا صدر مقام بانیاس ہے۔ (۱۱۴)۔
مقدسی لکھتا ہے کہ "دمشق کی اکثر اجناس کی فراہمی جولان کے ضلع سے ہوتی ہے" (۱۶۰)
"الجولان، ولایت دمشق میں حوران کا ایک ضلع ہے۔ کہتے ہیں اصل میں یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جس کا اصلی نام "حارث الجولان" تھا مگر بعض کہتے ہیں کہ نہیں "حارث" فقط سب سے اونچی چوٹی کو کہتے ہیں" (یاقوت۔ دوم، ۱۵۹؛ مراصد، اول، ۲۷۳)

الجیدور

تیرھویں صدی میں یاقوت لکھتا ہے کہ "الجیدور، ولایت دمشق کا ایک ضلع، اور حوران کے شمال میں واقع ہے۔ کہتے ہیں الجیدور و جولان دراصل ایک ہی ضلع کے دو حصے ہیں" (جلد دوم - ۱۷۳ - مراصد، اول ۲۷۷)

الحولہ

مقدسی لکھتا ہے:- "حولہ کے علاقے میں روئی اور دھان کثرت سے

پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نشیبی زمین ہے اور اس میں بہت سی ندیاں بہتی ہیں" (۱۶۰)
"الحولہ" بانیاس و صور کے درمیان واقع مگر ولایت دمشق سے متعلق ہے۔ اس میں بہت سے دیہات ہیں" (یاقوت۔ دوم - ۳۶۶؛ مراصد اول ۳۳۰)

البلقا

"البلقا ولایت دمشق کا ایک بعید ضلع ہے۔ اس کا صدر مقام عمان ہے" (یعقوبی - ۱۱۳)
یاقوت نے بیان کیا ہے کہ اس میں بہت سے دیہات ہیں اور یہاں کی گیہوں کی پیداوار مشہور ہے۔ (اول ۷۲۸؛ مراصد اول ۱۷۱)
بلقا سے یروشلم دو دن کی راہ ہے؛

الشراہ

یعقوبی لکھتا ہے کہ "الشراہ (کوہستان معاب کا علاقہ) کا صدر مقام اذرح ہے" (۱۱۴)
دسویں صدی میں اصطخری نے اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "یہ ضلع نہایت زرخیز و شاداب ہے لیکن بدوی عرب کا یہاں غلبہ ہے اور وہ سب کچھ تاراج کر ڈالتے ہیں" (۵۷ - ابن حوقل - ۱۱۳)
ادریسی کہتا ہے کہ "الشراہ بہت اچھی ولایت ہے اور اس کا صدر مقام اذرح ہے۔ شراہ اور جبال دونوں ضلع نہایت زرخیز ہیں جہاں زیتون، آلوچہ انجیر، انگور اور انار کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ باشندے زیادہ قیسی قبائل کے آباد ہیں" (صفحہ ۵)
یاقوت کے بیان کے مطابق الشراہ وہ پہاڑی علاقہ ہے جس کے درمیان

باب اول

سے دمشق کے حاجیوں کا راستہ گزرتا ہے" (سوم، ۲۷۰ - مراصد، دوم - ۱۰۰)

جبل الشراہ سے زغر (یا صُغَر) تک ایک دن کی راہ ہے - اور الشراہ کی انتہائی سرحد تک بھی ایک دن کی مسافت ہے (اصطخری و ابن حوقل) لیکن ادریسی کا بیان ہے کہ زُغر پہنچ کر پھر جبل الشراہ کی سرحد تک عبور کرنے میں دو دن صرف ہوتے ہیں؟

واضح رہے کہ بعض اوقات عرب جغرافیوں میں الشراہ کو ولایت فلسطین ہی کا جزو قرار دیا گیا ہے - (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰)

الجبال

یعقوبی لکھتا ہے کہ "الجبال ولایت دمشق کے بعید اضلاع میں ہے - اس کا صدر مقام عرندل ہے" (۱۱۴)

ادریسی کہتا ہے کہ "جبال بہت اچھی ولایت ہے - اس کے صدر مقام کو درآب کہتے ہیں" (۵)

اس آخری نام کی صحت خواندگی میں شبہ ہے - اصطخری اور ابن حوقل کے مسودوں میں اسے مختلف طور پر رواۃ، رواث اور رواد لکھا ہے (اصطخری ۵۸ - ابن حوقل، ۱۱۲)

۴ - جُند حمص

مقدسی لکھتا ہے کہ "اس کا مستقر بھی اسی نام کا حامل ہے - اس کے شہروں میں سلمیہ، تدمر (پامیرا) الخناسرہ، کفرتاب، اللاذقیہ، جبلہ، انطرسوس، بلنیاس اور حصن الخوابی داخل ہیں" (۱۵۴) ابن حوقل نے بھی قریب قریب اسی طرح یہ نام لکھے ہیں - صفحہ ۱۱۰)

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (صفحہ ۲۲) جُند حمص میں اوّل اوّل دمشق

کے شمال کا سارا علاقہ شامل تھا جسے بعد میں اسے قنسرین، عواصم اور ثغور یا قلاع سرحدی کے جنود میں تقسیم کیا گیا۔
یاقوت کے قول کے مطابق ولایت حمص کی جنوبی سرحد قارہ کے متصل جنوب سے گزرتی تھی اور شمالی حد موضع القریتیہ کے اوپر سے۔ مشرق کی طرف قریتین و پالمیرا کے موضع ولایت حمص میں داخل تھے۔ (دیکھو حصہ دوم۔ ان ناموں کی ذیل میں)

۵ - جندِ قنسرین

ہارون الرشید کے عہد کے بعد جب عواصم کا جداگانہ صوبہ بنایا گیا تو جندِ قنسرین کی حدود کے اندر بلاد قنسرین و حلب کے گرد کا علاقہ، دونوں معرے اور سرمین کی اراضی باقی رہیں۔

۶ - جندِ العواصم (یعنی جنگی قلعوں کی ولایت)

ابن الفقیہ لکھتا ہے کہ "خلیفہ عمرؓ و عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے سرحدی قلعے انطاکیہ کے گرد اور ان اضلاع میں واقع تھے، جنھیں بعد میں ہارون الرشید نے جندِ عواصم کے نام سے علیحدہ ولایت بنایا۔ ان اضلاع کے نام یہ ہیں:۔
کورہ قورس، الجمہ، منبج، انطاکیہ، تو زین، بالس اور رصافۂ ہشام کو ان کے آگے جو علاقے تھے، ان پر مسلمان تاخت کرتے تھے اور اسی طرح خود ان اضلاع پر یونانی چھاپے مارتے رہتے تھے۔ سکندریہ اور طرسوس کے درمیان کے مخزن اور قلعے یونانیوں کی ملکیت تھے" (۱۱۱)۔
خلیفہ الرشید نے جندِ عواصم کا صدر مقام منبج کو بنایا جس میں منبج، دلوک، رعبان، قورس، انطاکیہ اور تیزین (یا توزین) کے اضلاع اور ان کے درمیان کے مقامات بھی شامل تھے۔ (بلاذری ۱۳۲؛ یاقوت سوم۔ ۲۴۲)

باب اوّل

متاخرین میں ابوالفدا نے جند عواصم کا صدر مقام انطاکیہ کو بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس ولایت میں اوّل اوّل شیزر، افامیہ اور متصلہ اضلاع داخل تھے نیز قسطل کا علاقہ جو حمص و دمشق کے درمیان ہے۔ (۲۳۳)

اس سے ایک صدی پہلے یاقوت نے بلاذری کا مذکورہ بالا قول نقل کرکے یہ اور بڑھا دیا ہے کہ حلب و انطاکیہ کے مابین تمام جنگی قلعوں کا نام عواصم تھا۔ بعض لوگ حلب کو بھی اس میں داخل کرتے تھے لیکن دوسرا قول یہ تھا کہ وہ جند قنسرین میں داخل ہے۔ عواصم کا علاقہ زیادہ تر کوہستانی ہے اور المصیصہ اور طرسوس کو بھی اکثر اوقات اسی ولایت میں شمار کرتے ہیں۔ اس کا پہلا مستقر منبج تھا، بعد میں انطاکیہ کو بنایا گیا۔ (یاقوت سوم، ۷۴۲؛ مراصد دوم - ۲۸۷)

۷ - الثغور (یا سرحدی قلعے)

یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ قلعے شمالی سرحد پر شام اور یونانیوں کی مملکت کے مابین واقع ہیں۔ یہاں ان مسلمانوں کی فوج متعین رہتی تھی جو سرحا کی حفاظت کے لئے اپنی خدمات فی سبیل اللہ پیش کرتے تھے۔ جس طرح ایک گروہ یونانیون کے جہازوں میں آکر حملہ کرنے سے بچاؤ کے واسطے ساحل پر خیمہ زن رہتا تھا۔ یہ طرسوس، اذنہ (ادانہ) اور المصیصہ کے قلعے ہیں اور حلب و عواصم کے قلعوں کی بھی نوعیت یہی ہے۔ خاص سرحدی قلعے یہ ہیں: بیاس جہاں سے اسکندریہ ایک دن کی راہ ہے۔ بیاس سے مصیصہ دو دن میں پہنچے ہیں۔ عین زربہ اور اذنہ دونوں مصیصہ سے ایک منزل پر ہیں۔ اذنہ تا طرسوس، ایک منزل اور طرسوس تا جوزات دو دن کی مسافت ہے۔ طرسوس سے ساحلی شہر آلاس تک کا فاصلہ بھی یہی ہے۔ بیاس تا کنیسۃ السودا نیز ہارونیہ ایک دن سے بھی کم کا راستہ ہے۔ عراق عرب کے قلعے مرعش تک ہارونیہ سے ایک دن سے کم کی منزل ہے۔ ثغور کے مشہور شہر انطاکیہ اور بغراس

باب اول

ہیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے عہد میں اور کچھ عرصے بعد تک سرحدی قلعے انطاکیہ اور اس کی بستیوں کے شمال میں واقع تھے اور انہی کا علاقہ بعد میں عواصم کہلایا۔ اسکندریہ اور طرسوس کے درمیان بہت سے قلعے یونانیوں کے قبضے میں تھے جو اسی قسم کے تھے جیسے آجکل مسلمانوں کے پاس ہیں۔ اس ابتدائی زمانے میں مسلمانوں نے درب (یا درہ) بغراس کو بند کر دیا تھا۔ سب سے پہلے جس نے یہ کام کیا وہ خاندان عباس کا ایک شخص میسرہ ابن مسروق تھا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں، اسے حضرت ابو عبیدہؓ نے پہلی فتوحات کے وقت ادھر بھیجا۔ اور بعض لوگوں کا بیان یہ ہے کہ عمر ابن سعد الانصاری نے درہ بند کیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب خلیفہ معاویہؓ نے عموریہ پر ۲۵ھ (۶۴۶ء) میں تاخت کی تو اس وقت جاکے یہ درہ پوری طرح بند کیا جا سکا؛

"انہی خلیفہ (معاویہؓ) نے ۳۱ھ کے دوسرے غزوے میں المصیصہ کے قریب سے کوچ کیا اور درولیہ تک بڑھتے چلے گئے۔ اور واپسی میں یونانیوں کے تمام قلعوں کو جو اس مقام سے انطاکیہ تک بنے ہوئے تھے، منہدم کر دیا۔ پہلی فتح کے بعد سے طرسوس، اذنہ اور المصیصہ اور ان کے قریب کے قلعے برابر مسلمانوں کے قبضے میں رہے حتیٰ کہ ۳۴۹ھم (۹۶۰ء) میں جنگِ مغارت الکحل کے بعد جب کہ یونانی فوجوں کو سیف الدولہ پر غلبہ ہوا اور اسے حلب میں پسپا ہونا پڑا، یہ قلعے بھی یونانیوں کے ہاتھ آگئے۔ ۳۵۱ھ میں یونانی خاص حلب پر حملہ آور ہوئے۔ سیف الدولہ اور شام کے دوسرے امرائے ترک تمام اقتدار کھو بیٹھے اور فرات کے پار میافارقین میں ہٹ آئے۔ اس موقع پر یونانیوں نے المصیصہ اور طرسوس کے مورچے دوبارہ تیار کر لیے اور دوسرے قلعوں کی بھی جو اُن کے ہاتھ میں تھے تعمیر کر لی۔ یہ ۳۵۴ھم (۹۶۵ء) کا ذکر ہے اور آج تک (یعنی تیرھویں صدی عیسوی تک) طرسوس وغیرہ سب قلعے انہی کے قبضے میں ہیں اور ارمنوں کا بادشاہ لیوان کا حکمران ہے" (یاقوت اول ۹۲۷؛ مراصد، اول ۲۲۸)

دمشقی لکھتا ہے کہ ثغور کے دو حصے ہیں۔ ثغورِ شام اور ثغورِ عراق عرب۔

باب اول

ان دونوں حصوں میں جبل اللکام حد فاصل بناتا ہے، عراق عرب کے قلعے یہ ہیں:۔
ملطیہ، جسے یونانی ملتایا کہتے ہیں اور جو فرات سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کماخ، فرات کے مغرب ہیں۔ شمشاط، فرات کے مغرب میں۔ البیرہ فرات کے مشرق میں۔ حصن منصور۔ قلعۃ الروم، فرات کے مغرب میں۔ حدث الحمرا۔ مرعش، جسے پہلے حضرت خالد ابن ولید نے تعمیر کیا اور دوبارہ خلیفہ مروان بن حکم اور پھر خلیفہ المنصور نے بنایا؛
شامی قلعوں کے نام یہ ہیں:۔
طرسوس، اذنہ، المصیصہ، اور ہارونیہ جسے ہارون الرشید نے اپنے باپ کے ابتدائی عہد خلافت میں تعمیر کیا۔ نیز سیس جسے سیسہ بھی کہتے ہیں اور یہ جب ارمنوں کے ہاتھ آیا تو انھوں نے اسے اپنی مملکت (ارمینہ خوردم) کا دار الملک بنایا۔ ایاس، جسے ایاغ بھی کہتے ہیں اور جو ساحل بحر پر سیس کی بندرگاہ ہے۔" (۲۱۴)
دسویں صدی مسیحی تک شام کے فوجی اضلاع یا جُندیہ تھے۔ لیکن اسی وقت سے بلکہ بظاہر کئی سال پہلے سے یہ نظام درہم برہم ہونے لگا تھا۔ کیونکہ فوجوں کو چھاونیوں میں رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی؛
مقدسی ۹۸۵ء میں شام کو چھ اضلاع میں منقسم بتاتا ہے۔ یہ پہلے جنود سے صرف چند جزئی امور میں مختلف ہیں اور اتنا اختلاف بھی اصلی نہیں بلکہ صرف ظاہری ہے۔ دوسرے معلوم ہوتا ہے مقدسی کی فہرست کے بعض نام کاتبوں نے ادل بدل کر ڈالے ہیں۔ ان چھ اضلاع کی تفصیل یہ ہے:۔
۱۔ ضلع قنسرین۔ اس کا دار الولایت حلب ہے، اور اس کے شہروں میں انطاکیہ، بالس، السوادیہ، سمیساط، منبج، بیاس، التناہ، قنسرین، مرعش، اسکندرونہ، لجون، رفنیہ، جوسیہ، حماۃ، شیزر، وادی بطنان، معرۃ النعمان، معرۃ قنسرین داخل ہیں؛
۲۔ ضلع حمص۔ اس ضلع کے صدر مقام کا بھی یہی نام ہے۔ اس کے شہر یہ ہیں:۔ سلمیہ، تدمر، الخناصرہ، کفرتاب، اللاذقیہ، جبلہ، انطرسوس، بلنیاس، حصن الخوابی؛

باب اول

۳ - ضلع دمشق - صدر مقام کا بھی یہی نام ہے - اس علاقے کے بلاد یہ ہیں:- بانیاس، داریہ، صیدا، بیروت، طرابلس، عرقہ، ضلع بقاع جس کا بڑا شہر بعلبک ہے اور جس سے کامد، عرجموش اور الزبدانی ملحق ہیں ؛
ولایت دمشق کے جملہ چھ ضلعے ہیں - غوطہ، حوران، بثنیہ، جولان، بقاع اور حولہ ؛

۴ - ضلع الاردن - اس کا صدر مقام طبریہ ہے - شہروں میں قدس صور، عکہ، الفرادیہ، اللجون، کابول، بیسان اور اذرعہ داخل ہیں ؛

۵ - ضلع فلسطین ؛ صدر مقام الرملہ ہے - اس کے شہروں میں بیت المقدس بیت جبریل، غزہ، میماس، عسقلان، یافہ، ارسوف، قیصریہ، نابلس اریحا، اور عمان شامل ہیں ؛

۶ - ضلع الشراہ - اس کا صدر مقام ہم صغر کو قرار دے سکتے ہیں - اسکے بڑے بڑے شہر یہ ہیں :- مآب، عینونہ، معان، تبوک، اذرح، ویلہ، مدین"؛ (مقدسی - ۱۵۶)

قنسرین کے ضلعے کے حال میں جن ناموں پر ہم نے چلیپا کا نشان بنادیا ہے، یہ ایک دوسری فہرست میں ولایت حمص میں داخل کیے گئے ہیں - یہ فہرست بھی مقدسی کی تحریر کی ہوئی ہے (صفحہ ۵۴) - مگر نقشہ سامنے رکھیے تو ان دونوں فہرستوں میں سخت خلط مبحث نظر آئے گا - مثلاً رفنیہ اور جوسیہ بخوبی حمص کے ضلعے میں شامل سمجھے جا سکتے ہیں - اور الخناسرہ، اور کفر تاب جو دوسری فہرست میں حمص کو دیئے گئے ہیں، حقیقت میں سرحد سے بہت آگے شمال میں واقع ہیں ؛

مزید برآں مقدسی نے اذرعہ کو ولایت اردن میں رکھا ہے حالانکہ اسے عام طور پر ولایت دمشق کے ضلعے بثنیہ کا صدر مقام سمجھا جاتا تھا - معلوم ہوتا ہے دمشق و اردن کی ولایتوں کی حد فاصل پوری طرح معین نہ تھی اور غور اردن سے مشرق میں جو زمینیں ملی ہوئی تھیں، انھیں کبھی ایک ولایت میں شامل سمجھتے تھے کبھی دوسری میں ؛

باب اول

بارھویں صدی عیسوی میں جب مجاہدین صلیبی فلسطین پہنچے اور یروشلم میں لاطینی بادشاہی بنی اور اس کے تحت میں فوجی جاگیریں اور اقطاع قائم ہوئے، تو فوجی جنود کا یہ نظام بالکل ختم ہوگیا۔ سلطان صلاح الدینؒ اور اس کے اخلاف نے مجاہدین صلیبی کو نکال باہر کیا اور اسلامی اقتدار بحال ہوا تو گو شام و فلسطین بھی برائے نام فرماں روائے مصر کے تحت میں تھے لیکن حقیقت میں صلاح الدینؒ اور اس کے بھائیوں کی اولاد مختلف اقطاع پر قابض تھی اور ملک چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ دمشقی سنہ ۱۳۰۰ء میں لکھتا ہے کہ ترک سلطنت (یعنی خاندان صلاح الدین) کے عروج کے وقت سے شام نو مملکتوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی حدود کو معین کرنا کچھ سہل نہیں ہے کیونکہ صلاح الدین کی اولاد کے باہمی جھگڑوں اور آئے دن کی فتح و شکست نے ان "مملکتوں" کو نہایت ناپائدار بنا دیا تھا۔ تاہم ان کے نام، جیسا کہ دمشقی نے بیان کیا ہے، حسب ذیل ہیں:—

۱۔ مملکت دمشق جو رقبے میں سب سے بڑی اور نہایت مقتدر تھی کیونکہ دمشق، شام کا دارالملک تھا۔ دمشقی لکھتا ہے کہ "اس میں نوے اقالیم یا پرگنے تھے"۔ ان میں سے اکثر کے نام بھی اس نے تحریر کئے ہیں۔ مگر یہاں یہ لکھنا کافی ہوگا کہ میدان غوطہ کا پورا رقبہ اس مملکت دمشق میں شامل تھا۔ جبال لبنان مع نشیبی شام و بعلبک کے میدان کے وادی بردا اور فار ایک شارع حمص کے کنارے کنارے کا سارا شمالی علاقہ۔ اضلاع لجا، جولان، حوران و بثنیہ اور بلقا بھی اسی میں داخل تھے۔ ان کے آگے بھی ایک زمانے میں یروشلم، رملہ معہ توابع، نیز نابلس اور شمالی، وسطی اور جنوبی غور اُردن، جبرون جس میں عسقلان، قیصریہ، یافہ، عکہ، صیدا، صور و بیروت وغیرہم جیسے تمام ساحلی شہر تھے، اسی مملکت کے اندر رہے تھے"۔ (دمشقی، ۱۹۸ تا ۲۰۲)

۲۔ اس مملکت کے جنوب میں مملکت غزہ (غزہ) تھی جس کا پایۂ تخت قدیم سے غزۂ ہاشم کہلاتا تھا۔ "اس شہر میں درختوں کی ایسی کثرت ہے کہ معلوم ہوتا ہے مشجر کا تھان ریت پر پھیلا ہوا ہے۔ کبھی کبھی اسی میں عسقلان

باب اول | کو شامل سمجھتے تھے جو فرنگیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا اور پھر مسلمانوں نے فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نیز یافہ، قیصریہ، ارسوفہ، الداروم اور العریش ہے۔"

وہ شہر جو پہاڑوں اور ساحل کے درمیان آباد ہیں اور کبھی کبھی غزہ کے تحت میں آجاتے تھے، یہ ہیں:۔

تل حمار، تل الصفیہ، قرتیا، بیت جبرئیل علیہ السلام، مدینہ خلیل علیہ السلام (حبرون)، بیت المقدس۔ ان میں سے ہر ایک کا والی علیحدہ ہے۔" (دمشقی ۲۱۳)

۳۔ مملکت کرک۔ "کرک وشوبک یہ ہیں۔ معان، موتہ، اللجون الحصا، الازرق، السلط، وادی موسیٰ، سرزمین مدین، قلزم، اور الریان اسی مملکت سے متعلق تھے۔ غور میں الزرق، الازرق، الجفار، التیہ (بنی اسرائیل) عمان کے ساتھ، جس کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔ اور البلقا کا علاقہ اس مملکت میں داخل تھا۔ اقلیم الجبال بھی مملکت کرک میں تھی۔ اس کے صدر مقام الشراہ اور اس سے بارہ میل کے فاصلے پر بلدہ کاب ہیں۔" (۲۱۳)

۴۔ مملکت صفد۔ "اس کا پایۂ تخت صفد ہے۔ مرج عیون اور اللجون اس کے توابع ہیں اور اللجون میں العشر، الہوی، جنین، معہ عکہ، صور و صیدا داخل ہیں۔" (۲۱۰ تا ۲۱۲)

۵۔ مملکت طرابلس، جس میں باطینوں کے قلعے بنے ہوئے ہیں۔

۶۔ مملکت حمص جسے پہلے جند حمص کہتے تھے۔ "صدر مقام اور دار الحکومت حمص ہے۔ شام کی ترکی حکومتوں میں یہی سب سے چھوٹی ہے مگر اس کے توابع میں شمسین، شمیمس اور سلمیہ اپنے چار ضلعوں کے ساتھ داخل ہیں۔" (۲۰۲)

۷۔ مملکت حماہ "پایۂ تخت حماہ ہے اور اس کے اضلاع یہ ہیں:۔ بارین، ایک مضبوط قلعہ۔ اور سلمیہ جو صحرا کے کنارے پر ہے (یا یہ حمص کے علاقے میں داخل ہے۔" (دمشقی ۲۰۶)

۸۔ مملکت حلب۔ "پایۂ تخت حلب ہے۔ ضلع عواصم کے سوا،

مملکتِ حلب میں یہ بلاد بھی داخل ہیں:- الخناصرہ، صحرا کے کنارے پر۔ جبل بنی تعقو جسے قصرین الثانیہ کہا کرتے تھے۔ اور قنسرین جو حلب سے پہلے قدیم پایۂ تخت تھا۔ یہ حقیقت میں پرانا رومی شہر ہے اور زمانہ گذشتہ میں اس کا نام سوما تھا۔ دوسرے مقامات میں منبج لبِ فرات واقع ہے۔ اسے اکاسرۂ عجم نے آباد کیا اور منبہ نام رکھا جس کے معنی "نہایت عمدہ" کے ہیں۔ اس کے توابع میں قلعہ نجم، جسے جسر منبج بھی کہتے ہیں، داخل ہے۔ تل باشر، جس کے قریب سے رود الساجور جو عین تاب سے آتی ہے گزرتی ہے۔ قلعۃ الروم جہاں ارمنیہ کا خلیفہ اور بطریق رہتے ہیں۔ نہر الاسود نے میٹھے پانی کی جو جھیل بنا دی ہے، اس کے کنارے اور بغراس و انطاکیہ کے درمیان بغرا واقع ہے۔ ہارونیہ جسے ہارون الرشید نے بنایا اور علیٰ ہذا بہت سے دوسرے مقامات۔ مجموعی طور پر حلب میں ساٹھ ضلع داخل ہیں اور ہر ایک کے ساتھ باغ اور زمینیں ہیں" (دمشقی: ۲۰۲ — ۲۰۶)

۹۔ مملکتِ روم۔ "حلب کے شمال میں جو ملک ہے اس میں تاتاری ارمن، اور یونانی حکمراں ہیں۔ حقیقت میں یہ ٹکڑا شام سے علیحدہ ہے اور مملکتِ روم کہلاتا ہے" (ایضاً - ۱۹۲)۔

مثیر کا مصنف اپنے زمانۂ تصنیف یعنی ۱۳۵۱ء میں شام کی ملکی تقسیم کا حسب ذیل حال لکھتا ہے۔ سیوطی اور دوسرے مصنفین نے بھی اسی کو لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے:-

"شام کا پہلا شہر بالس اور آخری العریش (مصر میں) ہے۔ شام پانچ اقطاع میں منقسم ہے اور ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) فلسطین، جس کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) الرملہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔ یہ مقدس مقام داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دار الخلافت تھا۔ علاقے کے دوسرے شہر عسقلان، حبرون، سبسطیہ اور نابلس ہیں۔

(۲) حوران، جس کا صدر مقام طبریاس ہے۔ اسی کا اور اس کی جھیل کا یاجوج ماجوج کے متعلق احادیث میں ذکر آتا ہے۔ کہتے ہیں نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم

کی ولادت کے وقت جھیل کا پانی باہر ابل آیا تھا۔ اس کے علاقے میں غور، یرموک اور بیسان کے اقطاع شامل ہیں۔ اور بیسان وہ مقام ہے جہاں کی کھجوروں کے متعلق دجال مسیح سوال کرے گا۔ الاردن جسے اکثر الشریعہ کہتے ہیں، اسی ولایت میں داخل ہے۔

۳۔ الغوطہ۔ اس کا پایۂ تخت دمشق ہے۔ طرابلس اس کے ساحل پر واقع ہے۔

۴۔ حمص۔ اس ولایت اور وہاں کے صدر مقام کا نام ہے۔ اس کے توابع میں شہر سلمیہ ہے۔

۵۔ قنسرین۔ اس کا بڑا شہر حلب ہے اور توابع میں سرمین و انطاکیہ داخل ہیں۔ (شیر اول۔ منقولہ سیوطی۔ رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی۔ جلد نوزدہم۔ ۲۹۶)

پندرھویں صدی کے آغاز میں ملک شام کو مصر کے مملوک سلاطین سے استنبول کے ترکان عثمانی نے چھین لیا۔ یعنی حلب کے شمالی میدانوں میں ایک زبردست لڑائی ہوئی (۱۵۱۶ء) جس میں مملوکوں نے سلطان سلیم سے شکست کھائی اور شام ترکی سلطنت کا صوبہ بن گیا۔

خراج و محاصل

شام کی مالگزاری یا اضلاع شام کی مالگزاری کے متعلق کئی بیانات ہم تک پہنچے ہیں جو حروب صلیبیہ سے قبل بالکل قریب زمانے کی تحریریں ہیں جب کہ یہ ملک اسلامی سلطنت کا لاینفک جزو تھا۔ رقوم کو درہم و دینار میں بتایا گیا ہے اور یہ چاندی سونے کے وہ مسلم العیار سکے تھے، جنھیں ۷۶ھ (۶۹۵ء) کے قریب اموی خلیفہ عبدالملک نے رائج کیا۔ عربوں نے دینار و درہم کا نام دناریوس اور دراکمہ سے بنایا تھا اور دناریوس رومیوں میں وہ چاندی کا سکہ تھا جسے یونانی دراکمہ کہا کرتے تھے۔ لیکن عربوں میں منتقل ہوتے وقت دناریوس یا دینار طلائی سکے کا نام ہو گیا جس کی نویں اور دسویں صدی عیسوی میں دس شلنگ کے قریب قیمت ہوتی تھی۔ وزن

۹۰ ½ گرین سے کچھ ہی زیادہ سمجھنا چاہیئے؛ درآنکہ یا درہم مسلمانوں کے ہاں چاندی کے سکے کا نام رہا اور مذکورۂ بالا زمانے میں پندرہ درہم کا ایک طلائی دینار ہوتا تھا۔ درہم کا وزن کوئی ½ ۴۷ گرین تھا اور اس قدیم زمانے میں سونے اور چاندی کی قیمت میں جو نسبت تھی اس کے لحاظ سے، وہ کوئی آٹھ آنے قیمت کا ہوا؛

لیکن آیندہ فہرستوں میں جو رقوم درج ہیں ان کا زمانہ حال کی قیمتوں میں صحیح اندازہ کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی میں نئی دنیا کے دریافت ہونے کے بعد سے چاندی سونے کی قوت خرید میں جو کمی آگئی ہے، اس کو ملحوظ رکھا جائے؛ اس دریافت سے قبل، عام اندازہ یہ ہے کہ ایک اونس سونے میں اتنی جنس یا محنت لی جا سکتی تھی، جس کے لیے آج کل تین اونس درکار ہوں گے۔ اسی لیے طلائی دینار اگرچہ قریب قریب دس شلنگ کے مساوی ہوگا، لیکن یہ دس شلنگ زمانۂ حال کے تیس شلنگ سے کم قوت خرید نہ رکھتے تھے۔۔ اسی طرح چاندی کے سکے، درہم کا تخمینہ لگانا پڑے گا اور زمانۂ حال میں چاندی کی قیمت میں جس قدر کمی آگئی ہے اسے بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ مقدسی کے وقت میں ایک اونس سونے کی بارہ اونس چاندی آتی تھی۔ حالانکہ آج کل (یعنی ۱۸۸۹ء میں) ایک اونس سونے کی تقریباً سوا بائیس اونس آئے گی۔ اس طرح گو درہم بذاتہ آٹھ آنے (۸ پینی) کے قریب قریب معادل ہے لیکن آج کل، طلائی دینار کے پندرھویں حصے کی حیثیت سے ہی ایک درہم صرف تہائی درہم کا مال خرید سکے گا۔ چاندی کی قیمت بہت کچھ گھٹ گئی ہے اور درہم کے ہموزن چاندی کی قوت خرید بھی تقریباً نصف رہ گئی ہے۔ غرض زمانہ حال کے سکے میں درہم کو ہم ایک شلنگ سے کچھ اوپر قیمت کا سکہ شمار کر سکتے ہیں ۔؛

(۱) اسلامی سلطنت کے مداخل کا تفصیلی بیان سب سے اول ابن خلدون کی تاریخ عالم کے مقدمے میں ملتا ہے۔ اور یہ کتاب چودھویں صدی عیسوی میں تحریر ہوئی تھی؛ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اس نے یہ احوال ایک اور کتاب جیراۃ الدولہ سے نقل کیا ہے اور اس میں خلیفہ المامون کے عہد میں جو خراج وصول ہوتا تھا، اس کی تفصیل درج ہے۔ لیکن اندرونی شہادتوں سے یقینی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

باب اول

یہ بیان دراصل المامون کے عہد سے نصف صدی قبل کے متعلق ہے۔ یعنی اسکے دادا المہدی کی خلافت کے اعداد بتاتا ہے جو ۱۵۸ھ سے ۱۶۹ھ کے درمیان یا تقریباً سنہ ۷۸۰ء کا زمانہ ہوا۔ اصل عبارت ابن خلدون کے قاہرہ کے چھپے ہوئے نسخے (جلد اول) کے صفحے ۱۸۰ میں ملیگی۔ ہم نے قوسین میں جو اعداد دئے ہیں، یہ دوسرے قلمی نسخوں سے ڈی سلین نے جمع کئے اور مقدمۂ تاریخ کے ترجمے میں تحریر ہیں۔ (جلد اول۔ ۳۶۴):-

دینار

ولایتِ قنسرین .... چار لاکھ (چار لاکھ بیس ہزار)
مع ایک ہزار بیپا رہ روغن زیتون کو

ولایتِ حمص .... نامعلوم

ولایتِ دمشق .... چار لاکھ بیس ہزار

ولایتِ اُردن .... ستانوے ہزار (چھیانوے ہزار)

ولایتِ فلسطین .... تین لاکھ دس ہزار، مع تین لاکھ رطل روغن زیتون

(رطل سے شامی ادھ سیری مراد ہے)

میزان .... بارہ لاکھ ستائیس ہزار (یا بارہ لاکھ چھیالیس ہزار)

دینار معادل چھ لاکھ بیس ہزار پونڈ انگریزی بالاصل و تقریباً بیس لاکھ پونڈ رائج الوقت کے

۲۔ ہارون الرشید کے عہد حکومت میں (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) یعنی ۸۰۰ء کے قریب وزیر سلطنت یحیٰ برمکی کے واسطے اسلامی سلطنت کی مالگزاری کی اجمالی فہرست مرتب کی گئی تھی۔ یہ الجہشیاری کی کتاب الوزرا میں محفوظ ہے اور وی آنا کی ساتویں "موتمر مستشرقین" کے جلسے میں وان کریمر نے اسے پیش کیا اور بعض حصے موتمر کی رُوداد میں شائع بھی کر دئے تھے (Verh and lungen, Semitische Section F. Wier, 1888)

اس کتاب کے بیان کے مطابق اس اقبالمند فرمانروا کے خزانے میں حسب ذیل رقوم (جو اکثر صورتوں میں ابن خلدون کی فہرست کے بالکل مطابق ہیں) وصول ہوتی تھیں:-

باب اول

	دینار
قنسرین والعواصم	چار لاکھ ستر ہزار
ولایت حمص	تین لاکھ بیس ہزار، مع ایک ہزار شتروار کشمش [1]
ولایتِ دمشق	چار لاکھ بیس ہزار
ولایتِ اُردن	چھیانوے ہزار
ولایتِ فلسطین	تین لاکھ دس ہزار

ان کے سوا تمام شامی جنود سے جملہ تین لاکھ رطل (= شامی ادھ سیری) کشمش ۔

میزان = سولہ لاکھ سولہ ہزار دینار۔ معادل آٹھ لاکھ آٹھ ہزار پونڈ انگریزی مساوی تقریباً پچیس لاکھ پونڈ رائج الوقت ۔

۳ ۔ مالگزاری کے متعلق دوسرا بیان مذکورۂ بالا سے نصف صدی بعد معرضِ تحریر میں آیا۔ اسے قدامہ نے اپنی کتاب الخراج" میں جو ۸۸۰ء کے قریب لکھی تھی، نقل کیا ہے۔ اور اپنا ماخذان سرکاری فہرستوں کو ظاہر کیا ہے جو ۲۰۴ھ (= ۸۲۰ء) میں قلمبند ہوئی تھیں۔ اس میں رقوم دینار اور ان کے معادل درہم، دونوں سکوں میں درج ہیں ۔ قدامہ کے اقتباسات ڈی سلین کے مضمون مطبوعہ "ژورنل ایشیاٹیک" بابتہ ۱۸۶۲ء میں ملیں گے جس سے ذیل کے اعداد نقل کئے جاتے ہیں:۔

	دینار	درہم
ولایتین قنسرین وعواصم	۳/۶۰/۰۰۰	۵۴/۰۰/۰۰۰
ولایتِ حمص	۱/۱۸/۰۰۰	۱۷/۱۷/۰۰۰
ولایت دمشق	۱/۲۰/۰۰۰	۱۸/۰۰/۰۰۰
ولایت اُردن	۱/۰۹/۰۰۰	۱۶/۳۵/۰۰۰
ولایت فلسطین	۱/۹۵/۰۰۰	۲۹/۲۵/۰۰۰

[1] "الزبیب" کا لفظ ہے جو بہت ممکن ہے کہ "الزیت" (روغن زیتون) کی تحریف کتابت ہو۔

یہ کل میزان نو لاکھ دو ہزار دینار ہوئی، جو وزن کے اعتبار سے چار لاکھ ۱۵ ہزار کے اور قوتِ خرید کے اعتبار سے قریب قریب پندرہ لاکھ پونڈ انگریزی رائج الوقت کے مساوی ہوتے ہیں۔

۴ - ابن خردادبہ اپنی کتاب "مسالک والممالک" میں حسب ذیل رقوم تحریر کرتا ہے - اس کی اصل عبارت باربیئر دینارگے اقتباسات کے ساتھ (صفحہ ۷۱ و ۷۳) "ژورنل ایشیاٹک" بابتہ ۱۸۶۵ء میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں - ابن خردادبہ نے جو حساب دیا ہے وہ بجنسہ ابن الفقیہ کی رقوم کے مطابق ہے جس نے ۹۰۳ء میں اپنی کتاب تصنیف کی تھی (ابن الفقیہ، صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۵ و ۱۱۰ و ۱۱۱ و ۱۱۶) ابن خردادبہ کا ماخذ وہ سرکاری فہرستیں ہیں جو تالیف کتاب سے متصل سنین ماقبل میں مرتب ہوئی تھیں یعنی تقریباً ۸۶۴ء میں:-

	دینار	یا	درہم
قنسرین اور عواصم	۴/۰۰/۰۰۰		۶۰/۰۰/۰۰۰
ولایتِ حمص	۳/۴۰/۰۰۰		۵۱/۰۰/۰۰۰
ولایتِ دمشق	۴/۰۰/۰۰۰		۶۰/۰۰/۰۰۰
ولایتِ اردن	۳/۵۰/۰۰۰		۳۲/۵۰/۰۰۰
ولایتِ فلسطین	۵/۰۰/۰۰۰		۷۵/۰۰/۰۰۰

میزان انیس لاکھ نوے ہزار دینار، تقریباً دس لاکھ پونڈ کے برابر ہوئی لیکن سکہ رائج الوقت میں تیس لاکھ کے ہم قیمت ہوگی۔

۵ - ان رقوم کے ساتھ ابن خردادبہ، الاصفہانی کی سند سے جو نویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کا آدمی ہے، ذیل کی فہرست بھی نقل کرتا ہے:-

	دینار
ولایتِ حمص	۳/۴۰/۰۰۰ (کے اندر)
ولایتِ دمشق	۳/۴۰/۰۰۰ (" ")
ولایتِ اردن	۱/۷۵/۰۰۰ (" ")
ولایتِ فلسطین	۳/۷۵/۰۰۰ (" ")

یہ کل میزان صرف چھ لاکھ ستر ہزار دینار معادل تین لاکھ ۳۵ ہزار پونڈ ہوتی ہے جو رائج الوقت سکے میں تقریباً دس لاکھ پونڈ کے برابر ہوں گے۔

۶۔ یعقوبی، جس نے ۲۷۸ھ/۸۹۱ء میں اپنا جغرافیہ مرتب کیا اس کی فہرست یہ ہے:-

	دینار
ولایتِ حمص (بلا شمول مزرعات سرکاری)	۲/۲۰/۰۰۰
ولایتِ دمشق (بشمول مزرعات سرکاری)	۳/۰۰/۰۰۰
ولایتِ اُردن (بلا ״ ״ ״)	۱/۰۰/۰۰۰
ولایتِ فلسطین (بشمول ״ ״)	۳/۰۰/۰۰۰

میزان ۹ لاکھ ۲۰ ہزار دینار معادل ۴ لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ جو سکۂ رائج الوقت میں پندرہ لاکھ پونڈ کے مساوی یا کچھ کم ہوگا۔ (صفحہ ۱۱۲ - ۱۱۵ تا ۱۱۷)

۷۔ ابن حوقل کی روایت کے مطابق (صفحہ ۱۲۸) ۲۹۶ھ/۹۰۹ء اور ۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں شام کی آمدنی، عمال کی تنخواہ نکال دینے کے بعد تین کروڑ نوے لاکھ درہم ہوتا تھا۔ یہ وزن میں تیرہ لاکھ اور سکہ رائج الوقت کی قوت خرید کے حساب سے تقریباً چالیس لاکھ پونڈ کے برابر ہوا۔

۸۔ مقدسی نے ابن الفقیہ اور ابن خرداذبہ کی رقوم نقل کردی ہیں لیکن خود اپنے زمانے (۳۷۵ھ/۹۸۵ء) کا حساب یہ بتایا ہے:-

	دینار
قنسرین و عواصم	۳/۶۰/۰۰۰
ولایتِ دمشق	۴/۰۰/۰۰۰
اُردن	۱/۷۰/۰۰۰
فلسطین	۲/۵۹/۰۰۰

میزان ۱۱ لاکھ ۹۰ ہزار دینار معادل تقریباً ۶ لاکھ پونڈ یعنی سکہ رائج الوقت میں ۱۸ لاکھ پونڈ۔

مقدسی کے بعد ظاہرا کوئی تحریر شام کے مالئے کے بارے میں نہیں ملتی۔

ایک صدی بعد صلیبی مجاہدین پہنچتے ہیں اور پھر ایک صدی کے بعد جب ملک دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں آتا ہے تو بھی یہ کہیں لکھا نہیں ملتا کہ صلاح الدین اور اس کے مصری جانشین شام سے کس قدر روپیہ وصول کرتے تھے۔

مذکورۂ بالا فقرات میں ولایات شام کی جو مجموعی آمدنی مختلف زمانوں میں دکھائی گئی ہے، اس کی اجمالی فہرست حسب ذیل ہے:-

	دینار	= پونڈ[1]
۱- سالانہ مالیہ سنہ ۷۸۰ء کے قریب زمانے کا	۱۲،۲۷،۰۰۰	۶،۲۰،۰۰۰
۲- " " سنہ ۸۰۰ء کے قریب، ہارون الرشید کے زمانے کا	۱۶،۱۶،۰۰۰	۸،۰۸،۰۰۰
۳- " " سنہ ۸۲۰ء کا	۹،۰۲،۰۰۰	۴،۵۱،۰۰۰
۴- " " سنہ ۸۶۴ء کے قریب زمانے کا	۱۹،۹۰،۰۰۰	۹،۹۵،۰۰۰
۵- " " نویں صدی کے اوائل میں	۶،۷۰،۰۰۰	۳،۳۵،۰۰۰
۶- " " سنہ ۸۹۱ء	۹،۲۰،۰۰۰	۴،۶۰،۰۰۰
۷- " " سنہ ۹۰۰ء و سنہ ۹۱۵ء میں		
(تین کروڑ نوے لاکھ درہم =)	۲۶،۰۰،۰۰۰	۱۳،۰۰،۰۰۰
۸- " " سنہ ۹۸۵ء کا-	۱۱،۸۹،۰۰۰	۵،۹۴،۵۰۰

شام کے اوزان اور پیمانے

عربی اوزان اور پیمانوں کے اکثر نام یونانی یا لاطینی سے لیے گئے ہیں کیونکہ فتوحاتِ عرب کے وقت سلطنت بائی زنطہ کی شامی ولایات میں انہی کا رواج تھا۔ چنانچہ عرب مدّی رومیوں کے غلہ تولنے کا وزن ہے جسے وہ "موڈیوس" کہتے تھے اور عام طور پر آج کل بشَل ترجمہ کرتے ہیں۔ اوقیہ یونانی "ورم اکیہ" یا اونس ہے اور رطل جسے کسرِ اوّل اور ضمۂ اول کے ساتھ بھی بولتے تھے "ل" اور "ر" کے تبادلے سے یونانی لفظ "لِتلا" ہے۔ عربی لفظ قیراط جسے انگریزوں نے عربوں سے لے کے "کیرٹ" لکھنا شروع کیا، دراصل یونانی لفظ "کیراتیوس" کی

[1] یعنی باعتبارِ وزن کے۔ سکہ رائج الوقت میں اس کی قوت خرید معلوم کرنے کے لیے اسے سہ گنا کر لینا چاہیے۔

باب اول

بگڑی ہوئی عربی صورت تھا۔ جس کے معنی "کیراتیا" یا خرنوب کے پھل کے ہیں ؏

کفیز، ویبہ، صاع، قیلجہ اور حبّ (یا رتی بھر وزن) یہ سب نام عربی الاصل ہیں۔ قبّ مادّے کے اعتبار سے عبرانی لفظ "کیب"، جیسا ہے اور ایک اور ایک تہائی کوارٹ کے ہم وزن ہوتا تھا۔ یونانی میں بھی ایک لفظ "کابوس" ملتا ہے جو غلّہ تولنے کا وزن تھا اور کہتے ہیں کہ یونانیوں نے بھی یہ لفظ مشرق سے لیا ؏

مکوک کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ ایرانیوں سے لیا گیا جن کے ہاں شاہی ساغر کو جو کشتی نما ہوتا تھا اس نام سے یاد کرتے تھے۔ اور آج بھی ایران میں پارچہ بافی کی نال کو جو کشتی نما شکل کی ہوتی ہے، اسی نام سے یاد کرتے ہیں ؏

دانک بھی ایرانی لفظ ہے اور درہم یا دینار کا چھٹا حصّہ ہوتا تھا۔ خود ایرانی زبان میں اس کا مفہوم "ایک رتی" سمجھا جاتا تھا ؏

عربوں کے گنجایش وزن کے پیمانوں کی اصل صاع کو سمجھنا چاہیئے جو عہد رسالت[1] میں غلہ تولنے کا پیمانہ تھا اور از روئے قاعدہ "آدمی کے متوسط ہاتھوں کی چار لپ مقدار غلّہ" کے مساوی قرار دیا گیا تھا۔ سرسری طور پر اسے پانچ پنٹ سے کچھ زیادہ سمجھنا چاہیئے اور اسی تخمینے پر ہم نے انگریزی اوزان کے دوسرے پیمانوں کا حساب لگایا ہے۔ قسط نصف صاع کے برابر ہوتا تھا اور یہ نام یونانی وزن قسطوس سے لیا گیا ہے جو رومیوں کے سکستاریوس کا مرادف تھا ؏

رہا عام اوزان کا نظام، تو اس کی بنیاد چاندی کے درہم کے وزن پر ہے جو تقریباً ½ ۴۷ انگریزی گرین کے برابر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رطل یا ایک پونڈ، نہ صرف تولنے کا پیمانہ نہ تھا بلکہ اس کے ذریعہ ناپ کر بھی وزن کا اندازہ کرتے تھے۔ اصل میں رومیوں کی طرح عربوں کا بھی طریقہ

---

[1] ملاحظہ ہو لین کی عربی لغت۔ لفظ "صاع"

یہی تھا کہ مکعب پیمانوں کا تیل یا شراب کی مقررہ مقدار سے اندازہ کرتے تھے۔ چنانچہ قفیز کی دوگانہ نوعیت بھی اسی قسم کی تھی کہ وہ صرف غلہ ناپنے کا پیمانہ نہ تھا بلکہ اتنی زمین کا ناپ بھی ہو گیا تھا جتنی میں اس مقدار کے غلے سے تخم ریزی کیجا سکے اور اس لحاظ سے جریب کا جو مزروعہ اراضی کا رقبہ ناپنے کا عام پیمانہ تھی، یہ دسواں حصہ سمجھا جاتا تھا؎

طول ناپنے کا بنیادی پیمانہ ذرع، ذرعہ یا ہاتھ تھا لیکن اس میں مختلف زمانوں میں اختلاف ہوتے رہے۔ "شاہی ہاتھ" (ذرعۂ ملکی) دسویں صدی عیسوی میں ۱۸ انچ کے برابر ہوتا تھا لیکن چار پانچ صدی کے بعد کاریگروں کا ذرعہ ۲۷ انچ کے قریب طولانی ہو گیا؎

ایرانی سیاح ناصر خسرو جس کے بتائے ہوئے طول و عرض آثار قدیمہ کی تحقیقاتوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، دو ایرانی پیمانے، یعنی گز اور ارش کا استعمال کرتا ہے۔ ارش کو اس نے عربی ذرعہ یا ہاتھ کا مساوی بتایا ہے۔ گز عام طور پر ہاتھ سے زیادہ بڑا مانا جاتا ہے اور لغت کی کتابوں میں اسے قریب قریب انگریزی یارڈ کا مرادف لکھا ہے۔ لیکن ناصر خسرو کی عبارتوں کا جن میں یہ لفظ آئے ہیں، احتیاط سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس نے دونوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال کئے ہیں[1] اور گز و ارش دونوں کو ہم انگریزی دو فٹ سے کچھ کم کا پیمانہ سمجھ سکتے ہیں؎

عربی میل (یا مائل) براہ راست بائی زنطہ والوں سے لیا گیا ہے۔ اسمیں چار ہزار ذرعہ یا ہاتھ ہوتے تھے اور اس حساب سے دو ہزار گز سے بھی زیادہ کا ہوا۔ سرسری طور پر اسے ایک جغرافی میل یا ناٹ کہہ سکتے ہیں۔ عموماً تین عربی میل کا ایک فرسخ ہوتا تھا جو عربوں نے ایرانیوں سے لیا اور ایرانی اسے فرسنگ لکھتے تھے جو دراصل یونانی کا "پاراساگاس" تھا؎

ملک شام میں، سلطنت اسلامی کے دوسرے ملکوں کی طرح ڈاک کی سڑکوں

---

[1] دیکھو باب سوم۔ جہاں ناصر خسرو کے قبۃ الصخریٰ کا بیان نقل کیا ہے؎

کا جال سا بنا ہوا تھا اور جا بجا برید خانے تھے جن میں سرکاری خرچ سے سوار متعین رہتے تھے۔ ڈاک کی منزل کو عرب البرید کہتے تھے۔ یہ آئین بہت قدیم زمانے کا ہے اور عربوں کا لفظ غالبًا لاطینی لفظ "وریدوس" (بمعنی ڈاک کا گھوڑا) کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ منزل کا فاصلہ قدرتی طور پر سرزمین کی نوعیت کے مطابق مختلف ہوتا تھا۔

مقدسی نے اپنے زمانے یعنی دسویں صدی کے اواخر میں شام کے مکائیل و اوزان کے متعلق حسب ذیل معلومات فراہم کی ہے:۔

"مکائیل۔ فلسطین کے صدر مقام الرملہ کے لوگ قفیز، ویبہ، مکوک، اور کیلجہ سے کام لیتے ہیں۔ ایک کیلجہ (یا گیلن) میں تقریبًا $\frac{1}{2}$ اصاع ہوتے ہیں۔ مکوک تین کیلجہ کے مساوی ہوتا ہے۔

ویبہ دو مکوک (یعنی ۶ گیلن) کے برابر ہے۔ ایک قفیز مساوی ہے چار ویبہ (= ۳ بشل)

بیت المقدس کے لوگ مدی سے کام لینے کے عادی ہیں جو ایک قفیز کے دو ثلث (یعنی ۲ بشل) کے برابر ہوتا ہے۔ اور قب سے جو مدی کا ایک ربع ہوتا ہے۔ مکوک کو سوائے سرکاری پیمانوں کے عام طور پر بالکل استعمال نہیں کیا جاتا۔

عمان میں مدی کا وزن ۶ کیلجہ (= $\frac{3}{4}$ بشل) کے برابر اور قفیز بھی نصف کیلجہ (= ایک گیلن) کے مساوی ہوتی ہے۔ اسی مکیال سے وہ اپنے زیتون اور چھوارے فروخت کرتے ہیں۔

صور میں قفیز، یروشلم کی مدی کے شل اور کیلجہ وہاں کے صاع کے مساوی ہوتا ہے۔

دمشق میں غرارہ ڈیڑھ قفیز کے برابر ہے (جو $4\frac{1}{2}$ بشل کے ہموزن ہوا)

اوزان۔ ملک شام کے اندر حمص سے لیکر فلسطین و مصر کے درمیان کے اقطاع تک جنہیں جفار کہتے ہیں، رطل کا وزن بالاوسط چھ سو درہم ہے مگر بعض جگہ کم زیادہ بھی ہوتا ہے۔ ان میں سب سے وزنی عکّے کا اور سب سے ہلکا دمشق

باب اول

کا رطل ہوتا ہے ؎

اوقیہ (= اونس) میں چالیس سے کچھ اوپر، پچاس درہم تک وزن ہوتا ہے اور ہر رطل بارہ اوقیہ (یا اونس) کے مساوی ہے (گویا ۶ پونڈ وزن میں ہوا) بجز قنسرین کے جہاں کا رطل اس کا دو تہائی (یعنی صرف ۴ پونڈ) وزن کا ہوتا ہے ؎

سکہ کا مسلمہ وزن شام میں ہر جگہ قریب قریب یکساں ہے اور ایک درہم، ۶۰ حبّ (رتی) کے مساوی اور حبّ سے ایک جو کا دانہ مراد لیتے ہیں ؎

دانگ میں درہم کا ایک سدس یعنے دس حب وزن ہوتا ہے ؎

دینار میں ۲۴ قیراط ہوتے ہیں۔ ہر قیراط ۳ ½ حبات کے برابر ہے (انگریزی حساب سے ایک دانہ جو تقریباً ⅔ گرین کے برابر ہوتا ہے)

ڈاک چوکیوں (= برید) کا باہمی فاصلہ شام میں بالعموم چھ میل ہوتا ہے ؎

(مقدسی: ۱۸۱ - ۱۸۲)

ناصر خسرو (۱۰۴۷ء) بیان کرتا ہے کہ حلب کے بازاروں میں ظاہری رطل کا رواج تھا جو ۴۸۰ درہم وزن کا ہوا۔ (صفحہ ۲) یہ رطل مصر کے فاطمی خلیفہ ظاہر لاعزاز دین اللہ کے نام سے موسوم تھا اور اس حساب سے ہمارے تقریباً ۳ ½ پونڈ کے برابر ہوا ؎

باب دوم

شام و فلسطین

(بقیہ باب گزشتہ)

دریا: اُردن اور اس کے معاون - ساحلی ندیاں - دمشق کے دریا اُردن قس (= المقلوب) - شمالی ولایات کی ندیاں ؛

جھیلیں: بحر لوط - بحر طبریہ - الحولہ - دمشق کی جھیلیں - حمص و افامیہ کی جھیل انطاکیہ کی جھیلیں ؛

پہاڑ: سینا - کوہ ہارون - کوہ "زیتون" - فلسطین کا سلسلۂ جبال کوہ طور - جبل عاملہ - جولان کی پہاڑیاں - کوہستان لبنان - دمشق کے گرد کے پہاڑ - ہرمون - جبل اللکام ؛

دریا

نہر الاردن - جوردان یا یردن کو عربی تاریخوں میں بلا اختلاف الاردن موسوم کیا ہے اور یہ نام، عبرانی ہا - یردن کے مترادف ہے (جو قریب قریب ہمیشہ "ہا" کی علامت معرفہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے) اور اس کے معنی "اترنے والے" کے ہیں ؛

باب دوم

اسی ندی نے جنگی ولایت یا جند کو بھی الاُردن موسوم کرایا۔ لیکن حروب صلیبی کے بعد سے اُردن کو عربی تاریخیں الشریعہ (یعنی آب گاہ) کے نام سے یاد کرنے لگتی ہیں اور آج تک وہاں کے بدّوؤں میں ندی کا یہی نام ہے۔

نہرالاُردن کی نسبت مقدسی لکھتا ہے کہ یہ "بانیاس کے اوپر سے نکلتی اور اترنے میں قدس کے مقابل ایک جھیل (جسے بحیرۂ حولہ کہتے ہیں) بن جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ پھر طبریہ تک اترتی ہے جہاں اس کا پانی پھیل کر طبریہ نام کی دوسری جھیل بنا دیتا ہے پھر وہ آگے بڑھ کر وادی غور میں اتر آئی ہے اور اس ہمہ گیر جھیل میں جا گری ہے (جس سے بحر لوط مراد ہے) مگر یہ ندی کشتی رانی کے قابل نہیں ہے۔ مقدسی نے اُردن کے اوپر کے اس پل کا بھی ذکر کیا ہے جو بحیرۂ طبریاس کے زیریں کنارے کے جنوب میں تھا اور جس کے پار دمشق کی سڑک شروع ہوتی ہے۔ آج کل اسے جسر المجامع کہتے ہیں۔" (مقدسی ۱۸۴ و ۱۶۱)

یاقوت نے احمد ابن الطیب السرخسی (متوفی ۸۹۹ء) کا قول نقل کیا ہے کہ اُردن کے دو حصے ہیں۔ طبریہ کے اوپر بڑے حصے کو اُردن الکبیر کہتے ہیں اور اُردن الصغیر وہ ہے جو بحر جلیل کے نیچے بہتا ہے۔ "غور کے سارے علاقے کو جہاں بیسان، قراوا، ریحا اور العوجا کے گرد نیشکر کی کاشت ہوتی ہے، یہی ندی (اُردن) سیراب کرتی ہے۔" اسی سلسلے میں یاقوت نے بحیرۂ طبریہ کے نیچے کے پل کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ "بہت اچھا بنا ہوا ہے اور اس میں بیس سے زیادہ محرابیں ہیں۔ نہر یرموک (Hieromax) ولایت بثنیہ سے آکے اسی جگہ کے قریب اردن میں ملی ہے۔" (جلد اوّل۔ ۲۰۰)

ابوالفدا ۱۳۲۱ء میں لکھتا ہے کہ "نہرالاُردن غور کا وہ دریا ہے جسے الشریعہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا منبع وہ چشمے ہیں جو جبل الثلج کے نیچے بہہ کر بحیرۂ بانیاس (حولہ) میں آگرے ہیں۔ اس جھیل سے شریعہ نکلتی ہے اور آگے بڑھ کے بحیرۂ طبریاس میں گری ہے وہاں سے وہ پھر جنوب کی طرف بہتی ہے اور اسی جھیل سے آگے بڑھنے کے بعد اس جھیل اور القصیر کے درمیان رود یرموک اس میں آملی ہے۔ پھر شریعہ جو مذکورۂ بالا نہر اُردن ہی کا دوسرا نام ہے، غور کے وسط سے جانب جنوب بہتی

ہوئی بیسان کے پاس گزرتی ہے پھر اور آگے جنوب میں ریحا سے گزری ہے۔ اس کے آگے بھی بہاؤ جنوب ہی کی طرف ہے تاآنکہ وہ بحیرۂ منتن میں گرجاتی ہے جس سے بحیرۂ زُغر (یا بحر لوط) مُراد ہے" (ابوالفدا، ۴۸)

دمشقی لکھتا ہے کہ "نہر الاردن یا شریعہ کثیر پانی کا دریا ہے۔ یہ بانیاس سے نکلتا اور حولہ کے ضلع تک جنوب کی طرف بہتا ہے جہاں اس نے بحیرۂ قدس بنا دیا ہے۔ اس جھیل کی وجہ تسمیہ بنی اسرائیل کا قدیم شہر قدس تفطلی ہے جس کے کھنڈر پہاڑی کے اوپر پائے جاتے ہیں اور قدس یہاں کے اسرائیلی بادشاہ کا نام بھی تھا۔ اس جھیل میں بہت سے ندی نالے آملے ہیں۔ یہاں سے بڑھ کر اُردن ضلع خیطہ کو طے کرتی اور قصر یعقوب کے نیچے جسر یعقوب تک پہنچتی اور آگے بڑھ کر بحیرۂ طبریہ میں گرجاتی ہے اس جھیل کو چھوڑ کر وہ غور کو طے کرتی ہے۔ طبریہ کے گرم چشموں پر گرم اور نمکین پانی کے بہنے کا حیرت انگیز تماشا دکھائی دیتا ہے"۔

انہی گرم چشموں سے جو ایک گانو جدر (Gadara, جسے آج کل ام قیس کہتے ہیں) سے نکلے ہیں، اور جن کے پانی میں بنی نوع انسان کے جملہ امراض کو شفا دینے کی تاثیر ہے، ایک بڑی ندی (یرموک) نکلی ہے اور اُردن کے بحیرۂ طبریہ سے آگے بڑھنے کے بعد اس میں غور کے ایک مقام المجامع پر آملی ہے۔ پھر یہ دونوں ندیاں ایک ہو کر آگے بڑھتی ہیں اور ان میں پانی بڑھتا جاتا ہے کیونکہ بیسان کے قریب بہت سے چشمے اُردن سے آملے ہیں۔ اس کے آگے جنوب میں اور بھی چشموں کا پانی اُردن میں شامل ہو جاتا ہے تاآنکہ وہ بحیرۂ زُغر میں جا گرتی ہے جو کھاری اور بودار ہے اور بحیرۂ لوط کہلاتا ہے۔ اس میں گر کے یہ دریا آگے نہیں بڑھتا۔ اور خود یہ جھیل اتنا پانی آملنے کے باوجود نہ جاڑوں میں بڑھتی ہے نہ گرمیوں میں اس کی مقدار آب کم ہوتی ہے۔ اُردن کا پانی دن رات اس میں آتا رہتا ہے"۔ (دمشقی۔ دوم ۱۰۷)

نہر یرموک:- (قدیم میرومیکس) کی نسبت یاقوت لکھتا ہے کہ "نہر یرموک شام کی وادی ہے جو غور تک بڑھی چلی آئی ہے۔ اس کا پانی اُردن میں

باب دوم

جا گرتا اور پھر بہہ کے بحیرۂ متعفّن (لوط) میں چلا جاتا ہے۔ اسی ندی یرموک کے کنارے خلیفہ ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں رومیوں اور مسلمانوں کی مشہور و معروف جنگ ہوئی۔ مقام جنگ ایک وادی الواقوصہ (= مقام شکست) تھی جو شام کی ولایت حوران میں واقع ہے۔ عہد ابو بکرؓ میں مسلمانوں کا پڑاؤ یرموک کے کنارے تھا جہاں سے وہ رومیوں پر تاخت کرنے آگے بڑھے۔ وہ بت پرستوں پر جا پڑے اور خالد نے لوگوں کو قتال کا جوش دلایا۔ ان میں سے ایک گروہ دشمن کا تعاقب کرتا ہوا ایک بلندی پر پہنچ گیا جس کے نیچے پہاڑ کی گھاٹی تھی۔ مفرور دشمن اس گھاٹی میں گر پڑے کیونکہ کہر چھائی ہوئی تھی اور بعض لوگوں کا قول ہے کہ رات کا وقت تھا اور وہ اس کھڈ کو نہ دیکھ سکے۔ ان کے بعد بھی جو رومی بھاگ کے آئے انھیں خبر نہ ہوئی کہ آگے والوں پر کیا گزری اور وہ بھی اسی کھڈ میں گرے۔ دشمن کے مقتولوں کا شمار ممکن نہ تھا مگر تخمینہ کرتے ہیں کہ اسی ہزار رومی ہلاک ہوئے۔ اس گھاٹی یا کھڈ کو اس دن سے آج تک الواقوصہ کہتے ہیں کیونکہ اسی جگہ رومی فوج شکستہ اور پراگندہ ہوئی تھی۔ جس وقت دن نکلا اور کافر نظر نہ آئے تو مسلمان سمجھے کہ وہ کہیں گھات میں چھپ گئے ہیں تا آنکہ اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ چند رومی جو باقی رہ گئے تھے فرار ہوئے مگر مسلمانوں نے پیچھا کیا اور انھیں بھی قتل کیا حتیٰ کہ تمام رومی لشکر کا تہس نہس ہو گیا۔ (یاقوت چہارم، ۸۹۳ - ۱۰۱۵؛ مراصد - سوم، ۲۷۲ - ۲۳۹)

دمشقی لکھتا ہے (ص ۱۱۰) کہ "نہر الیرموک جبل الثریان سے بہتی ہوئی نیچے آتی ہے"

نہر الزرقا (The jabbok=) (یعنی نیلی ندی) حسبان کے علاقے سے بہتی ہے اور اردن میں آملی ہے" (صفحہ ۱۱۰)

یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ بڑی ندی ہے اور غور میں آگرتی ہے۔ یہ سبزہ پوش مقامات اور بہت سی پہاڑی تنگناؤں سے گزرتی ہے اور اس کا علاقہ وہ ہے جہاں قوم تبّع کے قدیم حمیری بادشاہ حکمراں تھے۔ اس سرزمین میں بہت سے جنگلی جانور اور درندے ہیں" (دوم - ۹۲۴)

باب دوم

نہر الموجب؛ (The Arnon) بقول ادریسی "یہ ایک بڑی ندی کا نام ہے جس کے دونوں طرف پہاڑی چٹانیں ہیں اور گزرگاہ بہت گہری ہے اور ضلع الشراہ سے عمان جاتے وقت سیاح کو اسے عبور کرنا ہوتا ہے۔ دو طرفہ چٹانوں کے درمیان سے تنگ راستہ گزرتا ہے اور یہ چٹانیں اس قدر ایک دوسرے کے نزدیک ہیں کہ آدمی دوسری طرف والے سے بے تکلف بات چیت کر سکتا ہے لیکن اگر ایک طرف سے دوسری طرف جانا چاہے تو چھ میل تک اترنا اور پھر چھ میل کی چڑھائی چڑھنی پڑیگی۔ یہی چٹانیں دریا کے کناروں کے اوپر اوپر چلی جاتی ہیں" (ادریسی۔ ۵)

یاقوت نے لکھا ہے کہ الموجب یا الموجب بیت المقدس اور ولایت بلقا کے درمیان شام میں ایک مقام ہے (یا) چہارم، ۶۷۰؛ مراصد۔ سوم، (۱۷)

نہر العوجا؛ (ٹیڑھی ندی) یا نہر ابی فترس (یعنی فترس، یا بطروس کے باپ کی ندی)۔ یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ ندی رملہ سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر جانب شمال بہتی ہے۔ یہ نابلس کے نواحی کوہستان میں چشموں سے نکلی ہے اور ارسوف و یافہ کے درمیان سمندر میں جا گری ہے؛ بہت سی بڑی لڑائیاں اس کے کنارے ہوئی ہیں اور جب کبھی یہاں مقابلہ ہوا، ہمیشہ مشرقی کنارے کی فوج کو ہزیمت نصیب ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) کی لڑائی میں جو عباسیوں اور اموبوں میں برپا ہوئی اور اس معرکے میں جو طولونی اور خلیفہ معتضد کے لشکر میں اس کے کنارے مقام طواحین (= چکیاں) پر پڑا، ایسا ہی ہوا" (چہارم، ۱۳۱؛ مراصد سوم، ۲۴۳)

دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے کہ "العوجا اس ندی کا نام ہے جو ارسوف و الرملہ کے مابین بہتی ہے (اور نہر ابی فترس بھی اسی کا نام ہے)" (سوم، ۷۴۴)

۵۶

ابو الفدا کہتا ہے کہ "نہر ابی فترس وہ ندی ہے جو الرملہ کے قریب شام میں بہتی ہے۔ مہلبی کی تصنیف "عزیزی" میں اس کا نام نہر عوجا بتایا گیا ہے

باب دوم

یہ الرملہ سے تقریباً بارہ میل شمال میں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے کناروں پر جب کبھی جنگ ہوئی تو ہمیشہ مغربی کنارے کا لشکر فتحیاب ہوا اور مشرقی کنارے والے نے شکست کھائی۔ چنانچہ خلیفہ المعتضد، خمرویہ ابن احمد ابن طولون کے مقابلے سے بھاگ کھڑا ہوا (۲۷۱ھ) اور مصر کے فاطمی خلیفہ العزیز نے بھی ہفتگین ترک پر فتح پائی اور اسے قیدی بنا لیا۔ (۹۷۵ء) یہ سپہ سالار اور اسکی فوج بھی مشرقی کنارے پر تھے۔

نہر لیطہ (Litany) جسے غلطی سے Leontes کہنے لگے ہیں)
آج کل القاسمیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ادریسی نے بارھویں صدی میں تذکرہ کیا ہے: "نہر لیطہ، صور، دیمقند۔ کے درمیان سمندر میں گرتی ہے۔ یہ پہاڑوں سے نکلی ہے اور سمندر تک پہنچ جاتی ہے" (ادریسی ۱۲)

دمشقی لکھتا ہے کہ "نہر لیطہ کا منبع کرک نوح علیہ السلام (یعنی نوح علیہ السلام کا حصار) میں ہے۔ وہاں بہت سے چشمے اور نالے جمع ہو جاتے ہیں اور یہ ندی جبل لبنان کے دامن میں بہہ کر جبل مشغرا سے گزرتی ہے۔ اس پہاڑ کے بھی بہت سے چشمے اسی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ البحر متق اور ربعہ میں ایک بڑے اور مضبوط قلعے الشقیف کے قریب سے گزرتی ہے۔ اس کے آگے یہ ایک بڑا دریا بن گئی ہے اور اس جگہ بحر متوسط میں جا گری ہے جو صور سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے" (دمشقی ۱۰۷)

نہر الکلب (Dog River) جسے قدیم زمانے میں لائی کس کہتے تھے اس کا یاقوت نے تذکرہ کیا ہے کہ "یہ ندی بیروت وصیدا کے درمیان سے نکلی اور ولایت عواصم یا سرحدی قلعوں کے علاقے کی ہے" (چہارم ۲۹۸، ۹۳ مراصد دوم ۲۵۰، ۵۰۸)

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ نہر الکلب بیروت ہی کے شمال میں سمندر میں جا گرتی ہے۔

۵۷

نہر ابراہیم "یہ ساحل شام کی چھوٹی سی ندی ہے۔ اس کا پانی لبنان اور قسروان کے پہاڑوں سے آتا ہے اور ساحل تک پہنچ کے بحر متوسط

باب دوم

میں جا ملتا ہے۔" (دمشقی، ۱۰۷)

نہر الابتر:- دمشقی لکھتا ہے کہ "یہ وہ ندی ہے جو بلنیاس اور جبلہ کے مابین سمندر میں گرتی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بہت کم راستہ طے کرتی ہے اور پانی (آب پاشی وغیرہ کے لیے) کسی کام میں نہیں آتا۔ اور پانی کی کثرت اور تیز روانی کے باوجود اس سے کوئی نہر نہیں نکالی گئی ہے۔ اس کے اندر ایک ٹاپو پر ایک قلعے کے کھنڈر پائے جاتے ہیں جس کا نام بلدہ ہے یہ مستحکم ترین مقامات میں تھا لیکن قلعہ کی فوج نے آپس ہی کی لڑائی کی بدولت جس نے انھیں بھی تتر بتر کر دیا، اس کے استحکامات منہدم کر دیئے۔ خود یہ ٹاپو اس ملک کے سب سے خوبصورت مقامات میں داخل ہے اس کے نصف حصہ پر سمندر کا پانی آتا ہے اور باقی نصف دریا میں گھرا ہوا ہے۔ اس طرح آدھا جزیرہ کھاری اور آدھا میٹھے پانی میں ہے لیکن بادی النظر میں دونوں حصّے ایک ہی پانی میں نظر آتے ہیں جس نے جزیرے کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔" (دمشقی۔ ص ۲۰۹)

نہر السبت:- اس ندی کے منبع کو ۱۰۴۷ء میں ناصر خسرو دیکھنے آیا تھا لکھتا ہے کہ "ہم حماۃ سے ساحلی راستے جنوب کی طرف آئے اور پہاڑوں میں ایک چشمہ دیکھا جس کی نسبت لوگ کہتے ہیں کہ سال میں صرف ایک مرتبہ جبکہ شعبان کی چودھویں رات گزر جاتی ہے، اس میں پانی آتا ہے۔ پھر تین دن تک اس میں پانی بہتا اور بعد ازاں بالکل خشک ہو جاتا ہے اور آئندہ سال تک مطلق پانی نہیں دیتا۔ کثرت سے لوگ زیارت کے لیے یہاں آتے اور بارگاہ رب العزت میں دعا و التجا کرتے ہیں۔ ایک عمارت اور حوض بھی اس مقام پر بنا دیا گیا ہے۔" (صفحہ۔ ۵)

کچھ شک نہیں کہ یہ روایت سبت کی قدیم ندی سے متعلق ہے جسے طیطس بھی دیکھنے آیا تھا (دیکھو جوزی فس۔ "وارز" ہفتم ۵ ۱) آج کل اسے فوارۃ الدیر کہتے ہیں یعنی خانقاہ کا فوارہ اور یہ خانقاہ مار جرجیس (سینٹ جورج) وہی عمارت ہے جس کا ناصر خسرو نے ذکر کیا۔ جوزیفس یقین دلاتا ہے کہ اس کا پانی ہفتے کے دن رک جاتا ہے مگر مسلمان کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن بند ہوتا ہے۔

نہر بردا ؏ بردا یعنی دور قدیم کی آباناد مشق کی سب سے بڑی ندی ہے اس نہری جال کا کسی قدر تفصیلی حال، جو دمشق کے میدان کو سیراب کرتا ہے، ہم آگے چھٹے باب میں تحریر کریں گے ؏

بردا کی نسبت مقدسی لکھتا ہے کہ "شام کے سارے ملک میں متعدد دریا ہیں جن میں سے اکثر بحر متوسط میں جا گرے ہیں بجز بردا ندی کے جو دمشق کے جنوب میں منقسم ہو کے سارے ضلعے میں پھیل جاتی ہے۔ اس کے بالائی حصے میں سے ایک شاخ پھوٹ کر شہر کے شمالی ٹکڑے کے گرد پھیل گئی ہے پھر نیچے آ کے اس کے دو دھاریں الگ الگ بہتی ہیں جن میں سے ایک صحرا کی طرف گئی ہے اور جھیل بن کے رہ گئی ہے مگر دوسری جنوب میں بھی جاتی ہے تاآنکہ اردن سے آ ملی ہے۔" (۱۸۴)

یاقوت کی روایت کے مطابق "بردا کو بردیا بھی کہتے ہیں۔ اور یہ دمشق کی بڑی ندی ہے۔ اس علاقے میں ایک اور ندی باناس ہے لیکن بردا بڑی اور یہاں کی خاص ندی ہے۔ یہ کورۂ الزبدانی کے (جو دمشق سے پانچ فرسخ پر بعلبک کے قریب واقع ہے) ایک گاؤں قنوا کے نزدیک کی وادی سے نکلتی ہے اور اس وادی کے چشموں سے بن کر فیجہ تک بہہ آتی ہے جو دمشق سے دو فرسخ کے فاصلے پر ایک موضع ہے۔ یہاں ایک اور چشمہ اس میں آملا ہے اور یہ دونوں ملکر موضع جمرایا تک بہتے ہیں ؏ بردا ندی کے دمشق کے حوالی میں پہنچتے ہی بہت سی نہریں اس سے کاٹی گئی ہیں اور قلابے بنا کے اس کے پانی کا رخ پلٹ دیا ہے نہر کے شمال میں اور جبل قاسیون کے نیچے دو نہریں ہیں۔ ایک نہر یزید اور اس کے نیچے کی نہر تورا کہلاتی ہے۔ پہلی کو خلیفہ یزید ابن معاویہؓ نے کھدوایا تھا (یاقوت چہارم، ۸۴۶، مراصد۔ سوم، ۲۵۳)

"تورا کو اکثر غلطی سے تورہ بھی لکھ دیتے ہیں" (یاقوت اوّل، ۹۳۰ کے مراصد اوّل، ۱۳۱)

"نہر یزید موضع جمرایا کے برابر سے بہہ کر ندی نالوں کا پانی لیتی ہوئی جبل قاسیون کے دامن میں پہنچتی ہے۔ تورا کی موضع دمر پر دو شاخیں ہو گئی ہیں اور

باب دوم

آگے جنوب میں باناس کو بھی کاٹ کر پانی لیا ہے۔ "ادھر بردا کی اصلی دھار شہر کی طرف بہتی ہے اور وہاں اس سے نہر قنوات کاٹی ہے مگر یہ بہت چھوٹی نہر ہے۔ پھر بھی شہر میں آکر یہی نہر القنوات چھوٹے چھوٹے رج بھون میں بٹ کر جنوب کی طرف بہتی ہے اور شہر کے ایک ایک مکان میں اس کا پانی پہنچتا ہے۔ دوسری طرف سے ایک بڑی نہر باناس جس کا اوپر ذکر آیا، دمشق کے قلعے اور نواحی مکانات سے گزری ہے اور مختلف رج بھون میں منقسم ہوکر غوطہ کی جانب گئی ہے اور شہر کے باب الصغیر اور باب الشرقی کے باہر تمام کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ بردا کی اصلی دھار بھی شہر سے گزر کر غوطہ میں بہتی ہے اور مشرق کی جھیل میں جاکے ختم ہوجاتی ہے۔ اسی جھیل میں نہر تورا کا پانی شمال سے آملتا ہے اور نیز نہر الیزید کا، جو دمشق کے شمال میں تمام باغوں کو پانی پہنچاتی ہے" (یاقوت اول - ۵۵۶ - مراصد، اوّل، ۱۴۱)

۵۹

العاصی: یونانی اس ندی کو اردن تیس کہتے تھے اور یہ نام قدیم شامی لفظ "اُردت زیو" سے انھوں نے لیا تھا، جس کے معنی تیز رو کے ہیں۔ عربوں نے اسے بگاڑ کر العاصی (بمعنی سرکش) بنایا اور المقلوب یا "الٹی ندی" بھی کہتے تھے کیونکہ یہ ندی بہت سی دوسری ندیوں کے خلاف جو جنوب سے شمال کی طرف بہتی تھیں، مخالف سمت میں بہتی تھی۔ مجاہدین صلیب نے حسب معمول، اٹکل پچو طور پر اسے انجیل کی فرفر ندی سمجھ لیا اور اپنے وقائع میں اسی نام سے پکارتے ہیں۔

ادریسی لکھتا ہے کہ "شہر انطاکیہ، المقلوب ندی پر واقع ہے جسے "ارنت" (اُدرن تیس) بھی کہتے ہیں، یہ ندی دمشق کے علاقے میں اس مقام کے قریب سے نکلی ہے جہاں صحرا کا راستہ دو طرف پھٹ گیا ہے۔ وہاں سے بہتی ہوئی یہ حمص سے گزرتی ہے۔ پھر حماۃ اور شیزر کے شہروں کو طے کرکے انطاکیہ پہنچتی ہے جہاں اس نے شہر کے شمالی پہلو کے گرد چکر کھایا ہے اور پھر جنوب میں پلٹ کر السویدیہ کے نیچے سمندر میں آگری ہے۔" (ادریسی - ۲۳)

یاقوت کی تحقیق یہ ہے کہ بحیرہ قدس سے نکل کر یہ ندی المیماس یا المیناس

کہلاتی ہے۔ حماہ اور حمص میں اس کا نام العاصی ہے اور انطاکیہ میں اسی کو الارنت یا الارنند کہتے ہیں" (جلد اول، ۲۲۳۔ سوم، ۸۸ ۵ ۔ مراصد اول، ۵۱۔ دوم، ۲۲۶)

ابو الفدا کہتا ہے کہ " رود حماہ کو الارنت بھی کہتے ہیں اور اسی کا ایک نام المقلوب ہے کیونکہ یہ جنوب سے شمال کو بہتی ہے۔ اسی کا ایک اور نام العاصی (سرکش) ہے کیونکہ جہاں اور ندیاں رہٹ کے بغیر اپنے کناروں سے صرف بہہ کر پانی دیدیتی ہیں، یہ ندی بغیر ان کلوں کی مدد کے، جنھیں دولاب اور ناعورہ کہتے ہیں، زمین کو سیراب نہیں کرتی ۔ اول سے آخر تک اس کا بہاؤ جنوب سے شمال کی طرف ہے۔ منبع پر یہ ذرا سی ندی ہے اور مقام الرأس پر جو بعلبک سے جانب شمال تقریبًا ایک دن کی مسافت پر واقع ہے نکلتی ہے الرأس کے شمال میں بہہ کر یہ قائم الہرمل پہنچتی ہے جو الرأس اور جوسیہ کے وسط میں ہے۔ اس جگہ یہ ایک وادی سے گزری ہے اور یہیں مغارۃ الراہب (یعنی سنیاسی کی کھو") میں اس کا بڑا چشمہ ہے۔ پھر شمال کی طرف بہہ کر یہ جوسیہ سے گزرتی اور حمص کے مغرب میں بحیرۂ قدس میں آگری ہے۔ لیکن اس جھیل سے پھر آگے بہہ کر یہ حمص والرستن سے گزرتی ہوئی حماہ اور پھر شیزر اور بحیرۂ افامیہ تک آئی ہے۔ اور افامیہ سے درکوش کے راستے " لوہے کے پل" (الجسر الحدید) تک پہنچی ہے۔ یہاں تک اس کا مشرقی کنارہ جبل لکام تھا لیکن لوہے کے پل پر پہنچ کے یہ پہاڑ دب گیا ہے اور یہاں سے ندی مڑ کر جنوب و مغرب کی طرف بہی ہے اور انطاکیہ کی شہر پناہ کے قریب سے گزر کر السویدیہ پر بحر روم میں جا گری ہے ۔

اس ندی میں بہت سی اور ندیاں آکر ملتی ہیں پہلی تو وہ جو شہر افامیہ کے نیچے سے نکلتی اور جانب مغرب بہہ کر افامیہ جھیل میں گرتی ہے جہاں سے اس کا پانی المقلوب میں مل گیا ہے ۔ (۲) ایک ندی افامیہ کے کوئی دو میل شمال سے آتی ہے۔ اسے نہر الکبیر کہتے ہیں مگر یہ بھی تھوڑی سی دور چل کے جھیل افامیہ میں گری ہے اور پھر المقلوب کے ساتھ مل کر جھیل سے باہر نکلتی ہے

باب دوم

(۳) ایک معاون، نہرالاسود یا ترکی میں "کاراسو" (یعنی کالی ندی) ہے جو شمال سے آتی اور دربیاگ سے گزرتی ہے؛ (۴) نہر یغرا، قصبہ یغرا کے قریب سے نکلتی اور اس بستی کے نزدیک سے بہتی ہوئی نہرالاسود میں جا ملتی ہے جس کا اوپر ذکر آیا۔ یہ دونوں مل کر بحیرۂ انطاکیہ میں آگری ہیں؛ (۵) پانچویں ندی نہر عفرین ہے جس کا منبع یونانیوں کے علاقے میں ہے الراوندان سے گزرتی ہوئی کورہ الجومہ تک پہنچتی ہے۔ الجومہ کو طے کرکے یہ کورہ العمق میں آئی ہے اور یہاں نہرالاسود سے مل گئی ہے۔ اس طرح یہ تینوں، یعنی نہرالاسود، نہر یغرا اور نہر عفرین ایک ندی بن کے بحیرۂ انطاکیہ میں گری ہیں اور جب اس کے آگے بہتی ہیں تو اس کا نام عاصی (یا الارنت) ہو گیا ہے کیونکہ یہ دریا حماہ سے آگے بڑھ کر انطاکیہ کے شمال میں پہنچتا اور شہر کے مشرق[1] میں بہتا ہے (ابوالفدا۔ ۴۹)

61

دمشقی لکھتا ہے کہ "نہر عاصی، حماہ اور الرستن کے درمیان نہرالارنت کہلاتی ہے اس کا سرچشمہ اللبوہ اور الراس میں ہے جو بعلبک کے قریب واقع ہیں۔ وہاں سے یہ بہہ کر حمص آتی ہے۔ پانی کا ایک بڑا چشمہ نیچے بہتا ہوا آیا اور اس ندی میں مل گیا ہے۔ اس چشمے کو عین الہرمل کہتے ہیں اور اس کے اوپر قدیم صابئین کی ایک رصدگاہ ہے جو المغزلانی نام کی ان دو رصدگاہوں جیسی ہے جو حمص میں نظر آتی ہیں۔ یہاں رودِ عاصی بہتی ہوئی حصن الاکراد کی دیواروں کے نیچے سے گزرتی ہے اور یہاں اس کا پانی ایسا صاف شفاف ہے، جیسے آنسو تا آنکہ وہ بحیرۂ حمص میں آملتا ہے اور وہاں سے نیل کی مثل گدلا ہو کے نکلتا ہے اور اس وقت تک کہ یہ دریا کورہ ارض الروج میں پہنچے صاف نہیں ہوتا۔ آخر میں یہ دریا السویدیہ کے برابر سے گزر کر سمندر میں جا گرتا ہے۔" (دمشقی۔ ۱۰۷، ۲۰۷، ۲۵۹)

نہر قویق قدیم کالوس اور حلب کا دریا ہے۔ ادریسی لکھتا ہے کہ "یہ ندی

---

[1] کتاب میں غلطی سے یہاں لفظ "مغرب" تحریر ہے۔

باب دوم

دابک سے سولہ میل کے فاصلے پر موضع سنیاب سے نکلتی ہے۔ وہاں سے حلب اٹھارہ میل ہے اور اسے طے کر کے یہ بیس میل آگے قنسرین پھر مرج الاحمر ("سرخ چراگاہ") تک پہنچتی ہے اور اس کے نیچے بارہ میل تک دلدلوں میں چکر کھا کے ختم ہو جاتی ہے۔ منبع سے دلدلوں میں غائب ہو جانے تک اس کا طول ۴۲ میل ہے" (صفحہ ۲۵)

یاقوت بھی قریب قریب اسی قسم کی اطلاع بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن اس گاؤں کا نام جہاں سے قویق نکلی ہے، سبتات یا سبتار بتاتا ہے اور آخر میں یہ بھی کہتا ہے کہ بعض لوگ اس کا منبع سبادیر میں بتاتے ہیں جو دابک سے چھ میل کے فاصلے پر ہے؛ قویق کا طول بھی اس نے ۴۰ میل لکھا ہے" اس کا پانی میٹھا ہے لیکن گرمیوں میں قریب قریب بالکل سوکھ جاتا ہے۔ البتہ سردی کی بارش کے بعد یہ بہت اچھی ندی بن جاتی ہے اور حلب کے شعرا اس کا فردوس کے چشمۂ کوثر سے مقابلہ کرتے ہیں؛ (چہارم، ۲۰۶؛ مراصد دوم، ۴۶۲)

ایک اور مقام پر یاقوت لکھتا ہے کہ "جبل جوشن کے مقابل حلب کے قریب رود قویق کو العجان کہتے ہیں" (سوم۔ ۴۴۷، مراصد۔ دوم، ۲۰۰)

دمشقی نے بھی قویق کا قریب قریب یہی حال تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "حلب کے اوباش اس دریا کو "ابو الحسن" پکارتے ہیں (یعنی خوبصورتی کا باپ) یہ آخر میں مرج الاحمر سے گزر کر اس دلدل میں جا گرا ہے جسے بحیرۂ منخ (یعنی کیچڑ کی جھیل کہتے ہیں" (۲۰۲)

۶۲ نہر الازرق؛ (نیلی ندی) یاقوت کہتا ہے کہ "یہ بہسنا اور حصن منصور کے درمیان اور حلب کی طرف کی وہ ندی ہے جس کا تعلق علاقہ ثغور سے ہے۔ (چہارم، ۸۴۳؛ مراصد۔ سوم، ۲۴۳)

نہر الاسود (کالی ندی) "یہ ندی نہر الازرق کے قریب، مصیصہ اور طرسوس کے علاقے میں بہتی ہے" (یاقوت، چہارم، ۸۴۳؛ مراصد سوم، ۲۴۳ نیز دیکھو اس کا بیان گزشتہ صفحات میں)

نہر عفرین؛ "یہ المصیصہ کے علاقے کی ندی کا نام ہے جو حلب

کے ضلعے میں بہتی ہے" (یاقوت سوم، ۶۸۹ - مراصد، دوم، ۲۶۴)

نہر الذہب : (سونے کی ندی) حلب والے وادی بطنان کو جو بزاعہ سے گزرتی ہے اس نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ وادی خوشنمائی میں دنیا کے عجائب ترین مقامات میں شامل ہے۔ خود ندی دو فرسخ لمبی چوڑی وسیع دلدل میں آکر خشک ہو جاتی ہے اور صرف نمک چھوڑ جاتی ہے۔ اس دلدل کو یہاں والے الجبول کہتے ہیں اور یہاں سے جو نمک جمع ہوتا ہے وہ شام کے تمام اقطاع میں دساور جاتا ہے" (یاقوت چہارم، ۹۳۸ ؛ مراصد، سوم، ۲۴۶)

نہر حوریث : یہ ندی مرعش کے قریب بحیرۂ حدث نامی جھیل سے نکلتی اور دریائے جیحان میں جا گرتی ہے۔

نہر جیحان : (پیراموس") "جیحان وہ دریا ہے جو یونانیوں کے علاقے سے نکلتا اور شہر المصیصہ سے گزرتا ہے۔ پھر چند دیہات کے قریب سے جنھیں ملون[1] کہتے ہیں بہکر سمندر میں آگرا ہے۔ اس کے کناروں پر بہت سے کھیڑے اور جا بجا پانی کے راستے بنے ہوئے ہیں" (اصطخری ۶۳ ؛ ابن حوقل - ۱۲۲)

ابو الفدا لکھتا ہے کہ "نہر جیحان قریب قریب فرات کے برابر بڑا دریا ہے یہ سیس (یعنی سلیشیہ یا ارمینہ خورد) سے گزرتا ہے اور اس کا بازاری نام "جہان" ہے۔ یہ شمال سے جنوب کی طرف یونانی علاقے کے پہاڑوں میں سے بہتا ہے تا آنکہ المصیصہ کے شمال میں مڑکر مشرق سے مغرب کی جانب بہنے لگتا ہے اور مذکورۂ بالا شہر کے قریب ہی بحر روم میں آگرتا ہے" (صفحہ - ۵۰)

دمشقی نے لکھا ہے کہ "اس کا بہاؤ زبطرہ کے قریب سے شروع ہوتا ہے یہ ایک زبردست چٹان کے نیچے بہتا ہے اور منبع کے قریب ایک کلیسا اسی قسم کا بنا ہوا ہے جیسا سیحان کے منبع پر۔ اور اس کا طول بھی سیحان کے قریب ہے" (صفحہ ۱۰۷، نیز یاقوت دوم ۱۷۰ ؛ مراصد اول، ۲۶۷ - جنھوں نے اس بیان میں کوئی اضافہ نہیں کیا)

---

[1] قدیم میلوس، جسے ازمنہ وسطیٰ میں میلو کہتے تھے۔

۴۴ باب دوم

نہر سیحان ؛ (''سیروس'') ''دریائے سیحان، جیحان کے برابر بڑا نہیں ہے۔ اس پر غیر معمولی طول کا ایک عجیب سنگی پل بنا ہوا ہے۔ یہ دریا بھی یونانیوں کے علاقے سے نکلتا ہے'' (اصطخری، ۶۴ ؛ ابن حوقل، ۱۲۲۔ نقل کردہ ابو الفدا)

مسعودی لکھتا ہے کہ ''سیحان، روایت عام کی بموجب ان دریاؤں میں سے ہے جن کا منبع جنت میں ہے۔ یہ شام کے قلعے عدنہ کا دریا ہے اور بحر متوسط میں جا گرتا ہے۔ یہ ملطیہ کے آگے تین دن کی مسافت پر نکلتا ہے اور اس کے کنارے صرف عدنہ ہی مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ یہ دریا طرسوس اور المصیصہ کے درمیان بہتا ہے۔ اس کے ساتھ کا دریا جیحان، قصبہ مرعش سے تین میل کے فاصلے پر عیون جیحان سے نکلتا اور بحر متوسط میں جا گرتا ہے۔ اس کے کنارے پر صرف المصیصہ اور کفر بیا دو ہی اسلامی شہر واقع ہیں''۔ (مسعودی دوم ۳۵۹)

دمشقی کہتا ہے کہ ''نہر سیحان کا بہاؤ ملطیہ کے علاقے میں ایک قلعے کے قریب سے شروع ہوتا ہے۔ وہاں ایک کلیسا بنا ہوا ہے جس میں جنت اور اہل جنت کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہاں سے دریا نیچے کے رخ بہتا ہے اور اس کا طول بحر متوسط تک جہاں وہ سمندر میں گرا ہے۔ ۳۰۔ ۷ (؟) میل ہے'' (دم ۱۰۷)

ابو الفدا نے سیحان کا حال قریب قریب انہی الفاظ میں تحریر کیا اور یہ اضافہ کیا ہے کہ ''یہ دریا ارمنوں کے ملک سے، جسے فی زماننا بلادسیس کہتے ہیں، گزرا اور عدنہ کی شہر پناہ تک پھر آگے مغرب میں بہتا ہے، عدنہ المصیصہ سے ایک دن سے کم کی مسافت پر واقع ہے اور عدنہ سے آگے بڑھکر سیحان، جیحان سے مل جاتا ہے اور دونوں ایک ندی بنکر بحر روم میں ایاس و طرسوس کے درمیان جا گرتے ہیں'' (۵۰)۔

مگر آج کل جیحان و سیحان نہیں ملتے بلکہ الگ الگ دہانوں سے بحر متوسط میں گرتے ہیں۔ ان سرحدی دریاؤں کو قدیم مسلمانوں نے یہ نام جیحون اور سیحون کی

مناسبت سے دیا تھا جو وسط ایشیا کے سرحدی دریا ہیں ٭

نہر بردان ٭ (کیڈ نوس) مسعودی لکھتا ہے کہ یہ طرسوس کا دریا ہے جو طرسوس کے سواحل سے سمندر میں داخل ہوا ہے" (اول، ۲۶۴) ابن الفقیہ کا بیان ہے کہ اسی دریا کو الغضبان بھی کہتے ہیں (صفحہ ۔ ۱۱۶)

۶۴

یاقوت لکھتا ہے کہ "البردان، ثغور (یا سرحدی قلاع) کے علاقے کا دریا ہے یہ یونانی علاقے سے نکلتا اور طرسوس سے چھ میل کے فاصلے پر سمندر میں جا گرتا ہے۔ یہ مرعش کے قریب ہی کے ایک پہاڑ الاقرع (= گنجا) کے دامن میں آکے، اس قصبے کے باغوں کو سیراب کرتا ہے" (اول، ۵۳۳ ۔ مراصد اول ۱۴۰)

جھیلیں

بحر لوط ٭ اس جھیل کو آج کل عام طور پر لوط علیہ السلام کی جھیل یا "بحر لوط" کہتے ہیں۔ زمانہ سابق میں اسے "بحیرۂ میتہ" (یعنی مردار جھیل) بحیرۂ منتنہ" (یا متعفن) اور "المقلوب" (یعنی الٹی ہوئی جھیل) وغیرہ ناموں سے یاد کرتے تھے۔ آخری نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آل لوط علیہ السلام کی بستیاں اس کی تہ میں الٹ دی گئی تھیں ٭ بحر زغر یا صغر کے نام سے بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ اس نام کا مشہور شہر اس کے کناروں پر آباد تھا۔ واضح ہو کہ انجیل میں کہیں اس جھیل کو مردار کے نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ یہ لفظ سب سے پہلے جسٹن کے ہاں ملتا ہے (سی وششم ۳، ۶) جو "میرمورتوم" کا ذکر کرتا ہے اور اسی طرح پوسےنیاس نے بھی اسی لقب سے اسے یاد کیا ہے۔ پنجم، ۷، ۵)

یعقوبی کہتا ہے کہ "مردار جھیل یا بحیرۃ المتیہ بیت جبرین کے ضلعے میں واقع ہے یہی جھیل ہے جہاں سے حُمرہ (یکی ذال) آتی ہے جسے مومیا بھی کہتے ہیں" (۱۱۷) ٭

باب شام

اصطخری اور ابن حوقل کے قول کے بموجب "بحر لوط شام کے اگلے یا جنوبی حصے میں غور کے اندر اور زغر کے قریب واقع ہے۔ اسے "بحیرۂ میتہ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی زندہ شئے یا مچھلی نہیں پائی جاتی۔ پانی میں سے ایک مادہ حمر (رال) اوپر آتا ہے اور زغر کے لوگ اس سے تاکستان میں قلم لگانے کا کام لیتے ہیں اس طریق پر انگور کی قلمیں تمام فلسطین میں لگائی جاتی ہیں۔ اسی کی مثل کھجور میں نر شاخ لگا کے پیوند دیتے ہیں۔ المغرب کے لوگ بھی انجیر میں نر پھول کے مادے سے پیوند لگاتے ہیں" اصطخری کے قول کی موجب بحیرۂ میتہ کو بحیرۂ منتنہ (= متعفن) بھی کہا جاتا ہے۔" اصطخری - ۶۴، ابن حوقل - ۱۲۳ - نقل کردہ ابو الفدا، ۲۲۸)

انگور میں رال سے پیوند لگانے کی روایت، ظاہر ہے کہ احمقانہ غلطی ہے اصل میں وہاں کے باشندے اس مادے کے ذریعے انگور کے پودوں کو گھن اور کیڑوں سے بچاتے تھے جیسا کہ آگے ناصر خسرو کے بیان سے ظاہر ہوگا۔ کھجور اور دوسرے ثمر دار درختوں میں مصنوعی پیوند لگانے کے متعلق عرب مصنفوں نے جنھوں نے باغبانی پر کتابیں لکھی ہیں، تفصیل سے بحث کی ہے۔

۶۵ مقدسی لکھتا ہے کہ "بحیرۂ صغر (= لوط) عجیب و غریب جگہ ہے۔ دریائے اردن اور شراہ کا دریا دونوں اس میں آ کے گرتے ہیں اور پھر بھی اس کی سطح میں مطلق فرق نہیں آتا۔ کہتے ہیں کہ اس جھیل کے پانی میں آدمی آسانی سے نہیں ڈوبتا اور طوفان کے موسم میں بھی اس کی سطح سے موجیں بلند نہیں ہوتیں۔ اس کے پانی سے شفا دیا جائے تو یہ بہت سی خرابیوں کی دوا ہے۔ اسی طرح پانی لینے کے لیے یہاں لوگوں نے ایک خاص تہوار مقرر کیا ہے جو ماہ آب (اگست) کے وسط میں منایا جاتا ہے۔ اور ہر طرف سے لوگ اور جو بیماری میں مبتلا ہیں، وہ یہاں جمع ہوتے ہیں۔" (۱۸۶)

"پھر دریائے اردن، غور کی وادیوں سے بہتا ہوا، بحیرۂ مقلوب (=لوط) میں آ گرتا ہے۔ یہ جھیل بالکل نمک کی ہے جس میں ہر چیز بھسم ہو جاتی ہے اور وحشت و تعفن کا عالم ہے۔ پانی کے نیچے سے پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں

لیکن اس کی موجیں کبھی طوفان میں سطح سے اوپر نہیں اٹھتیں'' مقدسی ۱۸۴)

ایرانی سیاح ۱۰۴۷ء کی تحریر میں بحر لوط کا ان الفاظ میں حال لکھتا ہے:۔

''طبریاس کے جنوب میں بحر لوط (یا لوط علیہ السلام کی جھیل) واقع ہے۔ اس جھیل کا پانی نمک ہے اگرچہ طبریاس کی جھیل سے جو پانی آکے اس میں ملتا ہے وہ شیریں ہوتا ہے۔ آل لوط کے شہر اس کے کناروں پر آباد تھے مگر اب کوئی نشان انکا باقی نہیں رہا۔ ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ اس جھیل کے آب شور میں ایک قسم کا مادّہ ہے جو جھیل کے جھاگ سے از خود جمع ہو جاتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ اور شکل سانڈ کی بہتی لاش سے ملتی ہے۔ یہ مادّہ پتھر سے مشابہ ہے مگر اتنا سخت نہیں ہوتا۔ اس ملک کے لوگ اسے جمع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیتے ہیں اور شہر شہر بلکہ قریب کے ملکوں میں بھی بھیجتے ہیں۔ اگر درخت کی جڑ میں یہ بھر دیا جائے تو کوئی کیڑا اسے نقصان نہیں پہنچاتا۔ ان سب علاقوں میں درختوں کی جڑیں اسی طریق سے محفوظ رکھی جاتی ہیں اور اس قسم کے کیڑے مکوڑوں سے جو نیچے رینگتے ہیں'' باغوں کی حفاظت کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اس قول کی سچائی صرف اس شخص کی ثقاہت پر مبنی ہے جس نے مجھ سے یہ حال بیان کیا ورنہ خود میں نے یہ مشاہدہ نہیں کیا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اس مادّے کو عطار بھی خریدتے ہیں کیونکہ ان کی دانست میں وہ کیڑا جس کا نام نختہ ہے ان کی جڑی بوٹیوں کو خراب کر دیتا ہے اور اس سے فقط یہ مادّہ (حمرہ) انھیں بچاتا ہے'' (ناصر خسرو ۱۷ و ۱۸)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حمرہ کے بحر لوط کی سطح پر تیرتے وقت جو شکل ہوتی تھی اس کا جوزیفوس نے بھی قریب قریب ایسے ہی الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

''اس جھیل سے مختلف مقامات پر رال کے سیاہ ڈھیر برآمد ہوتے ہیں جو سطح پر تیرتے رہتے ہیں اور صورت اور جسامت میں بے سر کے سانڈوں سے مشابہ نظر آتے ہیں'' (چہارم - ۸، ۴)

۶۶

پانی کے بودار ہونے کی نسبت، لفٹنٹ لنچ نے جس کا ان گدی کے مقام پر پڑاؤ تھا ''کبریت آمیز ہیڈروجن کی سخت بو'' اور ''رات کے وقت گندھک کی سرانڈ'' کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ ''گویا

باب دوم

تیلیا، تلخ اور بدمزہ تھا لیکن اس میں مطلق بُو نہ تھی" اصل یہ ہے کہ وہ بُو ان گا زوں سے آتی ہے جو ساحلی چشموں سے اٹھتی رہتی ہیں؛

ادریسی لکھتا ہے کہ "وہ بحیرۂ زغر کو بحیرۂ صادوم وغاموربھی کہتے ہیں اور یہ دونوں آلِ لوط کے شہر تھے جنھیں خدا نے ایسا الٹ دیا کہ وہاں یہ بودار جھیل بن گئی ۔ اسے بحیرۂ میتہ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں کوئی چیز، کیا مچھلی اور کیا جانور، زندہ نہیں پائی جاتی نہ اور کوئی ذی حیات ۔ جو دوسرے رواں یا بند پانی میں ہوتے ہیں ۔ اس جھیل کا پانی گرم اور بدبُودار ہے اس پر چھوٹے چھوٹے جہاز چلتے رہتے ہیں جو غلہ اور مختلف قسم کی کھجوریں زغر اور الذارہ سے ریحا یا غور کی دوسری ولایتوں میں لاتے اور لیجاتے ہیں ۔ بحر لوط کا طول ساٹھ میل اور عرض چالیس میل ہے" (ادریسی ۳)

یاقوت لکھتا ہے کہ "اس جھیل کا تعفن سخت مکروہ ہوتا ہے ۔ اور بعض سنین میں ایسی وبائی ہوا ملک پر چلتی ہے کہ آدمی یا جانور ہر قسم کے ذی حیات کے لیے مہلک ہوتی ہے اس کے باعث قریب کے جملہ دیہات کی آبادی ایک مدت تک کم رہ جاتی ہے ۔ پھر دوسرے لوگ جنھیں جان کی پروا نہیں دوبارہ یہاں آکے بس جاتے ہیں ۔ یہ منحوس جھیل ہے کیونکہ یہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا ۔ کوئی چیز جو اس کے پانی میں گرے بیکار ہوجاتی ہے ۔ چنانچہ ایندھن تک خراب ہوتا ہے اور جو لکڑی پانی سے ساحل پر آجاتی ہے، وہ جلتی تک نہیں ۔ ابن الفقیہ نے لکھا ہے کہ اگر آدمی اس میں گرے تو ڈوب نہیں سکتا بلکہ اس وقت تک تیرتا رہتا ہے کہ دم نکل جائے" (یاقوت ۔ اوّل، ۵۱۶ ۔ سوم ۔ ۸۲۲ ۔ مراصد اوّل، ۱۳۲)

دمشقی لکھتا ہے کہ "لوگوں کی (بحر لوط کے) پانی غائب ہوجانے کی نسبت مختلف رائیں ہیں ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا پانی کسی دور کے ملک میں نکلتا اور

۶۷

وہاں کی زمینوں کو سیراب و شاداب کرتا ہے اور وہاں اسے پی بھی سکتے ہیں ۔ ان لوگوں کے قول کے بموجب، یہ ملک یہاں سے دو ماہ کی مسافت پر واقع ہے کچھ بعض کہتے ہیں کہ جھیل کے ہر طرف تہ زمین نہایت گرم ہے اور اس کے

نیچے جلتی گندھک کے چشموں کے طبقے ہیں جن سے برابر ابخرہ نکلتے رہتے ہیں اور پانی کو بھی ہوا میں اڑا کے ایک خاص سطح سے اوپر نہیں چڑھنے دیتے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ زمین کے اندر سے پانی نکلنے کا راستہ ہے جس کے ذریعہ یہاں کا پانی بحر قلزم سے جا ملتا ہے۔ اور بعض کا عقیدہ ہے کہ اس جھیل کی تھاہ ہی نہیں بلکہ اس کے نیچے طبقہ اسفل تک جس پر زمین قائم ہے راستہ بنا ہوا ہے۔ ان سب اقوال کی حقیقت کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہی جھیل ہے جس سے حمرہ نکلتے ہیں۔ اس میں کوئی ذی حیات نہیں اور کناروں پر کسی قسم کی نباتات پیدا نہیں ہوتی" (دمشقی - ۱۰۸)

بحیرۂ طبریہ؛ مقدسی کے زمانے میں جیسا کہ آگے (باب ہشتم "طبریہ" کے حال میں) آئے گا یہ جھیل کشتیوں سے جو ساحل کے مواضع کی پیداوار اور تجارتی سامان لاتی لیجاتی تھیں پٹی رہتی تھی؛

یاقوت لکھتا ہے کہ "بحیرۂ طبریہ کا طول بارہ میل اور عرض چھ میل کے قریب ہے۔ یہ ایک وسیع تالاب سے مشابہ ہے جس کے چاروں طرف پہاڑ کھڑے ہیں۔ بہت سی ندیاں اس میں گرتی ہیں اور شہر طبریہ اس کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ یہ یروشلم سے کم و بیش پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ اردن کبیر یا بالائی اس میں گرتا ہے اور وہ ندیاں بھی جو نابلس کے ضلعے سے آتی ہیں۔ اس جھیل سے ایک بڑی ندی بہی ہے جسے اردن صغیر (یا زیرین) کہتے ہیں اور جو غور کو سیراب کر کے ریحا کے متصل بحر لوط میں جا گرتی ہے۔ بحیرۂ طبریہ کے وسط میں ایک چٹان نکلی ہوئی ہے جس پر لوگ کہتے ہیں کہ سلیمان ابن داود علیہما السلام کا مقبرہ ہے۔ اسی جھیل کے پانی کا نیچے اتر جانا مسیح دجال کے آنے کی ایک علامت ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس وقت اس کا پانی غائب ہو جائیگا تو یاجوج ماجوج کی قوم کا ایک آدمی کہیگا کہ یقیناً اس کے اور آگے پانی موجود رہی" اور پھر وہ سب مل کر بیت المقدس پر بڑھیں گے۔ اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام الصخرہ پر کھڑے ہوئے نمودار ہوں گے اور سچے مومن انھیں گھیرے ہوئے ہوں گے جن میں وہ وعظ فرمائیں گے۔ پھر قبیلہ جذام یا دوسرے

باب دوم

قول کے بموجب غسّان کا ایک شخص یاجوج و ماجوج کے مقابلے میں نکلے گا اور انھیں شکست فاش دے گا اور وہ بالکل پراگندہ ہوجائیں گے" (یاقوت اول - ۵۱۵ - مراصد - اول، ۱۳۱)

۶۸ ۱۳۲۱ء میں ابوالفدا لکھتا ہے کہ "بحیرۂ طبریہ، غور کے بالائی سرے پر واقع ہے اس میں یردن، جسے نہر الشریعہ کہتے ہیں اور جو بحیرۂ بانیاس سے نکل کے آتی ہے، گرتی ہے۔ جھیل کا نام شہر طبریہ پر ہے جو اس کے جنوب مغربی کنارے پر آباد تھا اور اب ویران ہوگیا ہے۔ جھیل کا محیط دو دن کی مسافت کے مساوی ہے اور اس کی سطح نرسلون وغیرہ سے بالکل خالی ہے" (صفحہ ۳۹)

بحیرۂ قدس یا بانیاس، جھیل حولہ جسے کتاب مقدس میں "آب مَردم" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، قدیم عربی جغرافیہ نویسوں میں قدس (اکیڈش یا نیفتالی) کے نام پر، جو اس کی غربی بلندی پر آباد تھا، بحیرۂ قدس موسوم ہے یا بحیرۂ بانیاس (بانیاس = سیزریا فلپی) کہ اس نام کا شہر بھی کچھ فاصلے پر شمال میں واقع تھا۔

مقدسی نے ۹۸۵ء میں اسے چھوٹی سی جھیل بتایا ہے جو قدس سے ایک گھنٹہ کے راستے پر واقع ہے اور اس کا پانی بحیرۂ طبریہ میں بہہ جاتا ہے۔ جھیل بنانے کی غرض سے یہاں دریا کے کنارے لوگوں نے ایک قابل دید پختہ بند بنا دیا ہے کہ پانی حدود کے اندر رہے کناروں پر حلفا نرسل کے پولے کھڑے ہیں اور یہی لوگوں کی وجہ معاش ہیں کہ انہی کی وہ رسیاں بٹتے اور حصیر بنتے ہیں۔ اس جھیل میں بہت قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں، خاص کر وہ جسے بنّی کہتے ہیں اور جو عراق عرب کے "کثیر الذمہ" شہر واسط سے لائی گئی تھیں" (۱۶۱)

یہاں یہ لکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جس نرسل (یا غابہ) حلفا نامی کا اوپر ذکر آیا، وہ بلاشبہ "پے پی روس اینٹی کورم" ہے جسے فلسطین کے فلاح ابجل بابور کہتے ہیں (ملاحظہ ہو Canon Tristram, "Fauna and Flora of Palestine" P.E.F. p 438) لیکن لین اپنی لغت ("حلفا") میں لکھتا ہے

باب دوم

کہ اسی نرسل کا علمی نام (Poa Multiflora) یا (P. Cynosuroides) ہے"۔

برگرین کی تحقیقات کی رو سے بنّی آج کل اس مچھلی کا نام ہے جسے انگریزی میں "کارپ" (= روہو) کہتے ہیں (دیکھو اس کی کتاب Guide Arabe) (Vulgaire) اور اس کا بیان ہے کہ یہ بحر جلیل اور فرات میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مگر سر آر برٹن اپنے ترجمہ الف لیلہ کی آٹھویں جلد (صفحہ ۱۰۷) کے ایک حاشیے میں لکھتا ہے کہ بنّی دراصل "Cyprinus Binni" ہے جو "باربل" (چھوٹا مچھلی ؟) سے قدرے بڑی چمکیلے نقرئی پروں اور لطیف گوشت کی مچھلی ہوتی ہے"۔

ابوالفدا لکھتا ہے کہ "بحیرۂ بانیاس اپنے ہمنام شہر کے قریب (جو ولایت دمشق میں ہے) واقع ہے۔ یہ ایسی جھیل ہے کہ اس کے گرد نشیبی زمینیں ہیں اور ان میں نرسلوں کی کثرت ہے۔ قریب کے پہاڑوں کے بہت سے ندی نالے اس جھیل میں گرتے ہیں۔ رود اردن جسے الشریعہ کہتے ہیں اس جھیل سے نکلتی اور بحیرۂ طبریہ میں جا گرتی ہے" (صفحہ ۴۰)

بحیرۂ مرج ؛ دمشق کی جھیلوں کو یاقوت نے بحیرۃ المرج یعنی "چراگاہ کی جھیلوں" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "یہ دمشق کے مشرق میں پانچ فرسخ کے فاصلے پر، غوطہ کے پار اور اس میدان کے نزدیک واقع ہے جسے مرج راحت کہتے ہیں۔ دمشق کی ندیوں (بردا وغیرہا) کا زائد پانی بہکر ان میں جمع ہوتا ہے" (اوّل، ۵۱۶۔ مراصد اوّل، ۱۳۲)

بحیرۃ البقاع ؛ نشیبی شام کے میدان کی جھیل کو ابوالفدا بحیرۃ البقاع کے نام سے یاد کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ "یہ بند پانی کی جھیل گھانس اور نرسلوں سے بھری ہوئی ہے اور بعلبک کے مغرب میں ایک روز کے راستے پر واقع ہے" (۴۰)

واضح ہو کہ اس جھیل کا پانی نکال دیا گیا اور اب اس کا وجود باقی نہیں ہے۔ ابوالفدا کے پیرس والے قلمی نسخے کے حاشئے پر یہ دلچسپ تحریر لکھی ہے :-

باب دوم

بحیرۃ البقاع ایک نشیب تھا جس میں کثرت سے جھونڈ پہلے تھے۔ یہ کرک نوح اور عین البحر کے درمیان بعلبک کے میدان موسومہ بقاع میں واقع تھی امیر سیف الدین دنکز نے خزانۂ عامرہ سے اسے اپنے لئے خریدا اور بدر روئیں کھدوا کر اس کا پانی رودِ لیطہ میں خارج کر دیا۔ پھر زمین صاف کرا کے اس میں بیس گانوں بسا دئے جن کی فصلیں اس قدر عمدہ اور زرخیز تھیں کہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ یہ خربوزہ، اور کھیرے وغیرہ کی فصلیں تھیں۔ کاشتکار مالا مال اور نہایت آسودہ حال ہو گئے۔ انھوں نے بڑے درخت نصب کئے کہ شہتیر تیار کریں اور چکیاں بنائیں۔ امیر سیف الدین کو جس شخص نے یہ کام کرنے کی تحریک دلائی وہ اسی علاقے کا ایک باشندہ سیف الدین ابن سلیج تھا۔ جس وقت ملک الناصر (سلطان مصر) نے سیف الدین پر ہاتھ ڈالا تو یہاں کے بہت سے گانوں بھی لے لئے اور شامی امیروں کو بطور جاگیر عطا کر دئے خود سیف الدین اور اسکے وارثوں کے پاس بہت کم کچھ باقی رہ گیا۔

جیسا کہ خود ابو الفدا کے وقائع (۷۴۰ھ ہجری) سے معلوم ہوتا ہے یہ سیف الدین ۱۳۲۰ء تا ۱۳۳۹ء تک شام کا والی تھا۔

بحیرۂ قدس یا حمص۔ بحیرۂ حمص کو شمالی کدشش کے نام پر بحیرۂ قدس بھی کہہ دیتے تھے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ " یہ حمص کے جنوب مغرب میں مگر قریب ہی، جبل لبنان کی طرف واقع ہے۔ طول ۱۲ میل اور عرض چار میل ہے۔ اردگرد کی پہاڑیوں کے ندی نالے اس میں گرتے ہیں اور انھی کے باعث رودِ عاصی میں پانی چڑھتا ہے اور وہ جھیل کے آگے بہنے لگتا ہے۔ اسی دریا پر حماۃ اور شیزر واقع ہیں۔"

(اول، ۵۱۶۔ مراصد۔ اول، ۱۳۲)

ابو الفدا لکھتا ہے کہ " بحیرۂ قدس کو حمص کی جھیل بھی کہتے ہیں۔ شمال سے جنوب کو اس کا طول ایک منزل کے قریب قریب تیسرے حصے کے برابر ہے اور عرض پشتے کے برابر ہے جس کا حال ہم بیان کرتے ہیں۔ یہ پشتہ نہر الارنت (عاصی) کے وار پار ڈالا ہے اور جھیل کی شمالی حد بھی یہی ہے۔ اسے قدیم طرزِ عمارت میں پتھر سے بنایا ہے اور لوگ سکندر اعظم سے اس کی تعمیر منسوب

کرتے ہیں۔ پشتے کے اوپر وسط میں سنگ سیاہ کے دو بُرج بنے ہوئے ہیں۔ پشتے کی چوڑائی ۱۸½ ہاتھ اور مشرق سے مغرب تک لمبائی ۱۲۸۷ ہاتھ ہے۔ اسی پشتے نے اس کثیر پانی کو اندر روک رکھا ہے اور اگر یہ ٹوٹ جائے تو پانی باہر نکل جائے اور جھیل دریا بن کر خود غائب ہو جائے۔ حمص کے مغرب میں ایک دن کی راہ پر اور مسطح میدان میں یہ جھیل واقع ہے۔ یہاں لوگ کثرت سے مچھلیاں پکڑتے ہیں" (۴۰)

بحیرۂ افامیہ "ابو الفدا ۱۳۲۱ء میں لکھتا ہے کہ "اس مجموعے میں کئی ساحلی جھیلیں (بطیحہ) شامل ہیں جنہیں جھنڈ پودوں سے بھرے ہوئے گڑھے ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے بطیحے میں دو جھیلیں ہیں۔ ایک جنوب میں اور دوسری شمال میں۔ ان میں پانی نہر الارنت سے آتا ہے جو جنوب کی جانب سے دلدلوں میں داخل ہوتا اور یہ جھیلیں بنا دیتا ہے۔ پھر یہ دریا دلدلوں اور نشیبوں سے بہ کر شمال کی طرف آگے نکل جاتا ہے۔ ان دو میں سے جنوب کی جھیل خاص بحیرۂ افامیہ کہلاتی ہے اس کی چوڑائی نصف فرسخ اور گہرائی آدمی کی قد سے بھی کم ہے لیکن تہ اس قدر نرم ہے کہ آدمی اس پر قائم نہیں رہ سکتا ہر طرف اور سطح پر نرسل سرکنڈے پھیلے ہوئے ہیں۔ وسط میں نرسلوں کا بڑا جھنڈ ہے اور بردی گھاس کا جس کی وجہ سے جھیل کا ایک حصّہ چھپ گیا ہے اور آنکھ سے پورا نظر نہیں آتا۔ ان جھیلوں پر قسم قسم کے پرندے جیسے بط اور وہ انواع جنہیں عزیرہ اور صنغ کہتے ہیں اور حواصل اور قازیں وغیرہ وغیرہ نیز الجلنش (؟) اور الابی دانیات (یا سفید مرغابی) اور اسی طرح دوسرے آبی جانور رہتے ہیں۔ کسی دوسری جھیل یا تلاؤ پر جس کا مجھے علم ہے، اتنی قسم کے پرند نہیں پائے جاتے۔ موسم بہار میں یہ جھیلیں نیلوفر سے اس طرح ڈھک جاتی ہیں کہ سطح آب بالکل نظر نہیں آتی، اور ان پتوں اور پھولوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانی چھپا رہتا ہے۔ انہی کے درمیان سے کشتیاں اپنا راستہ نکالتی جاتی ہیں"

دوسری بڑی جھیل (یا بطیحہ) کو پہلی سے ایک دلدل نے جدا کیا ہے

باب دوم

جس پر نرسل کا بیلہ ہے اور بیچ میں پانی کا راستہ کاٹ دیا ہے کہ جنوبی جھیل سے کشتیاں اس شمالی جھیل میں جا سکیں۔ یہ شمالی بطیحہ حصن برزیہ کے ضلعے میں داخل ہے اسے عیسائیوں کی جھیل (بحیرۂ نصاری) کہتے ہیں کیونکہ اس کے شمالی حصّوں میں تختوں پر جھونپڑیاں بنا کے عیسائی ماہی گیر رہتے ہیں۔ یہ جھیل افامیہ سے بھی چار گنی زیادہ وسیع ہے۔ اس کے وسط میں خشک زمین بھی نکل آئی ہے۔ تمام شمالی اور جنوبی کناروں پر نیلوفر پیدا ہوتا ہے اور یہاں بھی پانی کے وہ سب پرندے پائے جاتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ وہ بام مچھلی جسے الانکلیس کہتے ہیں، یہاں پائی جاتی ہے ؛

یہ جھیلیں قصبۂ افامیہ کے مغرب میں ذرا شمال کو جھکی ہوئی واقع ہیں اور کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں" (ابوالفدا - ۴۰)

بحیرۂ انطاکیہ[۱] ؛ یاقوت لکھتا ہے کہ یہ جھیل انطاکیہ سے تین دن کی راہ پر واقع ہے۔ یہ آب شیریں کی جھیل ہے۔ اس کا طول ۲۰ اور عرض ۷ میل ہے۔ یہ اس علاقے میں واقع ہے جسے العمق (نشیب) کہتے ہیں" یاقوت اول ۵۱۴ - مراصد - اول ، ۱۳۱)

ابوالفدا نے لکھا ہے کہ "بحیرۂ انطاکیہ اس نام کے شہر اور بغراس و حارم کے درمیان اس مسطح میدان میں واقع ہے جسے العمق کہتے ہیں۔ یہ ضلع حلب کا علاقہ ہے اور اس کے مغرب میں بارہ دن کی راہ پر یہ جھیل ہے شمال سے تین ندیاں اس میں آکر گرتی ہیں۔ ان میں سب سے مشرقی نہر العفرین ہے اور سب سے مغربی جو دربساک کے نیچے سے بہتی ہے نہر الاسود یا کالی ندی ہے اور تیسری جو ان دونوں کے درمیان بہتی ہے، نہر یغرا ہے۔ یغرا اسکے کنارے کے ایک گاؤں کا نام ہے جس میں عیسائی بستے ہیں۔ جھیل کا محیط تقریباً ایک دن کی راہ ہے۔ یہ نرسلوں سے معمور ہے اور یہاں بھی اسی طرح مچھلی اور پرند پائے جاتے ہیں جیسے جھیل افامیہ کے ذکر میں ہم نے اوپر بیان کئے۔

---

[۱] آجکل اسے "اک دنیز" کہتے ہیں ؛

باب دوم

مذکورۂ بالا تینوں دریا، یعنی نہر الاسود، نہر یغرا اور عفرین پہلے آپس میں مل کر ایک دھارا بنتے ہیں اور پھر شمالی ساحل سے اس جھیل میں گرتے ہیں۔ پھر جنوبی ساحل سے ایک دریا نکل کر جسر الحدید کے نیچے نہر عاصی سے جا ملتا ہے اور خود یہ پل انطاکیہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ جھیل شہر انطاکیہ کے شمال میں واقع ہے۔" (ابو الفدا۔ ۴۱)

بحیرۂ یغرا: اس جھیل کا یاقوت نے ذکر کیا ہے اور غالباً یہ بحیرۂ انطاکیہ کے شمال مشرق کی چھوٹی جھیلوں میں سے ایک تھی۔ یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ انطاکیہ اور ثغور کے مابین واقع ہے اور اس میں نہر عاصی، نہر عفرین اور نہر الاسود کا پانی جمع ہوتا ہے۔ آخر الذکر دو ندیاں مرعش کی نواح سے آتی ہیں۔ اس جھیل کو ایک خاص قسم کی بام مچھلی کی کثرت کے باعث (جس کا دوسرا عرف الجرّی ہے) بحیرۂ سلور بھی کہتے ہیں"۔ (یاقوت، اول، ۵۱۴۔ مراصد۔ اول، ۱۲۱)

پہاڑ

الطور: ابو الفدا لکھتا ہے کہ "عبرانی زبان میں "طور" عام طور پر پہاڑ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاحاً یہ خاص خاص پہاڑوں کا نام ہوگیا ہے۔ چنانچہ طور زیتا (زیتون کا پہاڑ) یروشلم کے قریب وہ پہاڑی ہے جس پر روایت عام کی بنا جب ستر ہزار انبیا بھوک سے ہلاک ہوئے۔ طبریہ کے اوپر جو پہاڑ

---

۱ حالیہ نقشوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ایسا نہیں ہے نہر الاسود جسے آجکل ترکی میں "کارا سو" کہتے ہیں اگرچہ اس کے معنی بھی وہی کالی ندی کے ہیں، شمال کو جاکر اک وینیز میں گرتی ہے لیکن عفرین (ع مکسور یا مفتوح) ایک دوسرے راستے سے شرق کی طرف بہی ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

۲ بظاہر یہ بحیرۂ انطاکیہ کوئی دوسری جھیل ہے اور وہ نہیں ہے جس کا عربی متن میں دو صفحے پہلے ذکر آیا ہے۔

باب دوم

واقع ہے (کوہ تابور) اسے بھی خصوصیت کے ساتھ اس نام سے موسوم کرتے ہیں۔
طور سینا کے مقام کے بارے میں گفتگو ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایلہ کے قریب کا پہاڑ ہے اور بعض کے نزدیک یہ شام میں واقع ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "سینا" کی وجہ تسمیہ یہاں کے پتھر ہیں اور یا وہ درخت ہیں جو اس پر ہوتے ہیں[۱]۔ طور ہارون (= کوہ ہور) وہ بلند پہاڑ ہے جو بیت المقدس کے جنوبی علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ ہارون علیہ السلام کا مقبرہ اس کی چوٹی پر ہے" (ابو الفدا - ۶۹)

طور سینا : مقدسی لکھتا ہے کہ "طور سینا بحر قلزم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک گانوں الامن[۲] نامی سے اس کے اوپر جاتے ہیں اور یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہاں خاصے میٹھے پانی کے بارہ چشمے موجود ہیں اور کوہ سینا کے اوپر تک دو دن کا راستہ ہے۔ کوہ سینا میں عیسائیوں کا ایک دیر ہے اور اس کے گرد مزروعہ کھیت ہیں جن میں وہ زیتون ہوتا ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قران شریف میں اس کا ذکر کیا (سورۂ نور۔ آیہ ۳۵) اور فرمایا کہ "وہ مبارک درخت، ایک زیتون، جو نہ شرقی ہے نہ غربی" اور ان درختوں کے پھل تحفۃً بادشاہوں کے پاس بھیجے جاتے ہیں" (مقدسی ۱۷۹)

ادریسی لکھتا ہے کہ جبل طور پر فاران (Paran) سے پہنچتے ہیں۔ یہ بحر قلزم کے قریب واقع ہے اور اس کا سلسلہ سمندر کے متوازی چلا گیا ہے۔

---

[۱] اسٹینلی اپنی کتاب "سینائی اینڈ پلیس ٹائن" (صفحہ ۷ مطبوعہ ۱۸۵۶ء) میں بیان کرتا ہے کہ قدیم "سینائی" کی سب سے قرین صحت وجہ تسمیہ "سِنَہ" (یعنی ابر کہ معلوم ہوتی ہے جو ہمیں معلوم ہے کہ اس زمانہ میں یہاں بکثرت ہوتی تھی" اس زمانے سے مراد عہد توارۃ ہے۔

[۲] عجب نہیں کہ یہ لفظ "ایلیم" کی بگڑی ہوئی معرب شکل ہو۔ کیونکہ بنی اسرائیل "دشت سین" میں آوارہ ہونے سے قبل، جو ایلیم اور کوہ سینا کے درمیان واقع ہے" اسی ایلیم میں خیمہ زن تھے۔ دیکھو کتاب الاخراج۔ پانزدہم آیہ ۲۷۔

دونوں کے درمیان میں وہ راستہ ہے جس پر بہت آمد و رفت رہتی ہے۔ یہ بلند پہاڑ ہے جس پر درجہ بدرجہ چڑھا جاتا ہے اور چوٹی پر مسجد بنی ہوئی ہے جس میں بند پانی کا ایک کنواں ہے کہ آنے جانے والے پانی پئیں" (ادریسی - ۲)

یاقوت کا بیان ہے کہ "طور یا طور سینا مدائن (الغرب) کے قریب کا وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دوبارہ اس وقت کلام فرمایا جبکہ وہ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر لائے۔ "طور سینا" بنطیوں کی زبان کا لفظ ہے۔ اس پر ہر جگہ درخت اور نباتات پائی جاتی ہے اور یہ ایلہ کے اوپر کے سلسلۂ کوہ کی توسیع ہے" (سوم ۵۵۵۔ مراصد۔ دوم - ۲۱۴)

طور ہارون (کوہ ہور) یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ بلند اور مقدس پہاڑ یروشلم کے جنوب میں واقع ہے۔ ہارونؑ اس پر اپنے بھائی موسیٰؑ کے ساتھ چڑھے تھے مگر واپس نہ آئے تب بنی اسرائیلؑ نے حضرت موسیٰؑ پر تہمت لگائی کہ بھائی کو مار ڈالا لیکن آنحضرت نے پہاڑ کی سطح چوٹی پر وہ جنازہ انھیں دکھادیا جس میں حضرت ہارونؑ کی نعش تھی۔ اس وقت سے یہ پہاڑ حضرت ہارونؑ کے نام سے موسوم ہو گیا" (یاقوت۔ سوم ۵۵۹ ؛ مراصد۔ دوم ۲۱۵)

مؤرخ مسعودی بہت پہلے یعنی ۹۴۳ء میں تحریر کرتا ہے کہ "ہارونؑ نے جبل مآب پر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ اور یہ شراۃ کے ضلعے کے پہاڑوں میں ایک پہاڑ سینا کی طرف واقع ہے۔ ان کا مقبرہ مشہور ہے۔ یہ ایک زمین دوز عادیت (یعنی قدیم) غار میں بنا ہوا ہے جہاں سے بعض بعض راتوں کو بڑے زور کی آواز آتی ہے جو ہر ذی حیات کے لئے ہول انگیز ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ اس غار میں رکھدیا گیا تھا۔ جن لوگوں نے اس مقام کو دیکھا اور یہاں کے حالات بیان کئے وہ بہت حیرت انگیز باتیں سناتے ہیں" (مسعودی۔ اول، ۹۴)

طور زیتا یا جبل زیتا (زیتون کا پہاڑ) یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ ایک

علاوہ فسانہ جی ویل کی "Biblische Legenden" میں تفصیل سے مرقوم ہے۔ اس کا ماخذ مدراش تھا۔

مقدس پہاڑ ہے اور مشرق کی طرف یروشلم کے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے۔ اس کو شہر سے وادیٔ جہنم علیحدہ کرتی ہے۔ عین سلوان اسی وادی میں ہے اور پل صراط اسی وادی پر قائم کیا جائے گا۔ اس پہاڑ پر حضرت عمرؓ نے نماز پڑھی۔ ستر ہزار انبیا کے مقبرے جو یہاں فوت ہوئے، پہاڑ میں نظر آتے ہیں اور یہیں سے مسیحؑ آسمان پر چڑھے تھے" (سوم ۵۸ ؛ مراصد۔ دوم ۲۱۵)

جبل الشراہ: یہ ضلع بلقا کے جنوب میں واقع ہے اس کے عقب میں صحرا ہے جس میں اب مستقل فلاحین بسے ہوئے ہیں۔ (ابوالفداء ۲۲۸)

جبل الخمر: یاقوت لکھتا ہے کہ "ان پہاڑوں کا احادیث نبوی میں ذکر آتا ہے۔ یہ یروشلم کے پہاڑ ہیں مگر انگور کی کثرت کے باعث انھیں جبل الخمر کہنے لگے" (دوم ۲۱ ؛ مراصد۔ اول ۲۳۸)

الطور: (= "اِبال وگری زیم") یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ نابلس کے اوپر وہ مقدس پہاڑ ہے جہاں سامری لوگ زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ یہودی بھی اس کا بہت احترام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی پر حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا تھا کہ حضرت اسحٰقؑ[1] کو قربان کریں۔ توراۃ میں بھی یہ نام آیا ہے۔

جبل الطور (= "ٹیبور") اتفاقی طور پر اس پہاڑ کا ابن جبیر نے ۱۱۸۵ء میں ذکر کیا ہے کہ یہ طبریہ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ لیکن مصنف خود اس پہاڑ پر نہیں آیا۔ (صفحہ ۳۱۳)

یاقوت لکھتا ہے کہ الطور تبر، ولایت اُردن میں طبریہ کے شمال کا پہاڑ ہے اور اس شہر سے چار فرسخ پر واقع ہے۔ اس کی چوٹی پر وسیع اور مضبوط کلیسا بنا ہوا ہے یہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ سلطان صلاح الدین کے بھائی الملک العادل ابوبکر کے فرزند الملک المعتصم عیسیٰ نے یہاں مستحکم قلعہ بنا کے اس میں خزانہ رکھا لیکن ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء) میں جب فرنگی سمندر پار سے آگئے بیت المقدس کو واپس لینے کی پھر

---

[1] مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور عقلی اور نقلی دلائل سے بھی ثابت ہے کہ قربان کرنے کا حکم اسمٰعیلؑ کی نسبت دیا گیا تھا۔ مترجم۔

باب دوم

کوشش کریں تو ملک نے اس قلعے کو توڑنے کا حکم دیا اور یہ ابتک اسی حال میں پڑا ہے"۔ (یاقوت۔ سوم، ۵۵۵۔ مراصد، دوم، ۲۱۵)

علی ہروی نے اس طور (تبر) کو طور سینا سے خلط ملط کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو شریعت اس پہاڑ پر عطا ہوئی جو طبریہ کے قریب ہے"۔ (قلمی نسخہ، اوکسفورڈ۔ ورق ۳۱)

جبل عاملہ ـ بالائے جلیل میں اس نام کے پہاڑ کا ذکر آگے آئیگا لیکن ایک اور کوہستانی خطہ دمشق کے شمال میں بھی اس نام سے موسوم تھا اور اسی کا یاقوت نے (۱۲۲۵ء میں) کفرلاثا (یا لہثا) کے نام سے حال لکھا ہے (دیکھو اس کتاب کا دوسرا حصہ)

۹۸۵ء میں مقدسی نے اس کے متعلق یہ تحریر کیا ہے:۔ "جبل عاملہ ایک کوہستانی ضلع ہے جس میں بہت سے عمدہ گاؤں آباد ہیں جہاں انگور وغیرہ میووں اور زیتون کی کاشت ہوتی ہے۔ بہت سے چشمے بھی ہیں۔ کھیتوں کو بارش سیراب کرتی ہے۔ یہ ضلع سمندر کے اوپر چھایا ہوا ہے اور کوہستان لبنان سے لاچلا گیا ہے"۔ (مقدسی ۱۶۲)

اصل میں اس ضلع کا یہ نام قبیلہ بنی عاملہ سے پڑا ہے جو اسلامی فتوحات کے ابتدائی ایام میں یہاں بسا دیا گیا تھا۔ اسے قریب قریب وہی علاقہ سمجھیے جسے بالائی جلیل بھی کہتے ہیں۔ محاربات صلیبی کے زمانے میں یہ قبیلہ اٹھ کر شمال میں چلا گیا اور اس وقت سے حمص و دمشق کے درمیان کا خطہ جبل عاملہ کہلانے لگا جیسا کہ یاقوت نے لکھا ہے اور ذیل کے قول سے بھی ثابت ہے: ۱۳۰۰ء میں دمشقی لکھتا ہے کہ "ولایت صفد میں جبل عاملہ کا ضلع تاکستان، زیتون، خرنوب اور تارپین کے درخت سے معمور ہے۔ اس کے باشندے رافضی اور امامیہ فرقوں کے ہیں۔ اسی ولایت میں جبل جبیع[1] واقع ہے۔ اور یہاں بھی اسی قسم کی آبادی ہے"۔

---

[1] یہ نام توراۃ کے نام "جبیہ" سے مشابہ ہے جس کے معنی "کوہانی" کے ہیں اور پہاڑیوں کو عام طور پر اس سے موسوم کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو اسٹینلی کی کتاب "سینائی"، ضمیمہ ۲۵

یہ بلند کوہستانی سرزمین ہے اور اس میں چشموں، تاکستانوں اور میووں کی کثرت ہے۔ اسی کے نزدیک جبل جزین ہے جس پر ایک قلعہ اور اس کے گرد اقطاع و اراضی موجود ہیں۔ اس علاقے میں بھی روافض اور امامیہ آباد ہیں جبل البقیعہ اپنے ہمنام گاؤں البقیعہ کے نام سے موسوم ہے اور یہاں کے جوئے بار اور بھی مشہور ہیں۔ اس قطعے میں زیتون کی اراضی، میوے اور تاکستان کثرت سے ہیں۔ جبل صفد کے اوپر جبل الزابود چھایا ہوا ہے۔ الزابود ایک گاؤں کا نام اور اس کے علاوہ بھی نواح میں بہت سے دیہات آباد ہیں۔ ان دیہات کے لوگ دروز، حاکمی اور امری فرقوں کے پیرو ہیں" (دمشقی - ۲۱۱)

ابوالفدا لکھتا ہے کہ جبل عاملہ ساحل کے مشرق کی طرف واقع اور جنوب میں صور تک پھیلا ہوا ہے قلعہ الشکیف (Arnon) یہیں واقع ہے جسکے باشندے پہلے فرنگیوں کے ماتحت تھے اور ان سے بیبارس نے اس قلعے کو چھینا" (۲۲۸)

جبل عوف: ابوالفدا ۱۳۲۱ء میں لکھتا ہے کہ "یہ ضلع جبل عاملہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ان دونوں اضلاع کے باشندے باغی ہو رہے تھے حتیٰ کہ سلطان صلاح الدین کے ایک امیر عثمان نے قلعہ عجلون بنایا اور انھیں قابو میں لایا۔ یہ نہایت مستحکم قلعہ ہے اور غور اردن اس کی زد میں ہے۔ اس کا تمام علاقہ بہت سرسبز ہے۔ ہر جگہ درختوں کی کثرت ہے اور ندیوں سے خوب سیراب ہوتا ہے۔" (ابوالفدا - ۲۲۸ - نیز ملاحظہ ہو "عجلون")

جبل صدیقا: مقدسی ۹۸۵ء میں تحریر کرتا ہے کہ "یہ پہاڑ صور، قدس اور صیدا کے مابین واقع ہیں۔ یہاں صدیقا کی قبر دکھاتے ہیں۔ شعبان کی چودھویں تاریخ رسم ہے کہ کثرت سے آس پاس کے لوگ اس قبر کی زیارت کے واسطے جمع ہوتے ہیں اور سلطان کا نائب بھی موجود ہوتا ہے ایک مرتبہ یہ اتفاق ہوا کہ میں اس علاقہ میں سفر کر رہا تھا اور وسط شعبان میں جمعہ کا دن آگیا۔ قاضی ابوالقاسم ابن العباس نے مجھ سے فرمایا کہ جمعے کا خطبہ دو۔ خطبے کے دوران میں میں نے لوگوں کو سمجھایا کہ اس مسجد کی درستی کریں اس میں کامیابی ہوئی یعنی بعد میں ایسا ہی

عمل میں آیا اور اندر ایک منبر بنوا دیا گیا۔ میں نے سنا ہے کہ اگر کتا کسی جنگلی جانور کے تعقب میں اس مزار کی حدود تک آجاتا ہے تو دوڑتے دوڑتے ایک دم رک جاتا ہے۔ اسی قسم کی اور روایتیں بھی بیان کی جاتی ہیں" (مقدسی۔ ۱۸۸)

جبل الجولان: مقدسی لکھتا ہے کہ "یہ اردن کے پار کوہستان لبنان کے مخالف ہاتھ کو اور دمشق کی جانب واقع ہیں۔ اسی جگہ میری شاہ ابو اسحق البلوطی سے ملاقات ہوئی! اس کے ہمراہ چالیس مرید تھے اور ان سب کا لباس کمبل (صوف) کا تھا (جیسا کہ تارک الدنیا لوگ پہنا کرتے ہیں) ان لوگوں کی ایک مسجد ہے جہاں نماز کے لیئے جمع ہوتے ہیں۔ میں نے ابو اسحق کو نہایت فاضل اور صاحب تقویٰ فقیہ پایا جو سفیان الثوری کے مسلک پر ہے۔ یہ لوگ شاہ بلوط کا پھل کھا کے پیٹ پالتے ہیں جو کھجور کے برابر بڑا مگر کڑوا ہوتا ہے۔ اسے دو ٹکڑے کر کے پانی میں بھگو دیتے ہیں کہ کسی قدر میٹھا ہو جائے۔ اس علاقے میں جنگلی جو بھی ہوتا ہے اسے لوگ بلوط پھل کے ساتھ ملا کے روٹی پکاتے ہیں" (مقدسی ۱۸۸)

جبل الجلیل: یعقوبی نے ۸۹۱ء میں لکھا ہے کہ اس پہاڑ کے باشندے قبیلۂ عاملہ کے عرب ہیں" (صفحہ۔ ۱۱۴)

یاقوت لکھتا ہے کہ "جبل الجلیل شام کے ساحل پر واقع اور حمص کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ نوح علیہ السلام کی جائے سکونت اسی پہاڑ میں، حمص کے قریب ایک گاؤں میں تھی جسے سحر کہتے ہیں۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ طوفان نوح یہیں آنا شروع ہوا۔ جبل الجلیل کا سلسلہ دمشق کے قریب تک بھی آتا ہے اور یہیں مسیح علیہ السلام نے وعظ فرمایا اور بشارت دی کہ یہ ضلع کبھی قحط کی مصیبت میں نہ پڑے گا" (یاقوت۔ دوم، ۱۱۰؛ مراصد۔ اول ۲۶۳)

جبل بنی ہلال: یاقوت لکھتا ہے کہ یہ دمشق کی ولایت حوران کے پہاڑ ہیں اس علاقے میں بہت سے دیہات آباد ہیں۔ انہی میں الملکیۃ نامی دہ گاؤں ہیں جہاں ایک چوبی تھالی دکھاتے اور بیان کرتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلعم

باب دوم

کی تھالی ہے۔ (دوم - ۲۲ - مراصد اوّل - ۲۳۹)

جبل لبنان: مقدسی کہتا ہے کہ "یہ پہاڑ جبل صدیقہ سے ملے ہوئے اور اس کے شمال کی طرف ساحل ساحل صیدا سے طرابلس تک سمندر کے متوازی چلے گئے ہیں۔ ان کی ڈھلانوں پر اشجار کی کثرت ہے اور میوے بافراط پائے جاتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں ہر جگہ پانی کے چھوٹے چشمے موجود ہیں اور جو لوگ عبادت کی غرض سے یہاں آتے ہیں۔ وہ ان کے کنارے پر پھوس کی سرکیاں ڈال لیتے ہیں۔ باشندوں کا گزارا پھلوں پر ہے اور بیلیں، سرکنڈے جنھیں "ایرانی بانس (قصب الفارسی)" کہتے ہیں اور اسی قسم کی سر و ٹنڈ پولیاں بیچ کر روپیہ بھی کماتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کچھ بہت نفع نہیں ہوتا" (مقدسی - ۱۶۰، ۱۸۸)

ابن الفقیہ لکھتا ہے کہ "جبال لبنان کا تعلق دمشق سے ہے اور ان میں تارک الدنیا مرتاض فقرا سکونت رکھتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کے پھل اور ترکاریاں کاشت کیجاتی ہیں اور ہر جگہ آب رواں کے چشمے موجود ہیں۔ پہاڑوں کا سلسلہ یونانیوں کی حدود تک چلا گیا ہے۔ لبنان کے سیب عجیب ہوتے ہیں کہ اس ضلعے سے لانے کے وقت ان میں پہاڑی سیبوں کی صرف شیرینی تو ہوتی ہے لیکن کوئی چاشنی یا خوشبو نہیں ہوتی مگر نہر البلیخ میں ڈالنے کے بعد ہی ان میں بہت اچھی مہک پیدا ہو جاتی ہے" (ابن الفقیہ - ۱۱۲، ۱۱۷)

۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے لکھا ہے کہ "لبنان کے پہاڑ اسمٰعیلیہ باطنیہ کے قلعوں سے پٹے پڑے ہیں۔ یہ سلسلۂ کوہ مسلمانوں اور فرنگیوں کے مابین حد فاصل ہے کیونکہ ان کے شمال میں انطاکیہ اور لاذقیہ وغیرہ شہر واقع ہیں جن پر عیسائیوں کا قبضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں دوبارہ مسلمانوں کے حوزۂ تصرف میں لائے!" (صفحہ ۲۵۷)

یاقوت لکھتا ہے کہ "لبنان کے پہاڑ حمص کے اوپر چھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کا آغاز مکہ معظمہ اور مدینہ مبارکہ کے درمیان مقام العرج سے ہوتا ہے اور وہ شام تک پھیلا ہوا ہے۔ جو ٹکڑا فلسطین میں ہے اسے جبل الحمل

کہتے ہیں۔ ولایت اُردن میں سلسلے کا نام جبل جلیل ہو گیا ہے، دمشق میں جبل سنیر، حلب، حماۃ اور حمص کے قریب ہی پہاڑ جبال لبنان کہلاتے ہیں۔ پھر یہی سلسلہ انطاکیہ اور المصیصہ تک چلا جاتا ہے جہاں اسے جبل لکام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے بھی آگے شمال میں یہ ملطیہ سمیساط اور قالیقلا بلکہ اور آگے بحرِ خزر تک چلا گیا ہے جہاں اسے جبل القبق کہتے ہیں۔ جبل لبنان میں وہ ٹکڑا جو حمص کے ضلعے میں داخل ہے، بہت ہی خوشنما ہے اس میں کثرت سے میوہ پیدا ہوتا ہے اور مزروعہ زمینیں اتنی ہیں کہ اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ بیان کرتے ہیں کہ خود ضلع لبنان میں ستر بولیاں بولی جاتی ہیں اور ایک فرقہ دوسرے کی بات کو بجز ترجمان کی مدد کے نہیں سمجھ سکتا" یاقوت۔ دوم۔ ۱۱۰ چہارم ۳۴۷ و مراصد، اول، ۲۶۳۔ سوم، ۵)

دمشقی کا بیان ہے کہ "کوہستان لبنان کی ڈھلانوں پر خود رو درختوں اور جھاڑیوں کی نوے سے زیادہ قسمیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں تمام سال پھول کھلتا اور چننے والوں کو نفع دیتا ہے۔ یہی حال میوؤں اور دوسرے درختوں کا ہے" (۱۹۹)

ابن بطوطہ اپنی روزنامچے میں تحریر کرتا ہے کہ "لبنان کے پہاڑ دنیا کے سرسبز ترین پہاڑوں میں شامل ہیں۔ یہاں ہر قسم کے میوہ دار درخت اُگتے ہیں۔ جگہ جگہ چشمے ملتے ہیں اور گرمیوں میں سایہ میسر آتا ہے۔ یہ خطہ ارباب زہد و تقویٰ کے باعث مشہور ہے جو یہاں بستے ہیں" (اول۔ ۱۸۴)

جبل النصیریہ؛ ابو الفدا لکھتا ہے کہ "حلب کے قریب یہ مشہور پہاڑ ہیں۔ نُصیریہ وہ فرقہ ہے جو حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے مولیٰ نصیر کے نام سے موسوم ہوا[1]۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ نے یوشع ابن یونس علیہما السلام

---

[1] یہ غلطی ہے، نصیریہ، محمدؐ ابن نصیر سے موسوم ہیں جس نے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں نام پایا؛ دیکھو ہاربروکر کا ترجمہ شہرستانی اول ۲۱۶؛

کی طرح چلتے سورج کو ٹھیرا لیا تھا۔ اور ان سے ایک قاز نے باتیں کیں جس طرح مسیح علیہ السلام سے ایک قاز نے کی تھیں۔ ان میں سے اکثر حضرت علیؓ کی الوہیت کے قائل ہیں۔" (ابوالفدا ۲۳۲ - منقول از ابن سعید)

جبل سنیر ؛ یاقوت لکھتا ہے کہ "وہ یہ ان پہاڑوں کا نام ہے جو حمص و بعلبک کے مابین شارع عام کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی مغربی حد بعلبک اور مشرقی قریتیں وسلمیہ ہیں۔ اس طرح یہ حماۃ کے مشرق میں واقع ہیں۔ اور جبل جلیل اس کے مقابل میں سمندر کے کنارے کنارے پھیلا ہوا ہے۔ انہی پہاڑوں کے بیچ کے میدان میں حمص اور حماۃ اور بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ سنیر کا یہ کوہستانی خطہ ایک کورہ (یا ضلع) بن گیا ہے جس کا صدر مقام حوارین یعنی قریتین ہے۔ دائیں جانب یہ پہاڑ لبنان کہلاتا ختم ہو جاتا ہے مگر وہاں سے شمال میں اس کا ایک اور سلسلہ بہت دور یعنی بلاد خزر تک پھیلا ہوا ہے۔ بائیں جانب (= جنوب اور مشرق کی سمت میں) اس کا پھیلاؤ مدینہ منورہ تک ہے۔ لیکن جبل سنیر صرف اس حصہ کوہستان کو کہتے ہیں جو حمص و بعلبک کے مابین ہے اور یہ پورے سلسلے کا بالکل چھوٹا سا ٹکڑا ہے"۔ (یاقوت - سوم ۱۷۰، مراصد - دوم - ۶۱)

جبل الثلج ؛ (= برف کا پہاڑ، ہرمون) ابوالفدا لکھتا ہے کہ "جبال لبنان، ولکام، تینوں یکے بعد دیگرے اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ انھیں ایک ہی سلسلہ کوہ کہا جا سکتا ہے جو جنوب سے شمال کی طرف چلا گیا ہے۔ سلسلے کا جنوبی سرا صفد کے قریب ہے اور شمال میں جبل الثلج بڑھکے دمشق سے آگے تک نکل گیا ہے۔ اس کے اور آگے شمال میں اسی پہاڑ کا نام جبل سنیر ہو جاتا ہے۔ وہ چوٹی جو دمشق کے اوپر چھائی ہوئی ہے، جبل قاسیون کہلاتی ہے۔ دمشق سے گزر کر یہ سلسلہ کوہ بعلبک کے مغرب میں جاتا ہے اور بعلبک کے مقابل چھائی ہوئی چوٹی کو لبنان کہتے ہیں۔ بعلبک سے بڑھکے اس کے مشرق میں طرابلس الشام آتا ہے اور یہاں یہ پہاڑ جبل عکار موسوم ہو گیا ہے کیونکہ اس کی چوٹی پر جو قلعہ بنا ہوا ہے اس کا نام عکار ہے؛ اس کے بعد یہ

پہاڑ طرابلس سے ہوتا ہوا جانب شمال آگے چلا گیا ہے اور حصن الاکراد تک پہنچتا ہے۔ یہاں اسی کے مقابل اور مغرب میں ایک دن کی راہ پر حمص واقع ہے۔ پھر یہ سلسلہ شمال میں بڑھ کر حماۃ، شیزر اور افامیہ کے خطہ سے گزرتا ہے اور ان شہروں کے سامنے جبل اللکام کہلاتا ہے۔ شہر افامیہ کے متوازی اور مغرب میں جہاں یہ پہاڑ پہنچتا ہے وہیں اس کے بالمقابل ایک دوسرا سلسلہ شروع ہوا ہے جو جبل اللکام کے متوازی شمال میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ افامیہ کے قریب اس دوسرے پہاڑ کو جبل شاہ شبو کہتے ہیں کہ شاہ شبو ایک موضع کا نام ہے جو ان پہاڑوں کے جنوبی بازو پر آباد ہے۔ یہ پہاڑ (شاہ شبو) جنوب سے شمال میں پھیلا ہے اور المعرہ، سرمین اور حلب کے مغرب سے گزرا ہے۔ اس کے آگے یہ مغرب کی طرف مڑ جاتا ہے اور یونانیوں کے ملک کے پہاڑوں میں جا ملتا ہے۔

رہا جبل لکام، تو وہ اور آگے شمال میں چلا گیا ہے اور اس کے اور جبل شاہ شبو کے درمیان وہ وادی ہے جس کا عرض نصف دن کی راہ کے مساوی ہوگا اور جس میں افامیہ کی جھیلیں واقع ہیں۔ جبل لکام صہیون، الصغر، بقاس، اور القصیر سے گزرا ہے تا آنکہ انطاکیہ پہنچکر بیچ میں سے کٹ جاتا ہے اور راس فصل کے آگے مقابل میں ارمینیہ کے پہاڑ بلند ہوتے ہیں۔ اسی فصل یا وادی کے بیچ سے رود عاصی نے اپنا راستہ نکالا ہے جو مقام سویدیہ پر سمندر میں جا گری ہے" (ابوالفدا - ۶۸)

جبل الدرزیہ: (کوہستان دروز) ابوالفدا لکھتا ہے کہ "یہ جبال لبنان کی وہ شاخ ہے جو وادی تیم کی طرف پھیل گئی ہے اس سلسلے کو جبل قروان موسوم کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ فرقۂ اباحیہ کے معتقد ہیں جس طرح کہ لبنان کے باشندے" (صفحہ ۲۲۹ - منقول از ابن سعید)

جبل سکین: ۱۳۲۱ء میں ابوالفدا لکھتا ہے کہ فرقۂ اسمعیلیہ کے صدر مقامات اور قلعے انہی پہاڑوں میں واقع ہیں جیسے مصیاف، الکہف اور الخوابی۔ ان کی جائے وقوع وہ پہاڑ ہیں جو سمندر کے کنارے کنارے حمص و حماۃ کے درمیان

باب دوم

کے علاقے کے بالمقابل پھیلے ہوئے ہیں۔ حمص و حماۃ کے خطہ کے مقابل مصیاف ایک مثلث بناتا ہے جس کا شرقی زاویہ حماۃ، شمال مغربی کونہ مصیاف اور جنوب مغربی سرا حمص ہے اور یہ ایک دوسرے سے ایک ایک دن کی راہ پر واقع ہیں۔" (۲۲۹۔ منقول از ابن سعید)

جبل الخلط: "ابو الفدا لکھتا ہے کہ "وہ حمص اور ساحل بحر کے مابین کا ایک ضلع ہے یہاں کثرت سے اباحی مذہب کے لوگ (جن کے عقیدے میں ہر شئے مباح ہے) آباد ہیں ان کا جب کبھی بس چلتا ہے تو مسلمانوں کو غلام بنا کے فرنگیوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔" (۲۲۹)

جبل السماق: "یاقوت لکھتا ہے کہ "یہ مغربی حلب کے ضلعے میں ایک بڑا پہاڑی خطہ ہے جس میں بہت سے شہر، گاؤں اور قلعے موجود ہیں اور یہ سب میں اسمٰعیلی فرقے کے لوگ آباد ہیں۔ اس علاقے کا جزو اعظم حکومت حلب کے ماتحت ہے۔ سماق نامی درخت کی یہاں کثرت ہے اور اسی لیئے اسے جبل السماق کہنے لگے ہیں۔ تل، کپاس اور خوبانی یہاں کی خاص پیداوار ہیں ہیں اور جگہ جگہ آب رواں کے چشمے ہیں۔ باغوں کی اور ہر قسم کے درختوں اور میوؤں کی افراط ہے۔" (یاقوت دوم۔ ۲۱ و مراصد۔ اوّل، ۲۳۸)

جبل الاقرع (= گنجا پہاڑ) یاقوت کہتا ہے کہ "یہ شام کے ان پہاڑوں کے نام ہیں جو سمندر سے انطاکیہ، اللاذقیہ اور طرابلس کے اضلاع پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے کی بلندی کا علم نہیں۔" (اوّل، ۳۴۶ و مراصد۔ اوّل، ۱۹۵)

عربوں کا یہ جبل اقرع رومیوں کا "مونس کیسئیس" ہے جو انطاکیہ کے جنوب میں واقع ہے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "یہ شام کے سب سے بلند پہاڑوں میں ہے۔ سمندر کی طرف سے آتے وقت سب سے پہلے یہی نظر آتا ہے۔ اس کی ڈھلانوں پر ترکمان آباد ہیں (۱۳۵۵ء) اور بہت سی ندیاں اور چشمے اس پر سے بہ کر نیچے آتے ہیں۔" (جلد اوّل، ۱۸۳)

جبل لکام: خاص طور پر اس نام سے ان پہاڑوں کے مشرقی اور

شمالی حصے موسوم تھے، جنھیں قدیم زمانے میں "کوہ امانوس" کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لبنان کے شمال میں شام کے سارے پہاڑوں کو اس عام نام سے یاد کیا جانے لگا (دیکھو ورق ماسبق) اور متاخرین عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں اکثر جبل لکام اور جبل سکین کو ایک ہی پہاڑ بتا دیا گیا ہے۔

مقدسی لکھتا ہے کہ "جبل لکام شام کا سب سے آباد کوہستانی خطہ ہے اور میوہ دار درختوں کی کثرت نیز رقبے کی وسعت میں بھی سب سے بڑا ہے۔ لیکن آج کل (۹۸۵ء) یہ سارا علاقہ ارمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ طرسوس ان پہاڑوں کے پار اور انطاکیہ ہماری طرف واقع ہے" (۱۸۸)

اصطخری اور ابن حوقل دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس سلسلہ کوہ کا حسب ذیل احوال قلم بند کرتے ہیں :-

"جبال اللکام۔ شام اور عراق کے سرحدی قلعوں کی حد فاصل ہیں۔ اور یہ سلسلہ شمال میں یونانیوں کے علاقے کے اندر دور تک چلا جاتا ہے حتیٰ کہ لوگ کہتے ہیں دو سو فرسخ تک یہی سلسلہ ہے۔ اس کا آغاز اسلامی ممالک میں ہوا ہے اور یہ مرعش، الہارونیہ اور زبطرہ کے درمیان سے گزرا چلا گیا ہے۔ جنوب میں لاذقیہ تک ان پہاڑوں کو جبل لکام ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن اس کے آگے جنوب میں حمص تک یہ قبائل بہرا و تنوخ کے نام پر جبل بہرا و تنوخ کہلاتا ہے پھر حمص کے آگے اسے جبل لبنان کہتے ہیں اور اس کے بھی آگے جنوب میں یہ پہاڑ سارے شام پر پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ ایک طرف تو وہ ساحل بحر قلزم تک پہنچ گیا ہے اور دوسری طرف قاہرہ کی پہاڑیوں تک جنھیں المقطم کہتے ہیں، اس کا سلسلہ آتا ہے"۔ (اصطخری - ۵۶ - ابن حوقل، ۱۰۸)

یاقوت کا بیان ہے کہ "جبل اللکام ان پہاڑوں کو کہتے ہیں جو انطاکیہ، المصیصہ، طرسوس، اور ولایت ثغور کے دوسرے شہروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ شمال میں یہ سلسلہ ارمینیہ کے شاہان کیو کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے" (چہارم - ۳۶۴؛ مراصد - سوم - ۱۷)

بابُ سُوم

بیتُ المقدّس

اس مقدس شہر کے مختلف نام ــــ قدرتی فوائد ــ سرسبزی ــ محل وقوع ــــ شہر کا علاقہ ــــ مسجد الاقصیٰ ــ رسول اللہ صلعم کی شب معراج ــــ مسجد الاقصیٰ کی بنا ــــ حضرت عمرؓ اور عبدالملک کی ابتدائی تعمیر ــــ سنہ ۱۳۰ھ کا زلزلہ اور خلیفہ المنصور و المہدی کی مرمت ــــ مسجد کے اصطلاحی معنی ــــ مقدسی کا بیان مسجد الاقصیٰ کی نسبت ــــ طلسمات و مقصورات ــــ سنہ ۱۰۱۶ و ۱۰۳۴ء کے زلزلے ــ مرمتوں کے متعلق کتبات ــــ مسجد الاقصیٰ کی کیفیت ناصر خسرو کے قلم سے (۱۰۴۷ء میں) ــــ مسجد کا طول و عرض ــــ محاربات صلیبی ــــ مسجد کا "ٹیمپلرز" کے حوالے ہونا ــــ کیفیت مسجد، ادریسی اور علی ہروی کے قلم سے ــــ صلاح الدین کا دوبارہ بیت المقدس کو فتح کرنا اور مسجد کی بازیابی ۱۱۸۷ء میں ــــ مجیر الدین کی نوشتہ کیفیت ۱۴۹۶ء میں ــــ زمانہ حاضرہ کی مسجد ــــ قبۃ الصخرہ ــــ چٹان ــــ عبدالملک کا گنبد اس چٹان کے اوپر ــــ مسٹر فرگسن کے قیاس کی تکذیب ــــ عبدالملک کا کتبۂ عظیم ــــ المامون کا کتبہ دروازوں پر ــــ گنبد کی کیفیت ابن الفقیہ کے قلم سے (۹۰۳ء میں) ــــ ستون و در کی ترتیب ــــ اصطخری اور ابن حوقل

کی نوشتہ کیفیت ـــ مقدسی کی تحریر (۹۸۵ء میں) ـــ سنہ ۱۰۱۶ء کا زلزلہ اور مرمت کے متعلق کتبات ـــ ناصر خسرو کی سیاحت سنہ ۱۰۴۷ء میں ـــ بڑی قندیل کا گرنا، سنہ ۱۰۶۰ء میں ـــ صلیبی مجاہدین اور "ٹیمپلم ڈومی نی" ـــ ان کے گرجا اور رافائیل کی تصویر "سپوسالی زیو" ـــ ادریسی کا بیان سنہ ۱۱۵۴ء میں ـــ علی ہروی کا بیان سنہ ۱۱۷۳ء میں ـــ چٹان کے گرد کا جنگلا اور دوسری جزئیات ـــ چٹان کے ٹکڑے جو مجاہدین صلیبی بطور یادگار لے گئے ـــ صلاح الدین کا مسجد کو بحال کرنا ـــ گنبد میں اس کا کتبہ عظمیٰ ـــ ابن بطوطہ کی سیاحت سنہ ۱۳۵۵ء میں ـــ کاسہ گنبد کا سنہ ۱۴۴۸ء میں آگ سے جل جانا ـــ رسول اللہ صلعم کے نقش پا، غار اور دوسرے عجائبات کی نسبت سیوطی کا بیان ـــ مجیر الدین کی پیمائش۔

یروشلم مسلمانوں میں بیت المقدس یا بیت المقدس (بلا تشدید د) کے ناموں سے مشہور رہے جس کے معنی ہیں پاک مکان۔ اسے صرف "القدس" (بہ معنی پاک) بھی کہتے تھے اور یہ ہمارے زمانے تک بہت عام ہے لیکن قدیم عبرانی نام "یروشلم" سے عرب بخوبی واقف تھے گو اس کا استعمال نہ کرتے ہوں۔ چنانچہ یاقوت نے "یری شلّم" (اور بلا تشدید ل) نیز "شلّم" کے مختلف نام لکھے ہیں جو یہودیوں کے زمانے میں مروّج تھے۔ (جلد اوّل، ۴۰۲۔ سوم، ۳۱۵۔ چہارم، ۵۹۰)

قیصر ہادریان نے یروشلم کو یہودیوں سے خالی کرانے کے بعد (۱۳۰ء) شہر کو "ایلیا کاپی تولی نا" موسوم کیا اور اس کا پہلا جزو "الیا" کی شکل میں عربی میں محفوظ رہا۔ عربوں کے لیئے یہ بے معنی لفظ تھا لہذا طرح طرح کے افسانے پیدا ہو گئے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ:۔

"کعب کی سند سے روایت کی جاتی ہے کہ اس مقدس شہر کا نام الیآ اس لیئے ہوا کہ اسے ایک عورت اِلیآ نے آباد کیا تھا۔ (جلد چہارم، ۵۹۲)

باب سوم

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ " الیا " کے معنی بیت اللہ کے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ اپنے بانی الیا کے نام پر ہے جو ارم ابن سام ابن نوح کا بیٹا تھا۔ اور دمشق، حمص، اردن اور فلسطین اس کے بھائیوں کے نام تھے (یاقوت۔ اول، ۴۲۳ء ۴۲۴)

شعرا کے ہاں یروشلم کو کہیں کہیں " البلاط " کے نام سے بھی یاد کیا ہے جس کے معنی ہیں دربار، یا شاہی محل = اور یہ لفظ عربوں نے لاطینی " پلاتیوم " سے لیا ہے۔

سیاسی اعتبار سے بیت المقدس اپنی ولایت یا جند فلسطین کا اسلامی دار الحکومت کبھی نہیں رہا کہ یہ مرتبہ الرملہ کو حاصل تھا۔ لیکن مسجد اقصیٰ، قبۃ الصخرہ اور دوسرے مقدس مقامات اسی شہر کے اندر تھے اور اسی لئے حجاز کے حرمین شریفین کے بعد مومنین صالحین کی نظر میں یہی سب سے مقدس بستی تھی۔ دوسرے قیامت کے روز اسی شہر کے گرد حشر بپا ہونے والا تھا۔ بایں ہمہ مسلمانوں کے زمانے میں انتہائی عروج کے وقت بھی (جب کہ الرملہ جنوب کے علاقے اور دمشق شمالی شام کا صدر مقام تھا) اصطخری اور ابن حوقل نے (دسویں صدی عیسوی میں) لکھا ہے کہ بیت المقدس " قریب قریب اتنا بڑا ہے جتنا الرملہ یہ شہر پہاڑیوں پر بہت اونچا واقع ہے اور جدھر سے جائیے چڑھائی طے کرنی پڑیگی۔ سارے بیت المقدس میں بجز چشموں کے کوئی ندی نالہ نہیں ہے کہ آب پاشی کی جا سکے پھر بھی یہ جگہ فلسطین میں سب سے زیادہ سر سبز ہے " (اصطخری ۵۶۔ ابن حوقل ۔ ۱۱۱)

مقدسی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اسی شہر کا باشندہ تھا اور اپنے وطن کی مختلف خوبیاں زور شور سے بیان کرتا ہے (۹۸۵ء):-

" بیت المقدس، الیا اور البلاط کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ولایات میں اس سے بڑا شہر کوئی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض دار الملک بھی اس سے چھوٹے ہیں۔ یہاں گرمی یا سردی کی شدت نہیں ہوتی اور برف شاذ و نادر گرتی ہے۔ حرمین شریفین (مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ) کے قاضی کے فرزند قاضی ابو القاسم نے مجھ سے

ایک مرتبہ بیت المقدس کی آب و ہوا کا حال دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا "وہ بین بین ہے یعنی نہ بہت گرم نہ بہت سرد" اس نے کہا، "ہذا صفتہ الجنتہ" بیت المقدس کی عمارتیں پتھر کی ہیں اور اتنی مضبوط عمارات کہیں دیکھنے میں نہ آئینگی۔ ایسے پاک و عفیف لوگ بھی آپ کو کہیں نہ ملیں گے جیسے بیت المقدس کے ہوتے ہیں۔ یہاں کی اجناس خوردنی بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ منڈیاں پاک صاف رہتی ہیں۔ یہاں کی مسجد سب سے بڑی ہے اور اس سے زیادہ تعداد میں مقدس مقامات کہیں نہیں۔ انگور کی کثرت ہے اور بیت المقدس کی مثل بہ کہیں نہیں ہوتی۔ بیت المقدس میں حاذق اطباء اور حکماء کا مجمع ہے اور اسی لیئے ہر شخص اسکی طرف کھنچتا ہے۔ سال کے کسی زمانے میں اس کے کوچہ و بازار پردیسیوں سے خالی نہیں رہتے۔ اس کے سب شہروں میں ممتاز و بہتر ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ اس شہر میں دنیا اور آخرت کی دونوں خوبیاں جمع ہیں۔ ابنائے دنیا، جو آخرت کے بھی مشتاق ہیں، اس شہر میں اپنی اجناس کی منڈی پائیں گے۔ اور اسی طرح ارباب آخرت جنھیں اس دنیا کی نعمت بھی مطلوب ہے، ان کو دونوں باتیں یہاں میسر آئینگی، پھر یہ کہ باعتبار موسم یروشلم بہترین مقام ہے کہ نہ یہاں کا جاڑا ضرر رساں نہ گرمی تکلیف دہ۔ رہا اس کا سب سے خوبصورت ہونا تو کیا اس سے بہتر و صاف تر عمارات یا اس کی مسجد سے بڑھ کر خوشنما مسجد کہیں کسی نے دیکھی ہے؟ رہا اس مقدس شہر کا اللہ کی نعمتوں میں سب شہروں سے زیادہ بہرہ ور ہونا، تو حق یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس شہر میں پست و بلند، میدان و کوہستان غرض ہر طرح کی زمین کے اور بالکل متضاد قسم کے میوے جمع کر دئے ہیں۔ مثلاً نارنگی اور بادام۔ کھجور اور جوز۔ انجیر اور موز وغیرہا۔ اس کے علاوہ دودھ شہد اور شکر کی افراط ہے۔ رہی اس شہر کی فضیلت، تو کیا روز قیامت کا میدان حشر یہیں نہیں ہوگا۔ جہاں سب جمع کیئے جائیں گے اور ان کا حساب ہوگا؟ بے شبہ کعبۃ اللہ کے باعث مکہ معظمہ اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے باعث مدینہ منورہ کو فضیلت و شرف حاصل ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ دونوں شہر بھی بیت المقدس آئینگے

اور ان سب کی خوبیاں جمع ہو جائیں گی۔ رہی اس کی وسعت، تو حقیقت میں جہاں ساری مخلوقات جمع ہو گی، اس سے بڑھ کر وسیع جگہ کرۂ ارض پر اور کون ہو سکتی ہے؟

ان سب خوبیوں کے ساتھ بیت المقدس میں بعض عیوب بھی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں توراۃ شریف میں لکھا ہے کہ "یروشلم سونے کا طاس ہے جس میں بچھو بھرے ہیں"۔ اس مقدس شہر سے زیادہ کثیف حمام کسی شہر میں نہ ملیں گے، اور نہ اسنے زیادہ مہنگے۔ ارباب علم کی کمی ہے اور نصاریٰ کی زیادتی جو عام مقامات پر بیہودگیاں کرتے ہیں۔ مسافر خانوں میں ہر بکری کی چیز پر سخت محصول لگائے ہیں۔ ہر دروازے پر پہرہ ہے اور مایحتاج زندگی کو سوائے مقررہ مقامات کے کہیں فروخت کرنے نہیں دیتے۔ اس شہر میں کمزوروں کا مددگار کوئی نہیں۔ مسکینوں کو ستاتے ہیں، دولتمندوں پر حسد کرتے ہیں۔ فقہا کے پاس کوئی نہیں جاتا اور ادیبوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ درس گاہیں خالی پڑی ہیں کہ درس دینے والا کوئی نہیں۔ جہاں دیکھئے یہود و نصاریٰ کو غلبہ حاصل ہے اور مسجد، جماعت اور اہل علم کی مجلسوں سے بے نصیب ہیں" (مقدسی - ۱۶۶ و ۱۶۷ - ترجمے میں کسی قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے)

یہ بات کہ پہلی جنگ صلیبی سے بھی ایک صدی قبل یہود و نصاریٰ کو بیت المقدس میں غلبہ حاصل تھا، واقع میں بہت عجیب اور قابل لحاظ ہے۔ مقدمۂ کتاب میں مقدسی یہ بھی لکھ آیا ہے کہ "بیت المقدس میں کوئی خرابی اور عیب نہیں ملسکتا شراب عام طور پر نہیں پی جاتی نہ بدمستی و مدہوشی نظر آتی ہے۔ شہر میں خفیہ یا علانیہ قحبہ خانے نہیں ہیں۔ لوگ اپنے تقویٰ اور خلوص میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب خبر ہوئی کہ والیٔ شہر نے شراب پی ہے تو لوگوں نے اس کے گھر کے گرد دیوار بنا دی کہ اس کی دعوتوں میں جو لوگ بلائے گئے تھے وہ اس تک نہ جانے پائیں" (مقدسی - ۷)

آگے چل کے مقدسی حوالی شہر کی نسبت لکھتا ہے کہ "بیت المقدس کے گرد چالیس میل کے نصف قطر میں جتنا علاقہ ہے وہ سب اس شہر کی حدود میں

میں داخل ہے۔ اور اس میں بہت سے گاؤں ہیں۔ بارہ میل تک سرحد بحیرۂ لوط کے کنارے کنارے صغرہ مآب کے مقابل تک چلی گئی ہے۔ پھر پانچ میل تک صحرا سے گزرتی اور جانب جنوب القصیفہ بلکہ اس کے بھی آگے کے علاقے تک پھیلی ہے۔ شمال میں وہ نابلس کی سرحد تک گئی ہے۔ غرض یہ زمین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بابرکت فرمایا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں پر اور نیز میدانوں میں درختوں کی کثرت ہے جنھیں کسی آب رسانی یا نہری پانی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جیسا کہ دو شخصوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ "ہم ایسی سرزمین میں ہیں جہاں دودھ اور شہد بہتے ہیں" واقعی یہی حال ہے۔ خود میں نے یروشلم میں بعض اوقات دیکھا ہے کہ ایک سدس درہم میں ایک رطل پنیر اور ایک درہم کی ایک رطل شکر بک رہی ہے۔ اسی قیمت میں کوئی چاہے تو ڈیڑھ رطل روغن زیتون یا چار رطل کشمش خرید سکتا ہے۔" (مقدسی - ۱۷۳) ؀

اب اگر درہم کو دس آنے اور شامی رطل کو چھ پونڈ (پونے تین سیر) کے برابر سمجھا جائے تو گویا ہمارے پیسے کا ڈیڑھ پاؤ پنیر، کوئی ساڑھے تین آنے کی سیر بھر شکر، ایک روپے کا چودہ سیر روغن زیتون، اور ایک آنے کی تقریباً ڈھائی سیر کشمش بکتی تھی۔ حوالی بیت المقدس کی اس قدرتی زرخیزی کا عرب مصنفوں نے پیہم ذکر کیا ہے۔ مقدسی یہ بھی لکھ گیا ہے کہ "گرمیوں میں جس وقت جنوبی ہوا چلتی ہے تو ہر شب کو اس شدت سے اوس پڑتی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی موریوں میں پانی آجاتا ہے"[1]

[1] کننگ ہیم گیکی کی کتاب "The Holy land and the Bible" میں سے ذیل کا فقرہ صراحت کرتا ہے کہ مقدسی کا مشاہدہ کس قدر صحیح تھا: ڈاکٹر گیکی لکھتا ہے کہ "فلسطین میں صاف و روشن مطلع دن کی گرمی کو بہت جلد فضا میں منتشر کر دیتا ہے جس کے باعث وہاں راتیں اتنی ہی سرد ہوتی ہیں جتنے کہ دن گرم ہوتے ہیں۔ ہوائے شب کی یہی برودت آبرسانی کا وہ کام کرتی ہے جس کے بغیر نباتات کی زندگی ممکن نہیں۔ ہواؤں کی تمام رطوبت ملک پر سے گزرتے وقت ہیں جمع ہو جاتی ہے اور فضا کی برودت اسے قطرات آب کی شکل میں بدل دیتی ہے جو کہ کہر کا باران رحمت

بیت المقدس کا پہاڑ کی چوٹی پر محل وقوع، اور تینوں طرف گہری قدرتی خندقیں دیکھ کر، مشرقی اور مغربی ہر جگہ کے زائرین پر بظاہر بڑا اثر پڑتا تھا، عرب بڑے شہروں کو وادیوں میں یا مسطح میدانوں میں بنانے کے عادی تھے کہ ندیوں سے فائدہ اٹھا سکیں ؎

۱۰۴۷ء کی ۵ مارچ کو ایرانی سیاح ناصر خسرو شمالی سڑک سے اپنے بیت المقدس پہنچنے کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے کہ "قریۃ العنب سے کچھ دور تک چڑھائی کا راستہ طے کرنے کے بعد ہمارے روبرو ایک وسیع میدان آیا جس کا کچھ حصہ پتھریلا اور کچھ اچھی زمین کا تھا۔ اور یہاں ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ شہر بیت المقدس ہمارے سامنے ہے۔ شام اور آس پاس کے ملک کے باشندے بیت المقدس کو "قدس" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور اگر ان ولایات کے رہنے والے حج بیت اللہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو انہی مقررہ ایام میں بیت المقدس آتے اور شعائر مذہبی بجا لاتے ہیں اور اسی جگہ حج کے دن قربانی کرتے ہیں جیسا کہ (مکّہ معظمہ میں) دستور ہے۔ چنانچہ بعض سنین میں ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں یہاں بیس ہزار تک اشخاص جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ ختنہ کی رسم ادا کرنے کی غرض سے وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ دوسرے یونانیوں کے علاقے اور دوسرے ملکوں سے یہود ونصاریٰ بڑی تعداد میں یروشلم آتے ہیں کہ اس کلیسا اور دیر کی زیارت کریں جو یہاں ہے۔ اس کلیسا کا حال ہم آگے مناسب مقام پر بیان کریں گے (دیکھو باب پنجم)۔

بیت المقدس کے گرد کی اراضی اور مواضع پہاڑی ڈھلانوں پر واقع ہیں۔ زمین اچھی مزروعہ ہے اور گیہوں، زیتون اور انجیر کی کاشت ہوتی ہے اور بھی بہت قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ آس پاس کہیں کوئی چشمہ نہیں جس سے آب پاشی کی جائے، مگر اس پر بھی پیداوار بہت زیادہ اور نرخ معتدل ہیں۔ اکثر ممتاز اشخاص کی زمینوں میں مقدار کثیر ہیں یعنی پچاس ہزار من

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بلکہ ہر سوکھے پتے تک بھی پہنچاتے ہیں!

(= ساڑھے سولہ ہزار گیلن) تک روغن زیتون نکل آتا ہے۔ اسے حوضوں اور حجروں میں بھر لیتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں دساور بھیجتے ہیں۔ لوگوں کا قول ہے کہ شام کی سرزمین میں قحط کبھی نہیں پڑتا۔ یروشلم کا شہر پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے اور اس پر سوائے بارش کے پانی اور آب رسانی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ آس پاس کے دیہات میں جیسے چشمے ہیں ویسے چشمے بھی اس مقدس شہر میں نہیں ہیں۔ بستی کے گرد چونے گچ کی سنگین دیواریں، اور دروازے آہنی ہیں۔ شہر کے قریب باغ یا درختوں کا پتہ نہیں کیونکہ وہ چٹان پر آباد ہوا ہے۔ یروشلم بڑا شہر ہے اور میری سیاحت کے زمانے میں یہاں مردوں کا شمار ہی بیس ہزار کے قریب ہوگا۔ اس میں بہت صاف ستھرے اونچے اور اچھے بنے ہوئے بازار ہیں۔ تمام محلوں کے راستے سنگ بستہ بنائے ہیں۔ جہاں کہیں بلندی یا ٹیلا آیا اسے کاٹ کر مسطح کر دیا ہے کہ بارش ہو تو پانی کہیں نہ رکے اور جگہ وتیل کے صاف ہو جائے۔ شہر میں مختلف قسم کے صناع ہیں اور حرفہ کا بازار الگ ہے" (ناصر خسرو۔ ۲۳ و ۲۴)

المسجد الاقصیٰ

یروشلم کی بڑی مسجد، المسجد الاقصیٰ (یعنی دُور کی مسجد) کی وجہ تسمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شب معراج کی روایت ہے۔ قرآن شریف میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (سورۂ بنی اسرائیل) مسجد سے یہاں مُراد بیت المقدس کے حرم کا پورا رقبہ ہے نہ کہ مسجد کی خاص عمارت کہ وہ اس زمانے میں موجود نہ تھی۔

روایت مذکور کے مطابق آنحضرت صلعم اس موقع پر ایک پردار اسپ بُراق (= بجلی) پر سوار تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کی جلو میں تھے

باب سوم

آپ مکہ معظمہ سے پہلے طور سینا پر تشریف لے گئے پھر بیت اللحم اور وہاں سے بیت المقدس آئے۔ روایت میں ہے کہ "پھر جس وقت ہم بیت المقدس میں مسجد کے دروازے پر پہنچے (یعنے حرم کے احاطے پر) تو جبرئیلؑ نے مجھ کو اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا جس سے انبیائے پیشین نے بھی اپنے گھوڑے باندھے تھے" (ابن الاثیر - جزو دوم ص ۳۷) حرم شریف میں دروازے سے، جو بعد میں باب محمدؐ کے نام سے مشرف ہوا آنحضرتؐ اور جبرئیلؑ اس مقدس چٹان پر چڑھے جو قدیم زمانے میں ہیکل سلیمانؑ کے وسط میں تھی۔ اسی کے قریب انبیا علیہم السلام کی جماعت آپ سے ملاقی ہوئی اور آپ نے حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے انبیائے سابق کیساتھ نماز ادا فرمائی۔ اس مقدس چٹان سے حضور صلعم جبرئیلؑ کی معیت میں ایک نور کے زینے کے ذریعے آسمان پر چڑھے اور جنت الفردوس اور وہاں کی نعمتوں کو پہلے سے آپ کو دکھایا گیا۔ ہفت افلاک طے کرکے آپ بالآخر باری تعالیٰ جلشانہ کے حضور میں پہنچے اور وہاں وہ احکام صلوٰۃ ملے جن کی آپکی امت پر پابندی فرض ہونے والی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد آپ دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور اسی نور کے زینے (یا معراج) سے اتر کر دوبارہ یروشلم کی صخرۂ مقدسہ پر قیام فرمایا۔ پھر جس طرح تشریف لائے تھے اسی طرح براق پر معاودت فرمائی اور رات گزرنے سے قبل مکہ معظمہ واپس پہنچ گئے۔ شب معراج کی روایت کا یہ خلاصہ ہے اور اسی روایت نے تمام مسلمان اہل ایمان کی نظر میں اس چٹان اور حرم کے رقبے کو خاص طور پر مبارک و متبرک بنا دیا ہے۔

سنہ ۱۴ ھ (۶۳۵ء) میں یروشلم نے حضرت عمرؓ کی اطاعت قبول کی تو انھوں نے اس مقام پر جو (ہیکل یا) مسجد داؤدؑ کی قدیم جگہ سمجھی جاتی تھی، ایک مسجد تعمیر کرائی۔ لکھا ہے کہ یہ چٹان ایک ملبوں کے ہٹورے میں چھپ گئی تھی اور اسے حضرت عمرؓ نے اس بیان کی بناء پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج بیت المقدس میں ادائے نماز کی جانے کے متعلق ارشاد فرمایا تھا، دوبارہ ڈھونڈ نکالا اور تصدیق کی کہ مسجد داؤدؑ کا مقام یہی تھا۔

حضرت عمرؓ کے اس چٹان کا مقام منکشف کرنے کی نسبت جو روایات باب سوم منقول ہیں انھیں آئندہ بیان کیا جائے گا۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ قدیم عرب مورخ (جیسے بلاذری یا طبری) حضرت عمرؓ کی بنا کردہ مسجدِ اقصیٰ کا کوئی تفصیلی حال تحریر نہیں کرتے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں، یعنی عہدِ فاروقی اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں جب تک کہ زمامِ حکومت دمشق کے خلفائے اموی کے ہاتھ میں آئی، مسجدیں بلا شبہ لکڑی اور دھوپ میں پکی ہوئی اینٹوں اور اسی قسم کی غیر دیرپا چیزوں سے تعمیر کی جاتی تھیں۔ پس قرینہ کہتا ہے کہ جب پچاس برس بعد اموی خلیفہ عبدالملک کے حکم سے یہاں پتھر کی عظیم الشان مسجد بنی تو حضرت عمرؓ کے زمانے کی عمارت کا کوئی حصہ اس قابل موجود نہ ہوگا جسے نئی تعمیر کا جزو بنا لیا جاتا۔ عبدالملک کی تعمیر کا زمانہ ۷۲ھ (۶۹۰ء) کے قریب کا ہے۔ یہ بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس خلیفہ نے مسجد کو بناتے وقت اس مسالے سے کام لیا جو سینٹ میری[1] کے کلیسا بنا کردۂ جسٹی نیان کے کھنڈروں میں پڑا تھا۔ کیونکہ یہ کلیسا یقیناً اسی جگہ کے آس پاس بنا ہوا تھا جہاں بعد میں مسجدِ اقصیٰ کی عمارت تیار ہوئی۔ عجب نہیں کہ اس مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں جو پائے اب تک موجود ہیں، وہ اسی جسٹی نیانی کلیسا کے آثار ہوں جس کی نسبت پروکوپیوس[1] نے بیان کیا ہے کہ ۵۶۰ء میں تعمیر ہوئی اور جب خسرو ثانی کے زمانے میں ایرانیوں نے شام کے راستے وہ زبردست تاخت کی جس میں ارضِ مقدس کی اکثر مسیحی عمارتیں برباد و تاراج ہوئیں، تو یہ گرجا بھی جلا دیا گیا (۶۱۴ء)۔ عبدالملک کے دوبارہ مسجدِ اقصیٰ کو تعمیر کرنے کی نسبت عرب اہلِ قلم نے جیسی عجیب خموشی سے کام لیا ہے، شاید اس کا سبب بھی یہی ہو کہ اس خلیفہ نے عمارت کو نئی بنیادوں پر نہیں بنایا بلکہ

---

[1] ملاحظہ ہو، پیلسٹائن پلگرمز ٹیکسٹ سوسائٹی کی کتاب "پروکوپیوس" صفحہ ۱۳۸۔ پروفیسر ہائٹر لیوس کی تازہ تصنیف "دی ہولی پلیسز آف جیروسلم" میں بھی اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے (باب چہارم)، اور تمام ماخذ درج کر دیئے ہیں۔

بینٹ میری کے آثار باقیہ سے کام لیا (جہاں پہلے حضرت عمرؓ نے اپنی سیدھی سادی مسجد بنائی تھی۱) اور انھیں اپنی جدید مسجد میں شامل کر لیا تو

اصلیت جو کچھ ہو عربی وقائع میں عبد الملک کے مسجد اقصیٰ کو دوبارہ بنانے اور اس کے ٹھیک سنہ کا کہیں ذکر نہیں ہے اور اس کی سب سے پہلی تفصیلی کیفیت وہ ہے جو مقدسی نے ۹۸۵ء میں یعنی عہد عبد الملک سے کوئی تین سو برس بعد تحریر کی ہے۔ برخلاف اس کے، قدیم ماخذ میں قبۃ الصخرہ کے مفصل حالات ملتے ہیں جن میں اس کی ۷۲ھ (۶۹۱ء) کی بناء اور تیسری صدی ہجری ہی میں اس کی عام شکل و صورت بیان کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب مورخ اور وہ سیاح جو اس زمانے میں حرم شریف کو دیکھنے آئے۲ وہ مسجد اقصیٰ کی اصل عمارت سے زیادہ قبۃ الصخرہ کی شان و شوکت دیکھ کر مرعوب ہوئے حالانکہ وہ مسجد کا محض ایک جزو تھا۔ مقدسی کی تحریر سے پہلے ہمیں مسجد اقصیٰ کی نسبت جو کچھ معلوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے: روایت عام کے مطابق حضرت عمرؓ نے ۱۴ھ (۶۳۵ء) میں یا اس کے قریب، بیت المقدس میں ایک مسجد (غالباً چوبی) بنا فرمائی۱ بظاہر ۶۹۱ء (۷۲ھ) میں اموی خلیفہ

۱؎ جہاں تک مجھے تحقیق ہو سکا، حضرت عمرؓ کے یروشلم میں مسجد بنانے کا تذکرہ سب سے پہلے بازنطی مورخ تھیوفانس کے وقائع میں ملتا ہے۔ ذیل میں ہم اصل یونانی عبارت کا جو کرونوگرافیا (مطبوعہ بون ۱۸۳۹ء) جلد اول کے صفحہ ۵۲۴ پر ملے گی، ترجمہ کرتے ہیں:۔ سنہ ارضی ۶۱۲۵۔ سنہ میلادی ۶۳۵ (۶) اس سال عمرؓ نے یروشلم کے ہیکل کی از سر نو تعمیر کا آغاز کیا۔ کیونکہ یہ عمارت واقع میں اس وقت تک قائم نہیں رہ سکی بلکہ گر کر کھنڈر ہو گئی تھی۔ اور حضرت عمرؓ نے یہودیوں سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب میں کہا کہ "جب تک تم وہ صلیب جو کوہ زیتون پر نصب ہے نہیں گرا دو گے، ہیکل کی بناء مضبوط نہ ہو گی" اس پر حضرت عمرؓ نے اس مقام کی صلیب کو گرا دیا تاکہ عمارت (ہیکل) کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں۔ پھر اسی بناء پر ان دشمنان مسیح نے دوسرے مقامات کی بے شمار صلیبیں سرنگوں کرائیں۔ تھیوفانس ۷۵۱ء میں پیدا ہوا اور ۸۱۸ء (یعنی ۲۰۳ھ) میں وفات پائی۔ اس کے وقائع آٹھویں صدی عیسوی

عبد الملک نے مسجد اقصیٰ کو دوبارہ تعمیر کیا۔ (نیز ملاحظہ ہو حاشیہ آخر کتاب میں) جیسا کہ مقدسی اور سیوطی کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں ۷۴۶ء (۱۳۰ھ) کے زلزلے میں اس کا بڑا حصہ گر پڑا۔ اس زلزلے اور نقصان کا مفصل حال جو مجھے مل سکا وہ مثیر کے مصنف کا تحریر کردہ ہے اور یہ بہت بعد کا یعنی ۱۳۵۱ء کا آدمی ہے لیکن اس سے قبل کے کسی مصنف کی تحریر اس بارے میں مجھے نہیں میسر آئی۔ طبری اور ابن اثیر کی متقدم تاریخوں میں ۷۴۶ء کے اس زلزلے کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ اگرچہ مقدسی (۹۸۵ء) سرسری طور پر ایک زلزلے کا تذکرہ کرتا ہے جس سے مسجد اقصیٰ گری اور جو عباسیوں کے زمانے میں آیا تھا۔ لیکن اگر زلزلے کا سن ۱۳۰ سنہ ہجری (۷۴۶ء) درست ہو، تو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس وقت خلافت دمشق موجود تھی اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۳۲ھ میں سفاح نے اپنے اموی رقیب کو مغلوب کیا اور خاندان عباسیہ کی بنیاد ڈالی جس نے تھوڑے ہی دن بعد دار الحکومت کو دمشق سے بدل کر دجلے کے کنارے بغداد میں منتقل کر لیا۔

مصنف مثیر نے زلزلوں کا جو حال لکھا ہے اور اوپر اس کا اشارہ ہم نے کیا، وہ حسب ذیل ہے [۱]:-

عبد الرحمٰن ابن محمد ابن منصور ابن ثابت کی روایت پر جس نے روایت سنی اپنے باپ اور دادا سے۔ عبد الملک کے زمانے میں مسجد کے تمام

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: کے لکھے ہوئے ہیں اور اس حساب سے وہ قدیم ترین عرب مورخین کی نسبت نصف صدی سے بھی زیادہ پہلے کا مصنف ہے۔ اسکی جوانی حضرت عمرؓ کی فتح بیت المقدس کے زمانے سے کچھ کم ڈیڑھ صدی کا فرق رکھتی ہے۔

[۱] اس عبارت کی اصل کو بیلیو تھیک نیشنل کے قلمی نسخوں کا احتیاط سے مقابلہ کر کے درست کر لیا ہے اور وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے (سلسلہ جدید ۱۹ صفحہ ۳۰۴) میں چھپ چکی ہے۔ سیوطی نے (۱۴۷۰ء میں) اور پھر مجیر الدین نے (۱۴۹۶ء میں) اس فقرے کو بلفظہ اپنی کتابوں میں نقل کر لیا ہے۔ دیکھو مجیر الدین کی کتاب مطبوعہ قاہرہ، صفحہ ۲۷۰۔

باب سوم

دروازوں پر سونے چاندی کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ مگر خلیفہ المنصور کے عہد میں مسجد کے مشرقی اور مغربی دونوں حصے گر گئے۔ تب خلیفہ سے عرض کی گئی کہ "اے امیر المومنین، حقیقت میں سنہ ۱۳۰ھ (سنہ ۷۴۶ء) کے زلزلے نے مسجد کے مشرقی اور نیز مغربی حصے کو گرا دیا پس آپ حکم دیجئے کہ اسے از سر نو بنایا اور قائم کر دیا جائے" اور خلیفہ نے جواب دیا کہ ہمارے خزانے میں تو روپیہ ہے نہیں، مناسب ہو گا کہ دروازوں پر جو سونے چاندی کی تختیاں جڑی ہوئی ہیں، انھیں اکھاڑ لیا جائے۔ چنانچہ انھیں اکھاڑ کر دینار و درہم مسکوک کرا لیے گئے اور یہی رقم تعمیر میں جب تک کہ وہ مکمل نہ ہو گئی، خرچ ہوتی رہی۔ اس کے بعد دوسرا زلزلہ آیا اور المنصور کے حکم سے جو عمارت بنی تھی، وہ بھی زمین پر آ رہی۔ منصور کے جانشین خلیفہ المہدی کے عہد میں بھی یہ مسجد کھنڈر پڑی تھی مگر جب اُسے یہ اطلاع ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ اسے دوبارہ بنوایا جائے۔ خلیفہ نے کہا کہ پہلے یہ مسجد بہت تنگ اور اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ لمبی تھی اور اسی باعث لوگ زیادہ کام نہ لیتے تھے۔ پس بہتر ہے کہ اب اسکا طول کم کر دیا جائے اور عرض بڑھا دیا جائے۔ اس نئے نقشے کے مطابق مسجد کی از سر نو تعمیر اسی خلیفہ کے زمانے میں تکمیل کو پہنچی"۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۳۰ھ میں مسجد اقصیٰ زلزلے سے گری اور خلیفہ المنصور نے اسے دوبارہ بنوایا۔ یہ تعمیر جدید غالباً سنہ ۱۵۴ھ (سنہ ۷۷۱ء) میں ہوئی کیونکہ اسی سنہ کے حالات میں طبری اور ابن اثیر خبر دیتے ہیں کہ المنصور بیت المقدس آیا اور مسجد میں نماز ادا کی[1]۔ لیکن واضح رہے کہ المنصور کے دوبارہ تعمیر مسجد کا ان میں تذکرہ نہیں ہے بلکہ اس کا راوی وہی مثیر کا مصنف ہے۔ اس کی روایت میں دوسرے زلزلے سے مسجد کا دوبارہ گرنا اور ویران ہونا بھی مذکور ہے (جس کا دوسری تاریخوں میں بظاہر کوئی ذکر نہیں آتا) اور آخر میں بیان کیا ہے کہ اس کے جانشین المہدی نے اسے دوبارہ بنوایا

[1] طبری۔ سلسلہ سوم، صفحہ ۳۷۲ - ابن الاثیر، جلد پنجم، صفحہ ۴۶۷

باب سوم

اور طول گھٹا کے عرض بڑھا دیا۔ طبری وغیرہ میں مہدی کی اس تعمیر وغیرہ کا بھی کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ بہر حال مُشیر کی روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس تیسری تعمیر کو ۱۶۳ھ (۷۸۰ء) میں یا اس کے قریبی زمانے میں قرار دینا ہوگا کیونکہ طبری کے قول کے مطابق[1] اس سنہ میں خلیفہ المہدی بیت المقدس آیا اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ بے شبہ اسی موقع پر عمارت کی شکستہ حالت کا اسے علم ہوا ہوگا۔

۷۸۰ء میں خلیفہ مہدی کی تعمیر جدید کے بعد سے ۹۸۵ء تک جب کہ مقدسی نے اس کا حال لکھا، جہاں تک اہل تاریخ کو معلوم ہے مسجد اقصیٰ پر اور کوئی آفت نہیں آئی۔ البتہ اس سنہ سے کچھ ہی مدت پہلے، مقدسی بیان کرتا ہے کہ سنگ مرمر کے ستونوں کا ایک برآمدہ خراسان و مشرق کے مشہور والی عبداللہ ابن طاہر نے تعمیر کرایا تھا۔ مسجد کی صورت کے متعلق مقدسی سے پہلے کے قدیم جغرافیہ نویس کوئی کام کی بات ہمیں نہیں بتاتے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسے آئندہ اوراق میں، جہاں یہ حالات تمام و کمال ترجمہ کیے گئے ہیں، پیش کر دیا جائے گا لیکن ان عبارتوں کو ناظرین کے سامنے رکھنے سے قبل اور اس غرض سے کہ وہ قدیم اسلامی مصنفوں کی تحریروں کو جو حرم مقدس کے ساتھ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے حال میں انھوں نے چھوڑی ہیں، اچھی طرح سمجھ سکیں، یہ ضروری ہوگا کہ ہم لفظ مسجد کے اصطلاحی اور عربوں میں مروّجہ معنی کی صراحت کر دیں۔ عربوں کی ابتدائی مسجد کی خصوصیات جامع ابن طولون کے اس خاکے سے بخوبی ذہن میں آجاتی ہیں جو آئندہ ورق پر بطور نمونہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ قاہرہ کی سب سے قدیم مسجد ہے جسے احمد ابن طولون نے ۸۷۶ء یا ۲۶۵ھ کے قریب تعمیر کیا تھا۔ جیسا کہ اس سادہ خاکے سے معلوم ہوتا ہے، مسجد میں سب سے نمایاں شئے کھلا ہوا صحن ہے جس کے اندر اور چاروں طرف دالان یا صحنچیاں چلی جاتی ہیں کہ نمازیوں کو آرام ملے۔ صحن کا وہ رُخ جو قبلہ رو (یعنی مکہ شریف کی طرف)

[1] طبری سلسلۂ سوم، ص ۵۰۰۔

ہے اور جس طرف منہ کر کے نمازی قیام و سجود کرتے ہیں اسے اکہرے دالان کی بجائے زیادہ عریض بنایا ہے کہ زیادہ تعداد میں نمازی وہاں جمع ہو سکیں اور اسی لیئے اسکو "جامع" کہتے ہیں۔ ابن طولون کی مسجد میں اس حصے کے اندر ستونوں کی پانچ قطاریں ہیں اور پچھلی دیوار کے ساتھ ملکر یہ کل ایک دوسرے کے آگے پانچ دالان بن جاتے ہیں۔ آخری دالان کے وسط میں گویا دیوار کے اندر قبلہ رو مسجد کی سب سے بڑی محراب (۱) تعمیر کی ہے۔ اب یاد رکھنا چاہیئے کہ مسجد کے ہر بیان میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ آنیوالا صحن میں قبلہ رو کھڑا ہے اسی لیئے اس کے سامنے مسجد کی اصلی اور پٹی ہوئی عمارت المغطّیٰ یا المقدمّہ ہوگی پیچھے کی جانب صحن کی حد کا اکہرا یا دوہرا دالان جو سمت قبلہ سے مسجد کا بعید ترین حصہ ہوگا۔ اسے مسجد کا پائیں یا المؤخرہ کہتے
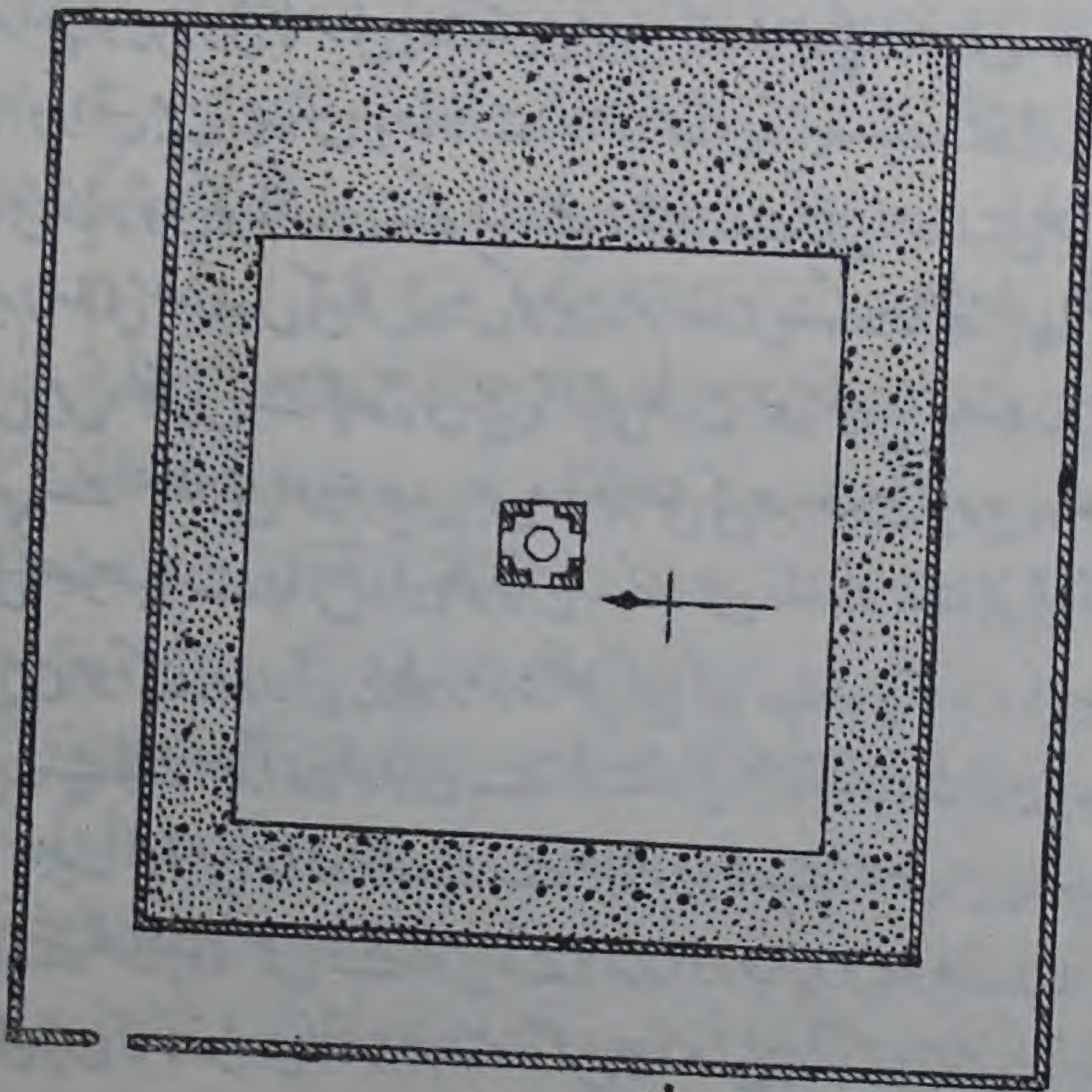
نقشہ بیت المقدس

ہیں۔ مسجد کا دست راست وہ دالان یا صحن کی حد ہوگی جو قبلہ رو کھڑے ہونے میں سیدھے
ہاتھ پر ہو اور دست چپ وہ جو بائیں ہاتھ پر رہے۔ صحن کی چار حدود یہی ہیں اور انکے اندر
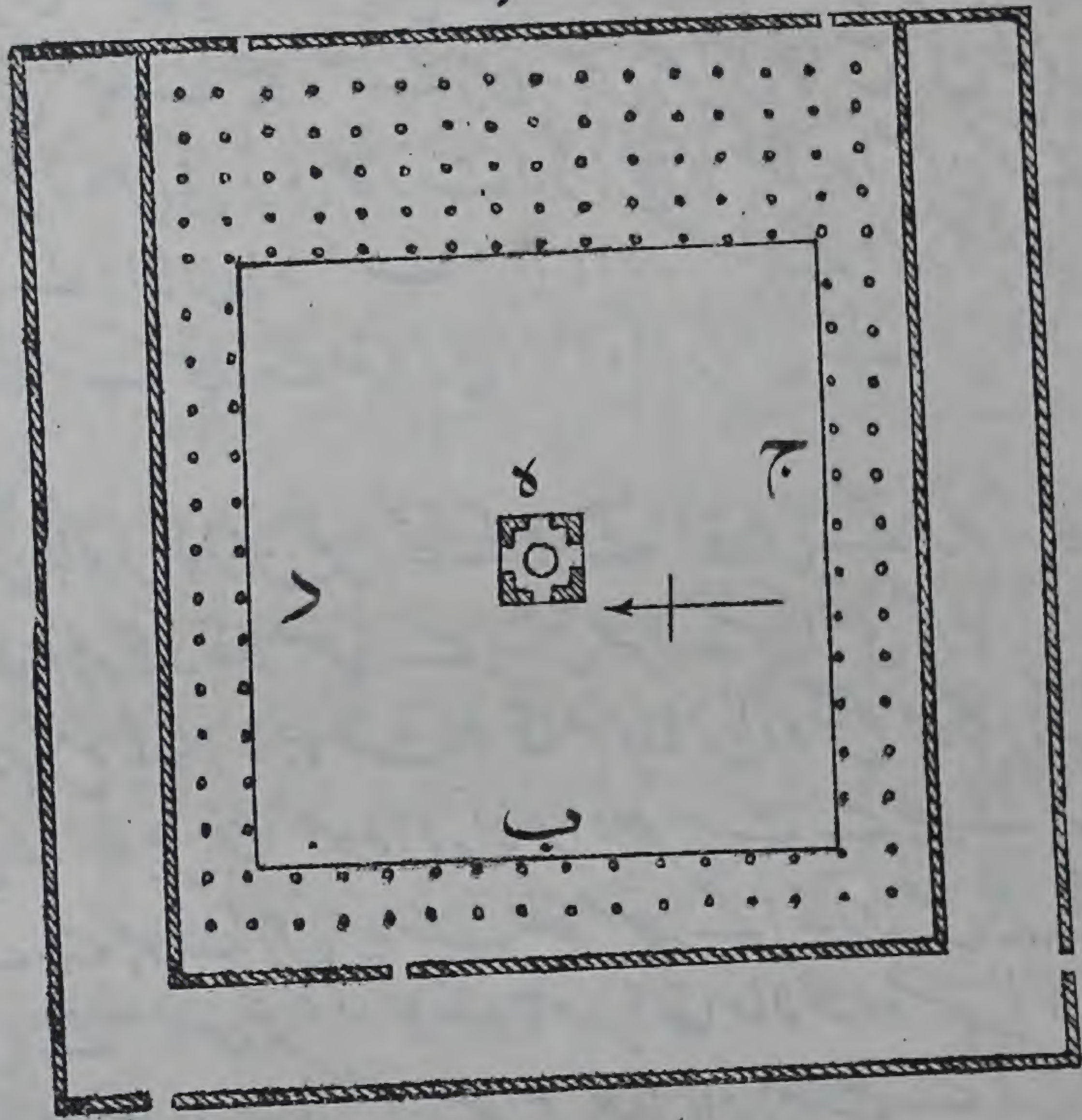
جامع مسجد ابن طولون
(پرانا قاہرہ)

اکثر دوسری عمارتیں جیسے مقابر یا حجرے بھی ہوتے ہیں۔ ابن طولون
کی مسجد میں بھی ایک گنبد بنا ہوا ہے (ہ) جس کو ابتدا میں اس
خیال سے بنایا تھا کہ بانی مسجد کے مقبرے کا کام دے لیکن
چونکہ اس کا بہت دور ملک شام میں انتقال ہوا لہذا بعد میں اس

عمارت میں وضو کا حوض بنوا لیا گیا ہے۔

اب یروشلم کے احاطۂ حرم کے عربی حالات پر نظر کیجئے تو یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ ان میں مسجد کا لفظ صرف مسجد اقصیٰ کی عمارت کے واسطے نہیں استعمال ہوا بلکہ پورے رقبۂ حرم کے معنی میں آیا ہے۔ (اسی مسجد سے جیسے مصری تلفظ نے "مسگد" اور ہسپانیولیوں نے "مزکوئیتا" بنایا، انگریزی لفظ "موسک" نکلا ہے) عربی میں مسجد کے لفظی معنی "جائے سجود" کے ہیں۔ پس ہم اسی جامع ابن طولون کی مثال کو لیں تو اس کی بڑی عمارت (ا) بیچ کا کھلا ہوا صحن، دائیں بائیں اور پیچھے کے دالان (د، ب، ج) اور صحن کے اندر کا گنبد (ﻫ) یہ سب کے سب مسجد کے ضروری اجزاء اور اس لئے اس لفظ کے اندر داخل ہیں۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کے بیت المقدس کے حرم شریف میں آیئے تو معلوم ہو گا کہ لفظ مسجد سے یہاں صرف مسجد اقصیٰ کی عمارت مراد نہیں ہے (جسے جامع یا نماز باجماعت کا مقام کہنا زیادہ صحیح ہو گا) بلکہ تمام وسیع احاطہ جس کے وسط میں قبۃ الصخرہ اور ادھر ادھر بہت سے چھوٹے گنبد، دالان اور کٹہرے بنے ہوئے ہیں، یہ سب لفظ مسجد کے اندر داخل ہیں۔ قبۃ الصخرہ کو فرنگیوں نے "مسجد عمرؓ" کا غلط نام دیا تھا حالانکہ وہ مسجد یا نماز باجماعت کا خاص مقام نہیں ہے بلکہ صحن مسجد میں جہاں اور بہت سے برج اور گنبد بنے ہوئے ہیں، یہ ان سب میں بڑا گنبد ہے جو اس موقع پر محض اس متبرک چٹان کے لئے تعمیر کرا دیا گیا تھا جو اس کے نیچے موجود ہے۔

عربی بیانات میں لفظ المسجد یا المسجد الاقصیٰ اور جامع یا جامع الاقصیٰ کے ہر جگہ بے امتیازی سے استعمال کرنے کے باعث بہت خلط مبحث ہو گیا ہے اور جب تک کسی نے حرم شریف کو خود اچھی طرح نہ دیکھا ہو، ان بیانات کا ترجمہ کرنے میں جا بجا اصل عبارت سے دھوکا کھائے گا۔ کیونکہ عربوں کی تحریر میں پوری عمارت اور جزو عمارت ہر موقع کے لئے بے تکلف مسجد کا

ایک ہی اصطلاحی لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ پھر مختلف مصنفوں کا معمول ایک دوسرے سے بہت فرق رکھتا ہے۔ مقدسی بلا استثنیٰ پورے رقبۂ حرم کو المسجد یا مسجد الاقصیٰ کے نام سے یاد کرتا ہے اور نماز کی وہ اصلی جگہ جسے ہم مسجد اقصیٰ کہتے ہیں، اسے ہر جگہ المغطیٰ (اپٹا ہوا حصہ) لکھتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر کہ ”مسجد میں تیرہ دروازوں سے داخل ہوتے ہیں“ کے معنی یہ ہیں کہ احاطہ حرم شریف کے تیرہ دروازے ہیں اسی طرح ”صحن کے دائیں ہاتھ پر“ کے معنی حرم کے احاطے کی مغربی دیوار ہے ”بائیں ہاتھ پر“ کا مطلب مشرقی دیوار سے ہے اور ”پائین“ سے حرم کی شمالی حد کی دیوار مراد ہے۔

ناصر خسرو جس نے اپنا سیاحت نامہ فارسی میں لکھا ہے، مسجد اقصیٰ کے صدر دالان کے لئے فارسی لفظ ”پوشش“ استعمال کرتا ہے جو عربی المغطیٰ کا پورا مرادف ہے۔ مگر بعض موقعوں پر اس مصنف نے مسجد اقصیٰ کو (جس معنی میں ہم اس نام سے یاد کرتے ہیں) مقصورہ کا لقب دیا ہے۔ اصل میں اس سے مراد وہ کٹہرے والا منبر ہے جس پر محراب کے مقابل میں کھڑے ہو کر سلطان تقریر کرتا تھا۔ لیکن مجازاً پوری عمارت کو جس میں منبر تھا مقصورہ کہنے لگے۔ حرم شریف کے وسیع صحن کو ناصر خسرو مسجد، یا مسجد اقصیٰ یا مسجد جمعہ ہی کہتا ہے۔

الفاظ کے اس ابہام کو دیکھ کر مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ سیاق عبارت کے مطابق جہاں ضرورت ہو، ”المسجد“ اور بعض دوسرے الفاظ کا بھی ترجمہ ”رقبۂ حرم“ یا ”حرم شریف“ کیا جائے اور دوسری طرف جہاں فی الواقع مسجد کی خاص عمارت مراد ہے وہاں مسجد اقصیٰ لکھا جائے تاکہ یورپی ناظرین کو مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ یہ اور لکھ دینا چاہئے کہ مسلمان مؤرخ اسی قسم کی بے پروائی قبۃ الصخرہ کے معاملے میں برتتے ہیں کہ اسے محض ”صخرہ“ یا چٹان لکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہمارے یورپ والے ”مزار مقدس“ کہہ دیتے ہیں حالانکہ مطلب اس کلیسا سے ہوتا ہے جو اس کے اوپر بنا ہوا ہے۔ ان تمہیدی فوائد کو ختم کرتے وقت یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ قبلہ یعنی مکہ معظمہ کی سمت ملک شام میں قریب قریب جنوب

کے مرادف ہوتی ہے۔ مصر میں جیسا کہ ابن طولون کی مسجد کے خاکے سے
ظاہر ہوتا ہے قبلہ مشرق کی سمت میں ہے۔ مسجدوں میں قبلے کی سمت،
ایک نیم قبہ محراب بنا کے نمایاں کی جاتی ہے جسے عام طور پر نقش و نگار
سے آراستہ کر دیتے ہیں۔ صدر محراب کے علاوہ مساجد میں اکثر
بہت سی چھوٹی محرابیں اور بھی ہوتی ہیں جن میں نماز یا خطبہ پڑھتے ہیں۔
جیسے کیتھولک گرجا میں صدر دالان کی اونچی قربان گاہ کے علاوہ
بہت سی چھوٹی قربان گاہیں اور کھانچیاں بھی بنی ہوتی ہیں "

مسجد اقصیٰ کی کیفیت :۔ مقدسی کے زمانے سے پہلے جو
صدی گزری اس میں شام و فلسطین، خلفائے بغداد کے قبضے سے
نکل گئے۔ سنہ ۲۶۴ھ (سنہ ۸۷۸ء) میں ان کے والی قاہرہ ابن طولون نے
خود مختاری کا دعویٰ کیا اور مصر پر قبضہ جما کے سارا شام فتح کر لیا۔
خاندان طولونیہ کی جنوبی شام اور فلسطین میں سنہ ۹۳۴ء تک حکومت
رہی جس کے بعد اخشیدیہ کا دور آیا۔ مگر اسے تھوڑی ہی مدت میں
فاطمی خلیفہ المعز نے سنہ ۹۶۹ء میں مصر و شام سے نکال باہر کیا۔
اسی خلیفہ کے جانشین العزیز کا عہد ہے جس میں مقدسی نے بیت المقدس
کے حالات سنہ ۹۸۵ء میں تحریر کیے ہیں "

مسجد اقصیٰ کی نسبت (سنہ مذکور میں) اس کا بیان حسب ذیل ہے:

"مسجد اقصیٰ (مسجد اور حرم شریف) شہر بیت المقدس کے
جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہیں۔ حرم کی سنگین چار دیواری کا
آثار، جس کی بنیاد داؤد نے رکھی تھی، عرض میں دس ہاتھ یا کچھ کم ہوگا۔
یہ نہایت سخت قسم کا پتھر ہے جسے تراش کر درست کیا اور ایک دوسرے
کے ساتھ جوڑ بٹھایا ہے۔ انہی پر خلیفہ عبدالملک نے بعد میں عمارت
اٹھائی اور چھوٹے مگر خوش قطع پتھر لگائے اور اوپر کنگرے بھی بنا دیے۔ یہ
مسجد دمشق کی مسجد سے بھی زیادہ خوبصورت ہے کیونکہ اسے بناتے
وقت بیت المقدس کا بڑا کلیسا بطور مدمقابل ان کے سامنے تھا۔

پیمانہ فٹوں میں

۱۰۰ ۵۰ ۰ ۱۰۰ ۲۰۰

نقشہ مسجد اقصیٰ

باب سوم
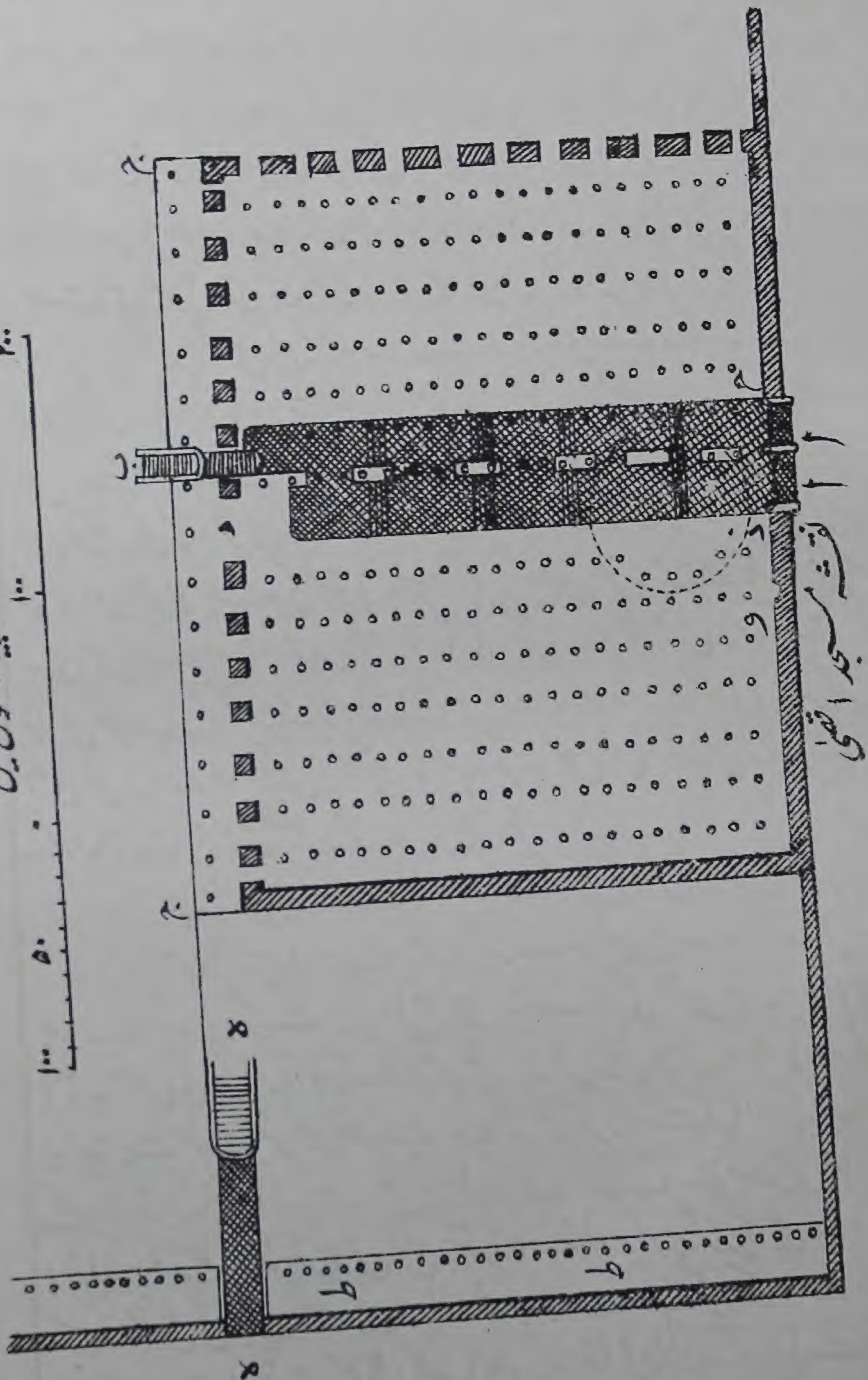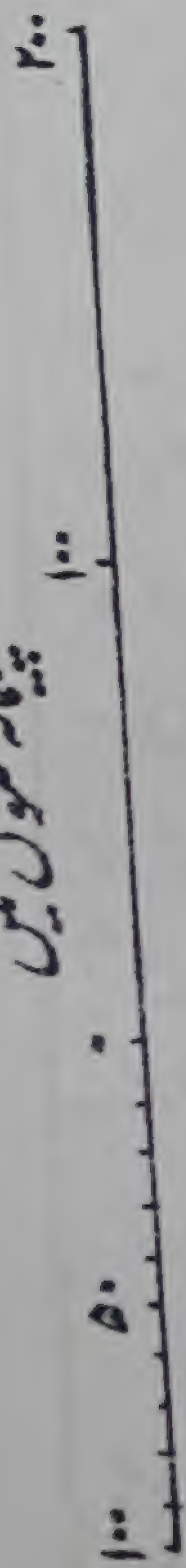
لہٰذا مسجد کو اس سے بھی زیادہ شاندار تعمیر کیا گیا۔ لیکن عباسی خلفا کے زمانے میں زلزلوں نے صدر دالان (= المغطیٰ) کو نقصان پہنچایا اور سچ یہ ہے کہ محراب کے گرد کے حصے کے سوا باقی ساری عمارت گر پڑی۔ جس وقت خلیفۂ وقت (المہدی) کو اس کی اطلاع ہوئی تو اسے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ خزانے میں اس وقت جو روپیہ موجود تھا وہ مسجد کو دوبارہ بنا دینے کیلئے کسی طرح کافی نہیں۔ تب اس نے تمام صوبوں کے والیوں اور فوجی سپہ سالاروں کو مراسلے لکھے کہ ان میں سے ہر شخص ایک ایک دالان کی تعمیر اپنے ذمے لے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور عمارت ایسی مضبوط اور زبردست تیار ہوگئی کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ نئی عمارت کے درمیان میں قدیم حصہ جو گرنے سے بچ گیا تھا' باقی رہا اور نئی عمارت کی زینت بن گیا۔ اس کی حد وہاں تک ہے جہاں تک سنگ مرمر کے ستون ہیں۔ اس کے آگے جہاں چونے گچی کے ستون شروع ہوتے ہیں وہاں سے نئی تعمیر ہے۔ مسجد اقصیٰ کی صدر عمارت کے چھبیس دروازے ہیں۔ محراب کے مقابل کا دروازہ (جو) باب النحاس (کلاں) کہلاتا ہے۔ اس کے کواڑوں پر پیتل چڑھایا ہے اور اتنا وزنی ہے کہ نہایت طاقتور آدمی ہی ان کو چول پر جنبش دے سکتا ہے۔ اس دروازے کی دائیں طرف سات اور بڑے در ہیں۔ ان میں سے وسطی کے کواڑ اسی طرح جلا کی ہوئی تختیوں کے ہیں اور اسی ترتیب سے بائیں طرف سات در ہیں۔ پھر مسجد کے شرقی پہلو پر گیارہ در سادہ بنے ہوئے ہیں۔ ان پندرہ دروں میں، جن کا پہلے ذکر ہوا، سنگ مرمر کے ستون لگا کے عبداللہ ابن طاہر[1] نے بعد میں دالان تیار کرا دیا ہو۔

صحن کے دائیں طرف (یعنی احاطہ حرم کی مغربی دیوار سے ملے ہوئے) دالان ہیں جن کے ستون سنگ مرمر کے اور اندر صندلا کیا ہے۔ پیچھے کے رخ (یعنی حرم کی شمالی دیوار سے متصل) پتھروں کو کھود کر دالان نکالے ہیں۔ مسجد کے صدر دالان کے وسطی حصے پر بہت بڑی اور اونچی زاویہ نما لداو کی چھت ہے۔ جسکے اوپر

[1] ۔ طاہریہ خاندان میں تیسرا، خراسان اور ولایات شرقی کا آزاد والی از ۸۲۸ تا ۸۴۴ء ہو

عالیشان گنبد بنا ہوا ہے۔ پچھلے حصے کے دالانوں کو چھوڑ کر (جو احاطۂ حرم کی شمالی دیوار سے ملے چلے گئے ہیں) باقی سب چھتوں میں سیسے کی چادریں چڑھا دی ہیں لیکن پچھلے حصے کی چھت میں رنگین پتھر جڑ دیئے ہیں ؛

بائیں طرف (یعنی احاطۂ حرم کے مشرقی رخ) دالان نہیں ہیں ۔ مسجد اقصیٰ کا صدر دالان، احاطۂ حرم کی مشرقی دیوار تک نہیں آتا کیونکہ کہتے ہیں اس عمارت کی تکمیل کبھی ہونے نہ پائی ۔ اس کے دو سبب بیان کیے جاتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حکم دیا کہ مسلمانوں کی نماز کے واسطے احاطۂ حرم شریف کے مغربی حصے میں عمارت بنائی جائے ۔ چنانچہ یہ حصہ جو کہ جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے خالی چھوڑ دیا گیا کہ آنحضرتؐ کے ارشاد سے تجاوز ہونے نہ پائے ؛ دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ احاطہ کے اس جنوب مشرقی گوشے تک عمارت بڑھاتے تو آخری درجے میں مسجد کی جو بڑی محراب بنی ہوئی ہے وہ اس چٹان کے عین مقابل میں نہ آتی جس پر قبہ بنایا گیا ہے اور یہ صورت بنانے والوں کو کسی طرح پسند نہ تھی ۔ لیکن اصل حقیقت خدا ہی خوب جانتا ہے" (مقدسی - ۱۶۸ تا ۱۶۹) ؛

آگے چل کے مقدسی نے مسجد اقصیٰ کے ایک طلسم کا حال بھی تحریر کیا ہے اور چند سال بعد ابو ریحان البیرونی کی تحریر ۱۰۰۰ء (سنہ ۳۹۰ ہجری) میں بھی یہ تذکرہ ہے کہ مصنف نے ان عجائب نقوش کو دیکھا تھا[1] ۔ مقدسی کا بیان حسب ذیل ہے :۔

"بیت المقدس میں سانپوں کے کاٹے کا اثر زائل کرنے کا ایک عمل بھی ہے جو بڑی مسجد کے منبر کے پیچھے ایک سنگ مرمر کی تختی پر کھدا ہوا ہے۔ اس میں "محمد رسول اللہ صلعم" اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے الفاظ کندہ ہیں"؛ (مقدسی - ۱۸۶)

ابن الفقیہ جس نے مقدسی سے آٹھ سال قبل کتاب لکھی ہے (سنہ ۹۰۳ء)

---

[1] آثار الباقیہ - ترجمہ سخاؤ، ص ۲۹۴ -

اس طلسم کا ذکر کرتا ہے۔ مستورات کے واسطے کٹہرے لگا کے جو مقصورات بنائے تھے، ابن الفقیہ نے ان کا بھی حال لکھا ہے لیکن ستر یا اسّی ہاتھ ضرب پچاس ہاتھ کا جو عرض و طول اس نے بتایا ہے، اسے پڑھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مقصورے مسجد اقصیٰ کے اندر کس طرح ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے اقصیٰ کا مطلب یہاں پورا احاطہ ہو اور یہ مقصورات بیرونی صحن میں واقع ہوں جیسا کہ ایک اور ہمعصر ابن عبد ربہ کے قول سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ بہرحال ابن فقیہ لکھتا ہے کہ "اقصیٰ کی محراب کے دائیں طرف ایک لوح لگی ہوئی ہے اور اس میں دائرہ بنا کے "محمد" کندہ کیا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پھر قبلے کی پشت کی (یعنی جنوبی) دیوار میں ایک سفید پتھر پر یہ الفاظ کندہ ہیں:—
"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" محمد رسول اللہ صلعم اور حمزہؓ ان کے مددگار تھے۔ مسجد اقصیٰ میں تین مقصورات عورتوں کے واسطے ہیں اور ہر ایک طول میں ستر ہاتھ ہے" (صفحہ ۱۰۰)۔

مقصورات کی نسبت ابن عبد ربہ کی عبارت یہ ہے:۔ "مسجد میں تین مقصورات عورتوں کے واسطے بنے ہوئے ہیں۔ اور ہر ایک کی لمبائی اسّی اور چوڑائی پچاس ہاتھ ہے" (جلد سوم – ۳۶۷)

مسجد کے دروں کی تعداد مقدسی نے چھبیس بتائی ہے جن میں سے پندرہ شمال رویہ اور گیارہ شرق رویہ تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانے میں عمارت کا نقشہ آجکل کے نقشے سے بالکل مختلف تھا اور یہ مسجد کی گزشتہ اور آئندہ اوراق میں تصویروں کے دیکھنے سے واضح ہو گا[۱] جو اصل میں ۳۰۰ھ (۹۱۰ء)

[۱] کتاب کے صفحات ۹۹ اور ۱۰۲ کے مقابل جو نقشے لگے ہیں ان کا خیال مجھے سب سے پہلے پروفیسر ہائٹر لیوس نے دلایا (ملاحظہ ہو ان کا مضمون "پیلسٹائن ایکس پلوریشن فنڈ" کی "کوارٹرلی اسٹیٹ مینٹ" بابت ماہ جنوری ۱۸۸۸ء میں) لیکن میرے نقشے ان کے نقشوں سے کسی قدر مختلف ہیں کہ انھیں میں نے ناصر خسرو کی پیمائش کے مطابق، جو اس نے ۱۰۴۷ء میں مسجد کو دیکھ کر لکھی ہے، تیار کرایا ہے۔

باب پنجم

اور ۴۲۵ھ (۱۰۳۴ء) میں شام میں بڑے نقصان رسان زلزلے آئے جیسا کہ ابن اثیر کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس مورخ کا بیان ہے کہ ۴۰۷ھ میں بیت المقدس کی چٹان کے اوپر کا بڑا گنبد گر پڑا[۱۲۵] اور ۴۲۵ھ میں مصر و شام میں بہت سے زلزلے آئے۔ سب سے زیادہ نقصان الرّملہ میں ہوا کہ کئی روز تک شہر کے باشندے گھروں سے باہر پڑے رہے تقریباً ایک تہائی شہر منہدم ہو گیا اور بہت سے لوگ دب دب کر مر گئے[۱۲۶]۔

الرّملہ کے نقصانات کا ذکر ہم آیندہ اوراق میں کرینگے (دیکھو باب ہشتم)

یہاں بیت المقدس کے حرم کا حال لکھنا ہے کہ ۴۲۵ھ کے زلزلے سے احاطۂ حرم کی بیرونی دیوار کو بہت کافی نقصان پہنچا اور ایک کتبہ جو ہنوز اپنی اصلی جگہ پر موجود ہے اس تاریخ کو بتاتا ہے جب کہ فاطمی خلیفہ الظاہر کے حکم سے اسے ازسرنو بنایا گیا۔ ایم ڈووگوے نے اس کتبے کی جو حرم کی دیوار کے پتھر پر ثبت ہے پوری عبارت اپنی جلیل الشان کتاب "De Temple De Jerusalem" میں نقل کی ہے (ص ۷۷)، وہ لکھتا ہے کہ کسی قدر خراب حالت میں ہونے کے باوجود اسے مہد مسیحؑ کے قریب، جنوب مشرقی گوشے کے دو ٹکڑوں پر صاف صاف پڑھ سکتے ہیں۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"امیر المومنین امام الظاہر لاعزاز دین اللہ کے زمانے ..... جنوب کی بیرونی دیوار اور .... (مشرق کی ؟) بیرونی دیوار .... بسنہ چارسو پچیس۔"

اسی زمانے میں مسجد اقصیٰ کے صدمہ پہنچنے کی شہادت وہ کتبہ ہے جسے کتابت کے ایکسو چالیس برس بعد گنبد کی چھت میں علی ہروی نے لکھا دیکھا تھا جو ۱۱۷۳ء میں جب کہ شہر مسیحی مجاہدین ہی کے قبضے میں تھا، یہاں آیا تھا معلوم ہوتا ہے اب یہ کتبہ نظر نہیں آتا۔ کم سے کم ڈووگے نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن احتیاط سے تحقیقات کی جائے تو ممکن ہے کہ اس کا پتہ چل جائے۔ کیونکہ علی ہروی کی شہادت بہت قوی ہے جیسا کہ

---

۱۲۵ و ۱۲۶ ۔ ابن الاثیر ۔ جلد نہم ۱۰۹ و ۲۹۶ تو

ذیل کے ترجمہ سے ظاہر ہوگا[1]

"مسجد اقصیٰ۔ حضرت عمرؓ کی محراب اسی مسجد میں ہے۔ فرنگیوں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نے اس کی چھت میں یہ کتبہ لکھا دیکھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٭ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ اللہ تعالیٰ اپنے خادم و نائب امیر المومنین علی ابوالحسن الظاہر لاعزاز دین اللہ کی نصرت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس پر اور اس کے اجداد امجاد و اخلاف سعید پر۔ اس گنبد کی ازسرنو تعمیر اور جلا کا حکم ہمارے محبوب و محترم حاکم امیر المومنین کے خادم خاص و جاں نثار ابوالقاسم علی ابن احمد نے ہمیں دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا حامی و مددگار ہو۔ یہ (تعمیر کا) کا پورا کام ۴۲۶ھ ماہ ذی قعدہ کی آخری تاریخ اتمام کو پہنچا۔ عمارت کی نگرانی جس کے سپرد تھی وہ معمار عبداللہ ابن الحسن القاہری تھا۔"

علی ہروی لکھتا ہے کہ یہ کتبہ اور دروازے سب پر سونے سے مینا کاری کی ہوئی ہے اور فرنگیوں نے اس کو نہیں چھوا نہ اور کسی طرح خراب کیا۔

مقدسی نے مسجد اقصیٰ کی جو کیفیت ۹۸۵ء میں لکھی ہے وہ ناصر خسرو کے بیان کے مطابق ہے جو اس کے ساٹھ سال بعد (۱۰۴۶ء میں) بیت المقدس آیا تھا۔ اور ان دونوں بیانات کو سامنے رکھ کر ہم اس عالیشان مسجد کا صلیبیوں کے آنے سے قبل ہو بہو تصور قائم کر سکتے ہیں۔ مقدسی کا بیان اور ناصر خسرو کے مشاہدے میں فرق ہے تو دروں کی تعداد کے بارے میں ہے مقدسی کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں پندرہ دروازے جانب شمال اور گیارہ مشرق کی طرف تھے۔ بحالیکہ ایرانی سیاح نے شمال میں صرف سات اور مشرق رویہ دس در دیکھے۔ علاوہ ازیں ناصر خسرو ابن طاہر کے دالان کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا

[1]: میں نے یہ ترجمہ بوڈلین کے نسخے (ورق ۳۶ پشت) سے کیا ہے۔ کتبے کے طلجانے کے امکان کو پیش نظر رکھ کے میں نے اصل عربی عبارت پیلسٹائن فنڈ کی "کوارٹرلی اسٹیٹمنٹ" بابتہ ماہ اکتوبر ۱۸۸۸ء میں چھاپ دی ہے۔ صفحہ ۲۸۰۔

باب سوم

جو مقدسی کے قول کے بموجب شمالی دروازوں کے آگے بطور برآمدے کے بنایا گیا تھا؛

اس فرق کا سبب یقیناً ۴۰۷ھ اور ۴۲۵ھ کے وہ زلزلے ہیں جو مقدسی کے زمانے اور ناصر خسرو کی سیاحت کے مابین آئے تھے۔ ضرور ہے کہ انہی میں ابن طاہر کا دالان اور اقصیٰ کی شمالی دیوار گر پڑی جو پندرہ دروازوں کے نکالے جانے کے باعث پہلے ہی کمزور ہو گئی۔ اس کے بعد جب دوبارہ اسے بنایا تو پندرہ کی بجائے پانچ دروازے شمالی دیوار میں چھوڑے اور مشرقی دیوار میں، مقدسی کے گیارہ دروازوں میں سے ایک کو تیغہ کر دیا کہ کل دس رہ گئے جس حال میں ناصر خسرو نے انھیں دیکھا؛

ایرانی سیاح نے مسجد کے کل ستونوں کی تعداد ۲۸۰ بتائی ہے۔ اسے پڑھکر ایک حد تک ستونوں کا وہ بن یاد آتا ہے جو اس وقت بھی قرطبہ کی اموی مسجد میں (جس سے آجکل کلیسا کا کام لیتے ہیں) ہم دیکھتے ہیں۔ اقصیٰ کا اس قرطبہ کی مسجد سے کسی حد تک مشابہ ہونا ادریسی کے بیان (صفحہ ۱۰۸) سے مترشح ہے جس نے باہمی عرض و طول کا مقابلہ کرنے کی غرض سے دونوں کا ساتھ ذکر کیا ہے۔ قرطبہ کی مسجد ۷۸۶ء میں بننی شروع ہوئی اور اندلسی بادشاہ عبدالرحمن اوّل کے دو جانشینوں کے عہد میں تکمیل کو پہنچی۔ اس کے ۴۳۵ فیٹ طول عرض ۷۸۳ فیٹ عرض میں آج بھی ۸۵۰ ستون موجود ہیں۔ اس طرح یہ ہسپانوی مسجد ناصر خسرو کے زمانے کی مسجد اقصیٰ سے رقبے میں دگنی سے بھی زیادہ ہوئی (جیسا کہ طول و عرض کے حساب سے آیندہ واضح ہوگا) اور ۱۰۴۷ء میں مسجد اقصیٰ میں جتنے ستون نظر آتے تھے اُن سے اندلسی عمارت میں سہ گُنے سے بھی کچھ زیادہ تھے[۱]؛

[۱] قرطبہ کی مسجد میں ابتداءً طول میں گیارہ دالان تھے جن میں مشرق کی طرف ہشام نے آٹھ کا اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح شروع میں یہ مسجدِ اقصیٰ سے اور بھی زیادہ مماثلت رکھتی تھی۔ اول اول ستونوں کی کل تیس قطاریں بنائی تھیں جو بے شبہ تناسب ترتیب میں قائم ہوں گے مگر آج کل بہت سے ستون غائب اور بعض خلاف محل لگا دئے ہیں کہ اس بوالعجب غوطی عبادت خانے کی جگہ نکل آئے جو چارلس پنجم کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا (ملاحظہ ہو "Monumentos Arabes" مطبوعہ ۱۸۷۶ء صفحہ ۴۲)

لیکن اپنے سلسلۂ بیان کی طرف پھر عود کیجیے کہ ناصر خسرو نے ستونوں کی جو تعداد ۲۸۰ بتائی ہے وہ شمالی دیوار کے چودہ دروازوں سے قطاریں تصور کی جائیں تو جنوب یعنی قبلے کی طرف چودہ دالانوں میں مسجد کو بخوبی منقسم کر دیتی ہے۔ جن کا مقدسی نے حال بیان کیا ہے۔ اسی لیئے میں سمجھتا ہوں یہ یقینی بات ہے کہ مقدسی کے وقت میں بھی چودہ چودہ ستونوں کی یہ بیس قطاریں موجود تھیں اور ہر ستون دوسرے سے ۶ درع (= ۱۲ فیٹ) کے فاصلے پر تھا۔ اسی قیاس پر ہم نے مسجد اقصٰی کا پچھلا اور آیندہ خاکہ تیار کیا ہے۔[1]

مسجد کا ٹھیک عرض و طول بھی سب سے پہلے ناصر خسرو نے قلمبند کیا۔ اس نے دو جگہ لکھا ہے کہ مشرقی دیوار، یعنی شمال سے جنوب تک مسجد کی لمبائی چار سو بیس درع تھی اور شمالی دیوار یعنی چوڑائی کا ناپ ایک سو پچاس درع تھا۔ اس حساب سے ۱۵۰ درع یا تین سو فیٹ کی چوڑائی ناصر خسرو کے باقی ماندہ بیان اور نیز مقدسی کی تحریر اور رقبۂ حرم کی موجودہ مساحت کے مطابق ہے۔ لیکن چار سو بیس درع یا اٹھ سو چالیس فیٹ کا جو طول اس نے لکھا ہے، وہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس پیمائش میں تو حرم کی جنوبی دیوار سے لے کر مسجد کے شمالی دروازے اور قبۃ الصخرہ کے پار کا چبوترہ تک آجائے گا۔ البتہ چار سو بیس کی بجائے ایک سو بیس پڑھا جائے تو پھر کوئی دقت باقی نہیں رہتی اس طرح ۲۴۰ فیٹ کے اندر ناصر خسرو کی دیکھی ہوئی مسجد کے دروازے اور شمالی دیوار آجاتے ہیں جس طرح مسجد کے دروازے اور شمالی دیوار آج بھی موجود ہیں۔ ان شمالی دروازوں کے درمیان جو دیواریں ابھی تک بنی ہوئی ہیں ان کے خاصے بڑے بڑے ٹکڑے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ (ایم دوگے کے بیان کے مطابق) وہ قدیم تعمیر سے ہیں[1]۔ اور اس سے یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ المہدی نے اپنے زمانے میں از سر نو تعمیر کرتے وقت مسجد کی شمالی دیوار جس خط پر بنائی تھی

[1] دیکھو دو دو گے کا خاکہ کتاب ذرو شلم میں (لوح ..) نیز ہماری (انگریزی کتاب کا نقشہ مقابل صفحہ ۱۱۰)

اور طول کم کر کے عرض بڑھا دیا تھا (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) اس زمانے کی دیواریں بھی انہی آثار پر اٹھائی گئی ہیں۔

احاطہ حرم کے جنوب مشرقی گوشے اور اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے مابین صحن کا جو طول کسرات چھوڑ کر ناصر خسرو نے دو سو درع بتایا ہے وہ بالکل درست ہے اور اگر اوپر کی پیمائش کے مطابق حدود اربعہ بنائی جائیں تو اسی قدر صحن بیچ میں رہے گا۔

ناصر خسرو کی اصل عبارت کا (مسجد کے بارے میں) ترجمہ حسب ذیل ہے:
"مسجد جمعہ، جو مسجد اقصیٰ ہے، شہر کے مشرقی رخ پر واقع ہے اور جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اس کی (یعنی احاطہ حرم کی) ایک دیوار وادی جہنم کے سرے پر ہے۔ اس دیوار کو احاطے کے باہر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سو درع تک یہ بغیر چونا گچی کے صرف بڑے بڑے پتھر جما کے تیار کی گئی ہے۔ مسجد (= حرم) کے اندرونی رخ دیوار کا بالائی حصہ بالکل مسطح ہے۔ مسجد اقصیٰ کو یہ رتبہ بلند قبۃ الصخرہ کی بدولت حاصل ہوا ہے۔" (ص ۲۶)

مہد مسیح کی کیفیت لکھنے کے بعد (دیکھو اس کتاب کا باب پنجم) اسی سلسلے میں ناصر خسرو تحریر کرتا ہے کہ "احاطہ حرم کے جنوب مشرقی کونے کے نزدیک مہد مسیح (کی مسجد) کے دروازے سے آگے بڑھو تو وہ خوبصورت اور بڑی مسجد ملیگی جو مہد مسیح کی مسجد سے جدا اور اس کی نسبت کئی گنا بڑی ہے۔ یہ مسجد اقصیٰ کہلاتی ہے اور اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اپنے حبیب صلعم کو معراج کی رات مکہ معظمہ سے اسی تک پہنچایا تھا اور یہیں سے وہ آسمان پر تشریف لے گئے جیسا کہ قران شریف میں ارشاد فرمایا ہے:-
سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ، (بنی اسرائیل) اس مقام پر لوگوں نے کمال ہنرمندی سے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ اس میں خوبصورت قالینوں کا فرش ہے۔ ہمیشہ موجود رہنے اور کام کرنے کے لیے خاص خدام مقرر ہیں۔

جنوب مشرقی گوشے سے (حرم کی) جنوبی دیوار کے سہارے

چلئے تو دو سو درع تک اور کوئی عمارت نہیں ہے۔ یہ گویا (احاطہ حرم کے) صحن کا حصہ ہے۔ مسجد کی صدر عمارت[1] بہت وسیع ہے اور اس میں وہ مقصورہ (اعیان و امراء کے لیے) بھی ہے جسے حرم کی جنوبی دیوار کے مقابل بنایا ہے (مسجد کی) صدر عمارت کی مغربی دیوار چار سو بیس درع (اسے ایکسو بیس درع پڑھنا چاہیے) ہے اور چوڑائی ایکسو پچاس درع[2]۔ مسجد میں دو سو اسی سنگ مرمر کے ستون ہیں جن پر سنگی کمانیں قائم ہیں۔ ستون اور پائے دونوں کو سیسے سے جمایا ہے کہ اس سے محکم تر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ ستونوں کی قطاروں کا باہمی فاصلہ ۶ درع ہے۔ مسجد میں ہر جگہ رنگین سنگ مرمر سے زینت بڑھائی ہے اور جوڑوں میں سیسہ بھرا ہے۔ مقصورہ (نقشہ محاذی صفحۂ آئندہ کا ج ج) مسجد کی جنوبی دیوار کے وسط کے مقابل ہے اور اس کی وسعت اتنی ہے کہ اندر ساٹھ ستون آ گئے ہیں۔ اوپر ایک عظیم الشان گنبد بنا ہوا ہے جس میں اسی قسم کی میناکاری کی ہے جیسی حرم شریف میں اور جگہ بھی نظر آتی ہے۔ اس جگہ مغربی شطرنجی کا فرش ہے اور علٰحدہ علٰحدہ زنجیروں میں فانوس اور قندیلیں آویزاں ہیں۔

بڑی روبقبلہ محراب (نقشے میں ز) پر میناکاری کی ہے[3] اور اس کے دونوں جانب سنگ مرمر کے ستون ہیں جن کا رنگ عقیق احمر کا ہے۔ مقصورہ کے گرد جو پردے کی دیوار کھنچی ہے اسے بھی رنگین سنگ مرمر سے بنایا ہے۔ بڑی محراب

---

[1] ۔ فارسی میں لفظ "پوشش" استعمال کیا ہے جو عربی اصطلاح "مغطّیٰ" کے مرادف ہے۔

[2] ۔ یہ برطانی متحف کے قلمی نسخے کے اعداد ہیں اور شیفر کے فرانسیسی ترجمے میں بھی یہی اعداد لکھے ہیں لیکن اس کے متن میں جو عبارت لکھی ہے وہ خود اس کے ترجمے اور برطانی نسخے دونوں سے مختلف ہے اور وہ یہ کہ مسجد اقصیٰ کی صدر عمارت بہت وسیع ہے۔ اسکا طول چار سو آٹھ ہے اور جنوب دیوار کے مقابل جانب راست مقصورہ بنا ہوا ہے۔ صدر عمارت کا مغربی رخ چوڑائی میں چار سو پچاس درع ہے" مگر میں نے چار سو بیس کی بجائے ایکسو بیس کا جو مہندسہ فرض کیا ہے، اس کی وجہ اوپر بیان کر آیا ہوں۔

[3] اس زمانے کی محراب سلطان صلاح الدین رح کے عہد کی یادگار ہے۔ دیکھو اوراق آئندہ۔
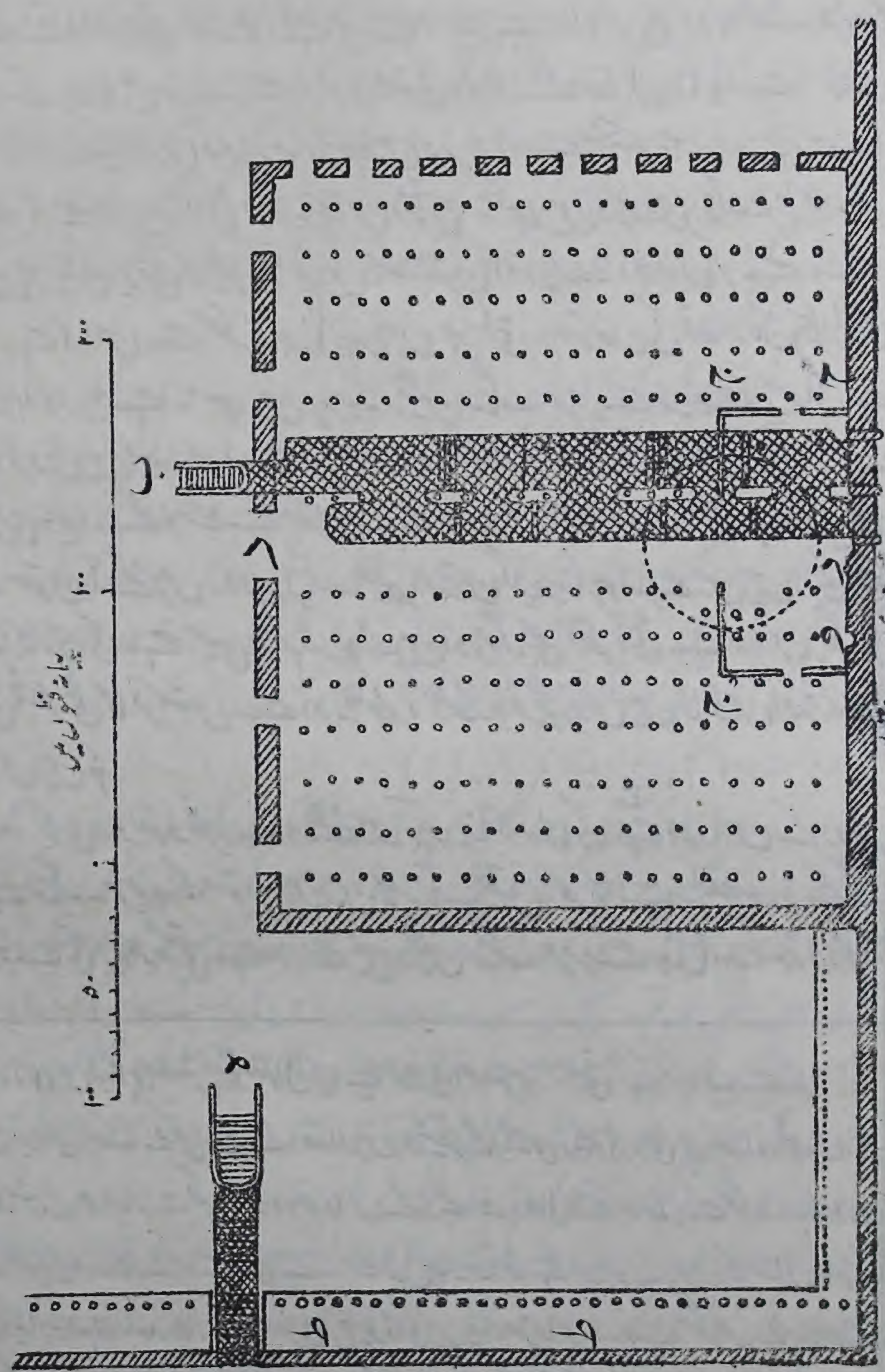
نقشۂ مسجد اقصیٰ

کے سیدھے ہاتھ پر (امیر معاویہ رضؓ کی محراب ہے (تو) اور بائیں طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی (نقشے میں ح) مسجد کی چھت چوبی بنائی ہے اور نہایت خوبصورتی سے اسے تراشا ہے۔ مقصورہ کی دیواروں اور دروازوں کے باہر اور شمال اور شرق رویہ صحن کی جانب پندرہ راستے ہیں اور ہر ایک میں نہایت خوبصورت کواڑ لگائے ہیں۔ ان کے دروں کی بلندی دس ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ ہے۔ ان میں سے دس مسجد کی شرقی دیواریں ہیں اور پانچ اس کے عرض یعنی شمالی دیوار میں۔ اس شرقی دیوار کا کل طول چار سو بیس درع اور شمالی دیوار کا ایک سو پچاس درع ہے۔ انہی بڑے دروں میں سے ایک پیتل کا ہے جس کو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے بنایا ہے کہ دیکھنے والے کو سونے کا معلوم ہوتا ہے جیسے بھٹی کی چاندی میں جڑ کے جلا کر دیا ہو۔ اس پر خلیفہ المامون کا نام ہے اور کہتے ہیں اسی نے بغداد سے بھجوایا تھا۔ جس وقت یہ سب در کھولدیئے جاتے ہیں تو اندر کی عمارت ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ گویا کھلا ہوا زیر سما صحن ہے آندھی مینہ کے موقع پر ان دروں کو بند کر دیتے ہیں اور اس وقت روشنی روشندانوں میں سے آتی ہے۔ مسجد کی صدر عمارت میں چاروں طرف صندوق کنارے سے لگے رکھے رہتے ہیں اور ہر صندوق شام و عراق کے کسی خاص شہر کا ہے۔ انکے قریب مجاورین یا وہ زائرین جو ایک مدت سے بیت المقدس میں مقیم ہیں، آکر بیٹھ جاتے ہیں جیسا کہ مکہ معظمہ میں دستور ہے زاداللہ سبحانہ شرفہا (ناصر خسرو ۳۴ تا ۳۸)

۱۴ ر جولائی ۱۰۹۹ئہ کے دن، صلیبی مجاہدین گوڈفری ڈی بوئلون کی سپہ سالاری میں شہر مقدس پر قابض ہوئے۔ احاطۂ حرم "شہسواران دیر" (نائٹس اوف دی اورڈر اوف دی ٹیمپل = الداویہ) کے تفویض کیا گیا جن کا جدید طبقہ اسی زمانے

۱؎ ناصر خسرو کے سفرنامے کے ترجمے میں ایم شیفر نے ایک ذیلی حاشیہ لکھا ہے کہ خلیفہ المامون کا یہ کتبہ ابتک موجود ہے (صفحہ ۱۰ حاشیہ ۲) لیکن میں اس قول کو غلط سمجھتا ہوں۔ کم سے کم ڈووگے کی کتاب ژرو شلم (ص ۸۶) جس کا شیفر نے حوالہ دیا ہے اس میں تو یہ لکھا ہوا نہیں ہے۔

میں بنایا گیا تھا۔ یہ انتساب حقیقت میں قبۃ الصخرہ سے تھا، جسے صلیبی مجاہد مسیحؑ کے زمانے کا ویر سمجھتے اور اسی لیے "ٹمپلم ڈومینی" موسوم کرتے تھے۔ اس کے برخلاف مسجد اقصیٰ "پے لے ٹیم" یا "ٹمپلم سالومونیس" کہلاتی تھی۔ مسجد اور احاطۂ حرم کے قریبی حصّوں میں ان شہسواران دَیر نے کافی رد و بدل کی لیکن قبۃ الصخرہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ انھوں نے اقصیٰ کے مغرب میں احاطۂ حرم کی جنوبی دیوار سے ملا ہوا سلاح خانہ وہاں تعمیر کیا جہاں ناصر خسرو نے محراب دار برآمدہ بتایا ہے (دیکھو باب پنجم) احاطۂ حرم کے جنوب مشرقی زاویے میں مہد مسیحؑ سے مغرب کی طرف ہٹ کر جو بیوتات بنے ہوئے تھے، وہاں ان صلیبیوں کے گھوڑے باندھے جاتے تھے اور یہاں سے آمد و رفت کا راستہ غالباً قدیم "سہ درہ" یا "اکدرہ" تھا (دیکھو باب پنجم)

صقالی جغرافیہ نویس ادریسی جو شاہ راجر کی سرکار میں تھا، بارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصّے میں مسجد اقصیٰ کی جو کیفیت تھی، اس کے متعلق ذیل کی مختصر یادداشت لکھ گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے آغاز کتاب میں بیان کردیا ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً ادریسی خود کبھی بیت المقدس نہیں آیا تھا لہٰذا اس کی معلومات کا ماخذ شاہ راجر کے کتب خانے کی کتابیں ہوں گی یا واپس آنے والے زائرین قدس کے بیانات۔ بہرحال ادریسی کا بیان یہ ہے کہ

"کلیسائے اعظم کے بعد مشرق میں آگے بڑھیے تو سلیمانؑ خلف داودؑ کا بنایا ہوا مکان آتا ہے۔ یہودیوں کے زمانے میں یہ بھی مسجد یا عبادت گاہ تھا جس کی زیارت کی جاتی تھی لیکن اسے ان کے ہاتھ سے لے لیا گیا اور انھیں یہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی دور آیا تو شاہان اسلام کے عہد میں اس مقام کی پھر مسجد اقصیٰ کے نام سے تعظیم و تکریم ہونے لگی۔

مسجد اقصیٰ بیت المقدس کی بڑی مسجد ہے اور دنیا بھر میں اس سے زیادہ عرض و طول کی کوئی مسجد نہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ اندلس کی قرطبہ والی مسجد جمعہ اس سے بھی زیادہ وسیع مانی جائے کہ اس کی چھت کو لوگ اقصیٰ سے زیادہ بڑا بتاتے ہیں۔ پھر بھی اقصیٰ کا صحن (یعنی احاطۂ حرم) قرطبہ کی مسجد کے

صحن سے بڑا ہے۔ یہ (احاطہ حرم) چوکور ہے اور طول میں دو سو عرض میں ایک سو اسّی بلی (باع) اس کی پیمائش ہے۔ احاطۂ حرم کے اس نصف حصّے میں جو محراب کی جانب ہے، مسجد کی صدر عمارت اور ستونوں کی متعدد قطاروں پر سنگین گنبد بنے ہوئے ہیں۔ باقی نصف (احاطہ) بلا چھت کا کھلا ہوا صحن ہے۔ قبۃ الصخرہ کا جنوبی دروازہ مسجد کی صدر عمارت کے رخ کھلتا ہے جہاں مسلمان پہلے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے شہر بیت المقدس پر یونانیوں (یعنی صلیبیوں) کا قبضہ ہوا اور تحریر ہٰذا کے وقت (یعنی ۵۴۸ھ؍۱۱۵۴ء) تک انہی کا قبضہ ہے اس وقت سے انھوں نے اس چھت والے حصّے میں بہت سے کمرے بنا لیے جن میں الداویہ (شہسواران دیر) کی جماعتیں رہتی ہیں۔ اور خود الداویہ کے معنی 'خدام خانہ خدا' ہیں" (ادریسی ۷)

ہمارا دوسرا ماخذ علی ہروی کی کتاب ہے جس نے سلطان صلاح الدینؒ کے دوبارہ بیت المقدس پر قبضہ کرنے سے چند ہی سال قبل اسے لکھا تھا۔ فاطمی خلیفہ الظاہر کے اس کتبے کا تذکرہ کرنے کے بعد جس کو ہم چند ورق اوپر نقل کر آئے ہیں، وہ مسجد اقصیٰ کی پیمائش کے بعض جزئیات لکھتا ہے جو زمانہ حال کی پیمائش سے خاصی طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ جس قدم کا لفظ اس نے استعمال کیا ہے، اسے تخمیناً تیس انچ کے مساوی سمجھنا چاہیے اور ذرع وہی نصف گز (۱۸ انچ) کا سرکاری پیمانہ ہے ؎

قبۂ صخرہ کے نیچے کے غار کا حال لکھ کر علی تحریر کرتا ہے کہ "رواق یعنی صدر عمارت کا صدر دالان پندرہ قدم چوڑا اور جنوب سے شمال میں ۹۴ قدم (یعنی ۲۳۵ فیٹ) لمبا ہے مسجد کے گنبد کی بلندی ۶۰ ذرع (۹۰ فیٹ) اور محیط ۹۶ ذرع (یعنی ۳۲ ذرع یا ۴۸ فیٹ قطر) ہے۔ گنبد کے نیچے کا چوکا ۱۶۰ ذرع یعنی ہر پہلو ۴۰، ۴۰ ذرع (یا ۶۰ فیٹ) ہے۔ کل مسجد کا طول شمالاً جنوباً ۱۴۸ ذرع (= ۲۲۲ فیٹ) ہے" (نسخۂ آکسفورڈ ورق ۳۹) ؎

سلطان صلاح الدینؒ کے بیت المقدس کو دوبارہ ۵۸۳ھ؍۱۱۸۷ء میں فتح کرنے

باب سوم

کے بعد پورے حرم شریف اور اس کی عمارتیں از سر نو درست ہو کر اصلی حالت پر آئیں۔ ابن اثیر کی تاریخ میں خاص طور پر مسجد اقصیٰ کی درستی کا جو کچھ حال لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے[1]:

"حالات ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) جس وقت سلطان صلاح الدینؒ کا شہر پر قبضہ ہوا اور کفار نکال دیئے گئے تو اس نے حکم دیا کہ عمارات کو پہلی حالت کے مطابق درست کر دیا جائے۔ صلیبی الداویہ نے اقصیٰ کے مغرب میں ایک مکان اپنے رہنے سہنے کے لئے بنا لیا تھا اور گودام وغیرہ حتیٰ کہ دوسری ضروریات کی چیزوں کے ساتھ پہنچانے تک تعمیر کر لیے تھے اور اپنے نئے مکان میں مسجد اقصیٰ کا ایک حصہ بھی دوسری طرف سے بند کر کے شامل کر لیا تھا۔ صلاح الدین نے حکم نافذ کیا کہ یہ سب اپنی پہلی حالت کے مطابق بنا دئے جائیں اور مسجد (یعنی حرم شریف) نیز صخرہ کو ہر قسم کے میل اور گندگی سے جو وہاں جمع ہو گئی تھی، پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ حسب احکام تعمیل ہوئی۔"

مسجد میں محراب کلاں کے اوپر اب تک وہ کتبہ پڑھا جاتا ہے جو بحالی اور تطہیر کے بعد سلطان صلاح الدینؒ نے کندہ کرایا تھا۔ اصل عربی عبارت ووگے نے اپنی کتاب "ل تمپل وثرہ وسلم" (ص ۱۱۰) میں نقل کی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مسجد اقصیٰ اور اس مقدس محراب کی جس کی بناء تقویٰ پر ہے، بحالی کا خدا کے حقیر بندے اور اس کے نائب یوسف ابن الیوب ابو المظفر سلطان فاتح صلاح الدنیا والدین نے حکم دیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے ۵۸۳ھ کے ایام میں (شہر کو) اس کے ہاتھ پر فتح کرایا۔ وہ دعا کرتا ہے کہ خدائے کریم اسے فضل و کرم کی شکر گزاری کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی عفو و رحمت سے اسے توابین و مستغفرین میں داخل کرے۔"

شہر کی دوسری فتح کے بعد تاریخوں میں مسجد اقصیٰ کی ترمیم و تجدید کا

---

[1] ابن اثیر۔ جلد نہم۔ ۳۶۴۔

باب سوم

کوئی تذکرہ آتا ہے تو صرف مجیر الدین کی کتاب میں، جس نے بیان کیا ہے کہ حرم شریف کی جنوبی دیوار، جو محراب داؤدؑ کے قریب ہے مصر کے مملوک سلطان محمد ابن قلاعون نے بنوائی جس کی حکومت ۱۳۱۰ء سے ۱۳۴۱ء تک رہی۔ اسی امیر نے اقصیٰ کی جنوبی حد پر سنگ مرمر کی سلیں بچھوائیں اور بڑی محراب کے دائیں بائیں پچھلی دیوار کے اندر دو روشن دان نکالے۔ (صفحہ ۴۳۸) ؛

یوں بھی صلاح الدینؒ کے عہد کے بعد مسجد کے طول عرض اور شکل صورت کی کوئی تفصیلی کیفیت لکھی ہوئی نہیں ملتی تا آنکہ ہم مجیر الدین کے زمانے تک آتے ہیں جس نے اپنی کتاب ۱۴۹۶ء میں تحریر کی اور اس کے وقت میں بظاہر مسجد بعینہ ویسی تھی جیسی کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں۔ موجودہ مسجد میں (بالکل ۱۴۹۶ء کی حالت کے مثل) شمال کی طرف سات اور مشرق کے رخ صرف ایک در کھلا ہوا ہے۔ غربی جانب دو دروازے تو صحن کی طرف ہیں اور ایک اس عمارت کا راستہ ہے جو صلیبیوں کے وقت میں شہسواران دیر کا سلاح خانہ تھا اور کسی زمانہ میں بقعات البیضا اور غلطی سے "اقصی القدیمہ" بھی کہلاتا رہا۔ دیکھو نقشہ صفحہ مقابل۔ (و) مجیر الدین اس کو "مسجد نسا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اقصیٰ کی کیفیت اس نے حسب ذیل تحریر کی ہے :-

"مسجد اقصیٰ شمال سے جنوب میں، اور بڑی محراب سے لے کے مقابل کے بڑے دروازے کی دہلیز تک (کاریگروں کے) سَو درع لمبی ہے۔ اس میں محراب کا اندرونی خم اور شمالی دروازوں کا سائبان داخل نہیں ہے۔ اس کا عرض مشرقی دروازے (ج) سے مغربی دروازے تک ۷۶ درع (کاریگروں کا درع) ہے[1]۔ یہ مشرقی دروازہ وہ ہے جس سے مہد مسیحؑ کو جاتے ہیں۔ حرم کے صحن کی طرف مسجد کے دس در ہیں۔ دس شمال میں (اور ہر دالان کے گویا سرے پر) ہیں[2]۔ پھر مشرقی، مغربی اور ایک تیسرا در وہ ہے

---

[1] موجودہ نقشہ میں ان خطوں کی پیمائش ۲۳۰ فیٹ × ۱۷۰ فیٹ ہے۔ کاریگروں کے درع کو ۲ فیٹ ۴ انچ اور تخمیناً سوا دو فیٹ قرار دیا ہے ؛

[2] ساتھ کی تصویر میں اقصیٰ کی بیرونی کمان اور شمالی رخ کی تصویر دکھائی ہے۔ ڈھلاؤ کی چھت

نقشہ مسجد اقصیٰ

پیمانہ فٹوں میں

۵۰

۱۰۰
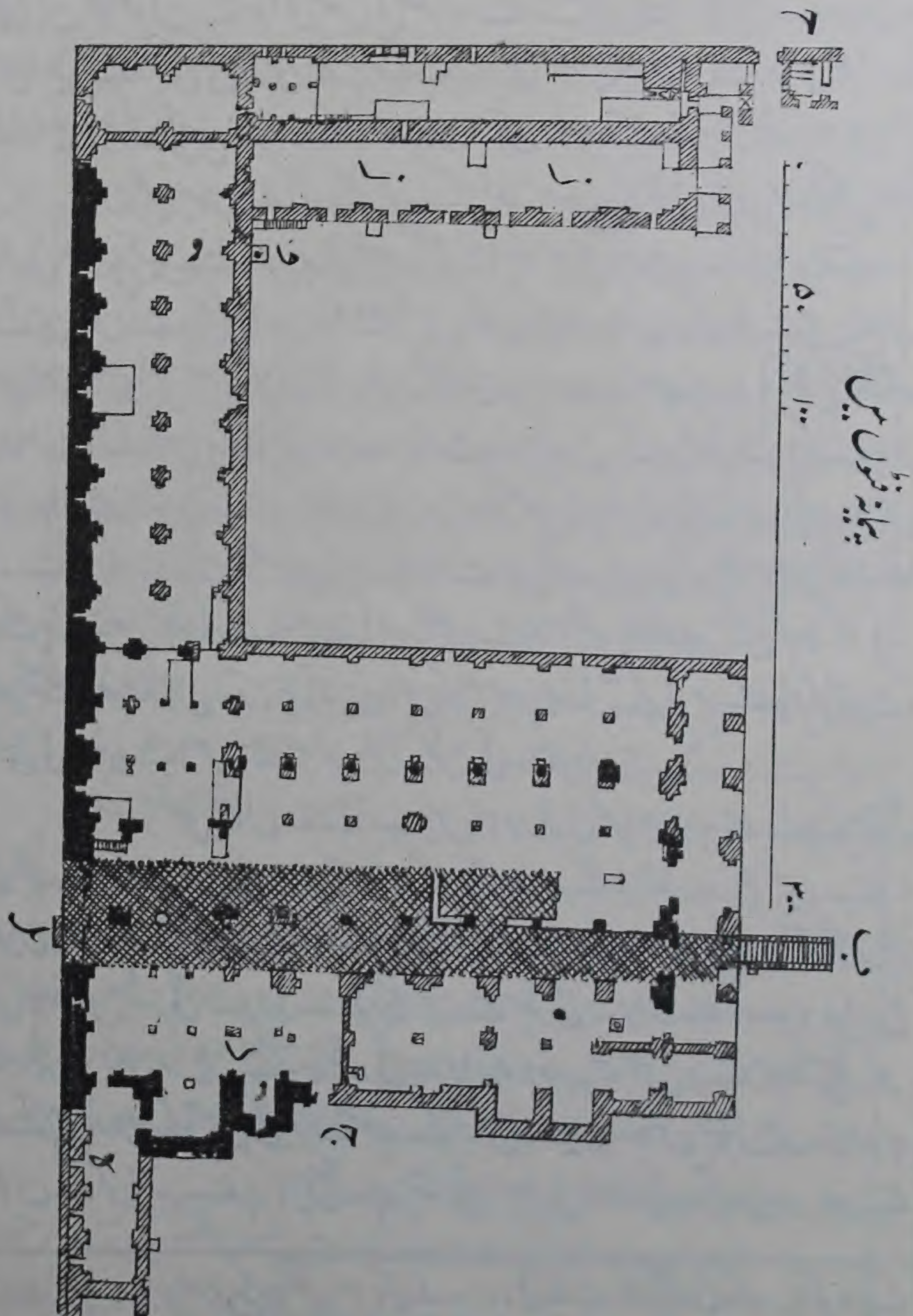
جس سے "جامع النسا" نامی عمارت میں جاتے ہیں (صلیبیوں کا سلاح خانہ ملاحظہ ہو نقشۂ دوم)
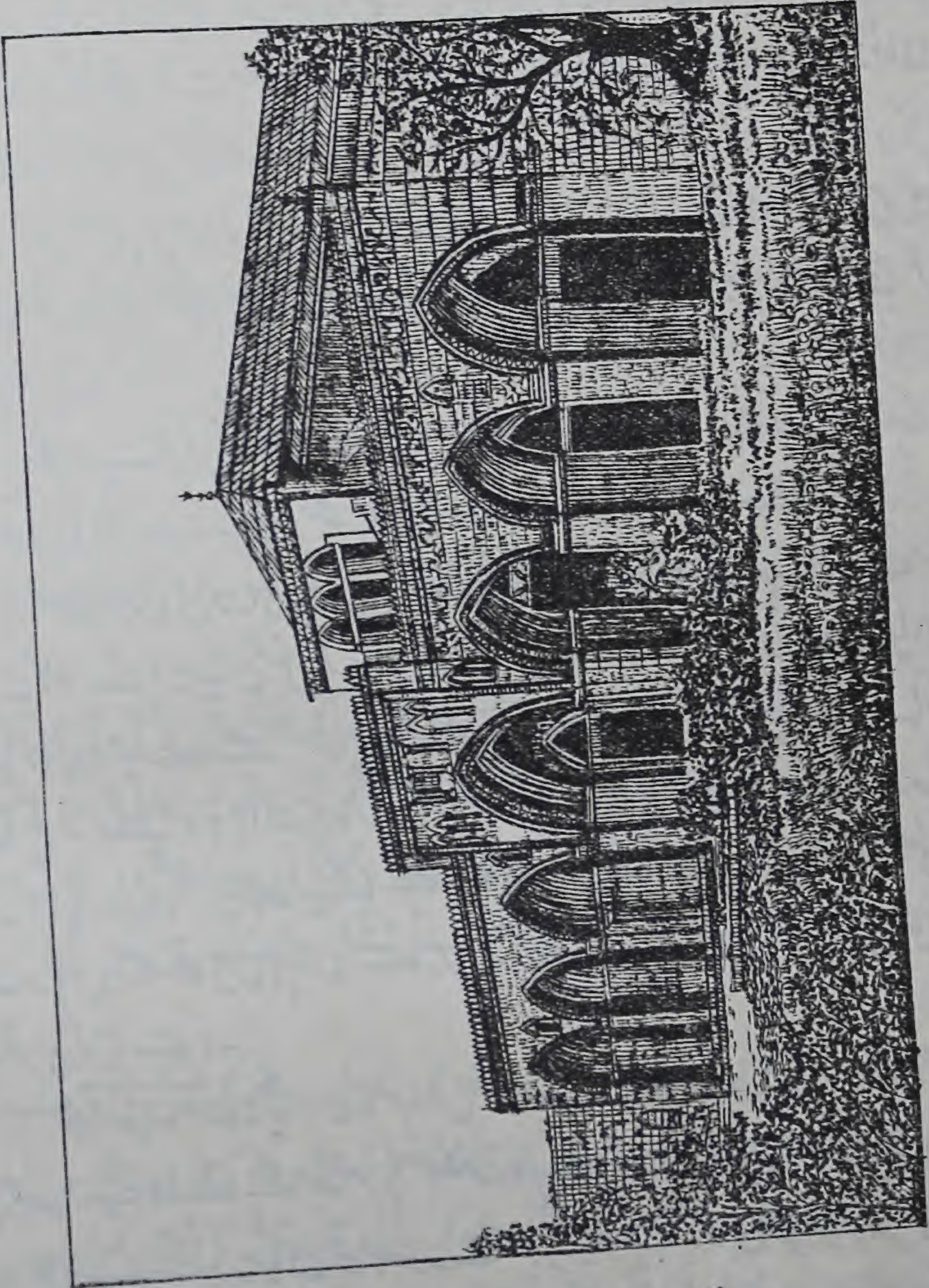
تصویر نمبر مسجد اقصیٰ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ (جسے عربی میں "جملان یعنی شتر پشت کہتے ہیں) اور جو وسطی حصہ پر بنی ہوئی ہے، یہاں دکھائی گئی ہے۔ مقدسی کے قول کے مطابق (صفحہ ۲۱ و ۹۹) چھتوں کی یہ شکل شام کی مسجدوں سے مخصوص تھی۔ دوسرے ملکوں میں عام طور پر مسجدوں کی چھتیں سپاٹ بناتے اور ان پر مٹی کا صندلا کر دیتے تھے۔

باب سوم

یہ وسیع ایوان (یعنی جامع نسا) مسجد اقصیٰ کا غربی حصہ ہے۔ اس میں شرقاً غرباً دوہرا دالان اور نہایت مضبوط بنے ہوئے دس لداؤ ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ عمارت فاطمی خلفاء کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی" (مجیرالدین ۳۶۷ و ۳۶۸)

مگر یہ آخری بات بظاہر سہواً لکھی گئی ہے کیونکہ صلیبیوں کا سلاح خانہ خلفائے فاطمی کے زمانہ کا نہیں ہے۔

مسجد اقصیٰ کی محرابوں کی نسبت سیوطی نے اپنے زمانے (۱۴۷۰ء) میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجنسہٖ اسی طرح کھڑی تھیں جیسی آج کل نظر آتی ہیں:-

محراب زکریاؑ: "بہت سے لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ مسجد کے اندر اس دالان کی محراب ہے جو مشرقی دروازے سے ملا ہوا ہے۔"

مسلمانوں کی روایت میں، وہ "زکریا ابن برقیاس کہ تم نے اسے معبد و قربان گاہ کے درمیان قتل کیا" (متی، سورہ ۲۳، ۳۵) اور وہ زکریا ابن جیہویدا پروہت جسے "شاہ کے حکم سے خانۂ خدا کے صحن میں" سنگسار کیا گیا (۲ وقائع۔ ۲۴، ۲۲) اور وہ زکریاؑ جو حضرت یحییٰ اصطباغی کے والد تھے، تینوں کو ایک ہی شخص سمجھ لیا گیا ہے[1]۔ محراب زکریاؑ کو اب بھی مسجد اقصیٰ میں لوگ وہاں بتاتے ہیں جہاں نقشے میں "د" لکھدی ہے۔ بہرحال سیوطی اسی سلسلہ میں تحریر کرتا ہے:-

محراب معاویہؓ۔ یہ نام اس خوبصورت محراب کا بتاتے ہیں جو آجکل خطبہ جمعہ دینے والے کے مقام یا مقصورہ کے اندر آگئی ہے۔ اس محراب اور صدر محراب کے درمیان خوبصورت منبر آگیا ہے۔ رہی محراب عمرؓ تو اس میں اختلاف ہے کہ وہ کونسی ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ وہی بڑی محراب جس کے برابر منبر شریف بنا ہوا ہے اور جو مسجد اقصیٰ کے صدر دروازے کے مقابل ہے، محراب عمرؓ ہے اور بعض کا قول ہے کہ محراب عمرؓ مسجد کے مشرقی دالان یعنی

---

(۱) مصنف کا یہ قول بے دلیل اور ناقابل قبول ہے۔ (مترجم اردو)

جنوبی دیوار سے ملی ہوئی ہے اس کے سامنے کے رخ اور ملے ہوئے حصوں ہی کو جامع عمرؓ کہتے ہیں۔ (نقشہ ۸) - اور یہی جگہ ہے جسے آنحضرتؐ اور آپ کے ساتھ جو صحابہؓ تھے، انھوں نے صاف کرایا اور صاف کر کے وہاں نماز ادا کی جس سے یہ جامع عمرؓ مشہور ہو گئی۔ لیکن اکثر رائیں پہلے قول ہی کے موافق ہیں یعنی یہ کہ محراب عمرؓ منبر سے ملی ہوئی صدر محراب ہی ہے" (سیوطی - ۲۶۴)

واضح رہے کہ مشرقی حصے کی جس چھوٹی عمارت کا سیوطی نے ذکر کیا اور جو آج کل بھی مسجد عمرؓ کہلاتی ہے (نقشہ ۸) وہ نسبتہً قریبی زمانے کی اور عہد صلاح الدینؒ کے بعد کی تعمیر ہے۔ اور شمالی کمان یا سائبان نیز اقصیٰ کے مشرق میں جو عمارت ہے اور فارسیہ کہلاتی ہے اسے فارس الدین البکی نام کے کسی شخص نے ۷۵۵ھ (یعنی ۱۳۵۴ء) میں بنایا تھا۔ (دیکھو مجیر الدین - ۳۹۰)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے نقشے میں اتنی بڑی تبدیلی کب ہوئی؟ یعنی ناصر خسرو کے وقت کی اتنی کثیر ستون والی مسجد (جیسا کہ پہلے دو نقشوں میں دکھائی گئی ہے) گھٹ کر مجیر الدین اور خود ہمارے زمانے کی نسبتہً حقیر عمارت (جس کا ابھی نقشہ ہمارے سامنے سے گزرا) کس طرح ہو گئی؟

عرب تاریخ نویس اس بارے میں ٹھیک کوئی بات نہیں بتاتے لیکن مختلف ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ ہمیں پروفیسر ہائے ٹر لیوس کی اس رائے کا موید بناتا ہے کہ یہ تبدیلی گوڈفری ڈی بوئیلون کے بیت المقدس پر قبضے کے تھوڑے ہی دن بعد کی گئی ہوگی۔ مسٹر ہائے ٹر لیوس لکھتے ہیں[1] کہ "قرینہ غالب یہ ہے کہ شہر پر صلیبیوں کا قبضہ ہوتے وقت مسجد کو بھی نقصان پہنچا اور یہ پوری عمارت شہسواران دیر (الداویہ) کے رہنے کے لئے

[1] دی ہولی پلیسیز اوف جیروسلم" از ٹی ہائے ٹر لیوس - ۸۷

تفویض کردی گئی جن کے قبضہ کے نمایاں نشان باقی رہے خصوصاً جنوبی حصے میں جہاں جنوب مشرقی گرجا کا ایک جھروکا اور جنوبی دیوار کا پرتکلف برآمدہ ابھی تک بالکل الگ نظر آتے ہیں۔ غالباً انہی نے اس کی مرمت کی اور جس شکل میں آج کل نظر آتی ہے، یہ انہی نے بنائی، البتہ سلطان صلاح الدینؒ نے شہر کو دوبارہ فتح کیا تو پوری عمارت دوبارہ اصلی (مسجد کی) حالت میں واگزاشت ہوئی اور محراب کھلوادی گئی جس کو ایک چوڑی دیوار بنا کے عیسائیوں نے بند کردیا تھا۔ سلطان کے ایک کتبے میں یہ مضمون درج ہے اور مسجد کی از سرنو آرائش کا کام بھی اسی کے حکم سے ہوا (تخمیناً ۱۱۸۷ء) جیساکہ کنگوروں کے درمیان کے کام سے اب بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی کتابوں سے جو معلومات اخذ ہوتی ہے وہ بھی یقیناً اس خیال کی موید ہے اگر ہر پہلو کا سلسلے سے تاریخ میں سراغ لگائے تو سب سے پہلے ہم دیکھیں گے کہ ہمارے زمانے کی مسجد بعینہٖ ویسی ہے جیسی کہ مجیر الدین کے وقت (۱۴۹۶ء) میں تھی۔ کتاب کی اسی فصل میں مجیر الدین نے کئی ورق میں بیت المقدس کا مفصل جغرافیہ اور صلاح الدینؒ سے لے کے اپنے عہد کے سلطان تک تمام مملوک پادشاہوں کی فہرست دی ہے (نسخہ قاہرہ۔ صفحہ ۳۲۴ تا ۴۴۷) تاکہ حرم شریف اور شہر میں جو مختلف یادگاریں انھوں نے چھوڑی ہیں، ان کا بیان کرے۔ لیکن مسجد اقصیٰ میں کسی مملوک سلطان کے وسیع پیمانے پر ردوبدل کرنے کا کہیں وہ تذکرہ نہیں کرتا۔ عزید برآں ۱۱۸۷ء میں جب صلیبی نکالے گئے اور شہر کے ساتھ مسجد دوبارہ صلاح الدینؒ کے ہاتھ میں آئی تو اس کے از سرنو مسجد کو پاک اور درست کرنے کے جو بیانات تاریخوں میں مرقوم ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت کی خصوصیات سب وہی تھیں جنھیں مجیر الدین نے مشاہدہ کرکے بیان کیا اور جنھیں آج بھی ہم بجنسہٖ دیکھتے ہیں۔ ادھر صلیبیوں کے ۱۰۹۹ء میں شہر کو لینے سے صرف باون برس قبل ناصر خسرو (۱۰۴۷ء میں) یہاں آیا اور اس نے اقصیٰ کو موجودہ مسجد سے دگنا اور نہایت شاندار عمارت دیکھا جس کی چھت کے نیچے دو سو اسّی ستون

اور پندرہ دالان تھے۔ پس اس کے سوا لئے اور نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مسجد کی اصلی وسعت و شان کے موجودہ صورت میں گھٹ جانے کا زمانہ وہی ہے جب کہ صلیبی اس پر قابض تھے۔ اس نتیجہ کی یوں بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ لاطینی نسل کے مجاہدین صلیب مسجد اقصیٰ کو ثانوی درجے کی شئے جانتے تھے بجالیکہ ان کی نظر میں قبۃ الصخرہ اصلی کلیسائے ربانی تھا۔ یہی سبب ہوا کہ شہسواران دیر نے بے دردی سے پوری عمارت میں ردوبدل کر کے ایک حصے میں اپنے گروہ کے لئے گرجا بنا لیا اور اس عالیشان مسجد کے بعض بیرونی حصّوں میں سلاح خانہ اور پہرا چوکی قائم کر دی ؏

قبۃ الصخرہ

مسجد اقصیٰ کی ابتدائی عمارتی تاریخ تو اس قدر کم معلوم ہے، لیکن اس کے مقابلے میں وقائع نویسوں نے مقدس چٹان کے اوپر جو گنبد بنا ہوا ہے، اسکی تاریخ بنا اور اس کے متعلق تمام تاریخی واقعات کو پوری شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح بالکل ابتدائی زمانے سے لے کے بعد تک اس خوبصورت عمارت کی اتنی مفصل کیفیت لکھی ہوئی موجود ہے کہ یہ قریب قریب قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج انیسویں صدی میں جو عمارت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یہ باعتبار کرسی اور نقشہ تعمیر کے مجموعی طور پر بعینہٖ وہی ہے جسے خلیفہ عبدالملک نے ۶۹۱ء (۷۲ھ) میں تیار کرایا تھا۔ یہ سچ ہے کہ بالائی گنبد کئی موقعوں پر زلزلے سے منہدم ہوا اور عجب نہیں کہ دیواروں کو بھی بہت نقصان پہنچا اور ان کی اکثر مرمت ہوتی رہی ہو، بایں ہمہ بنیادوں کا نقشہ اور پیوستہ ستونوں کے طرز میں، ان مرمتوں یا تجدید سے کوئی فرق نہیں واقع ہوا تھا کہ ابن الفقیہ نے ۹۰۳ء میں گنبد کی کیفیت میں روشندانوں کی جتنی تعداد بتائی ہے، آج بھی تقریباً اسی طرح درست ہے ؏

چٹان کی نسبت جس پر بطور چھت کے گنبد بنایا گیا ہے، یہ بات

باب سوم

ذہن نشین رہنی چاہیے کہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کی نظر میں اس کی حرمت اسلیئے تھی کہ اول تو موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ یہی تھا کیونکہ کہتے ہیں انھوں نے اپنے معبد کی محراب اسی چٹان پر بنائی تھی اور نبی کریم (علیہ التحیات والتسلیم) کو

نقشہ قبۃ الصخرہ

جنوبی دروازہ

شمالی دروازہ

الصخرہ

قبۃ السلسلہ

محراب
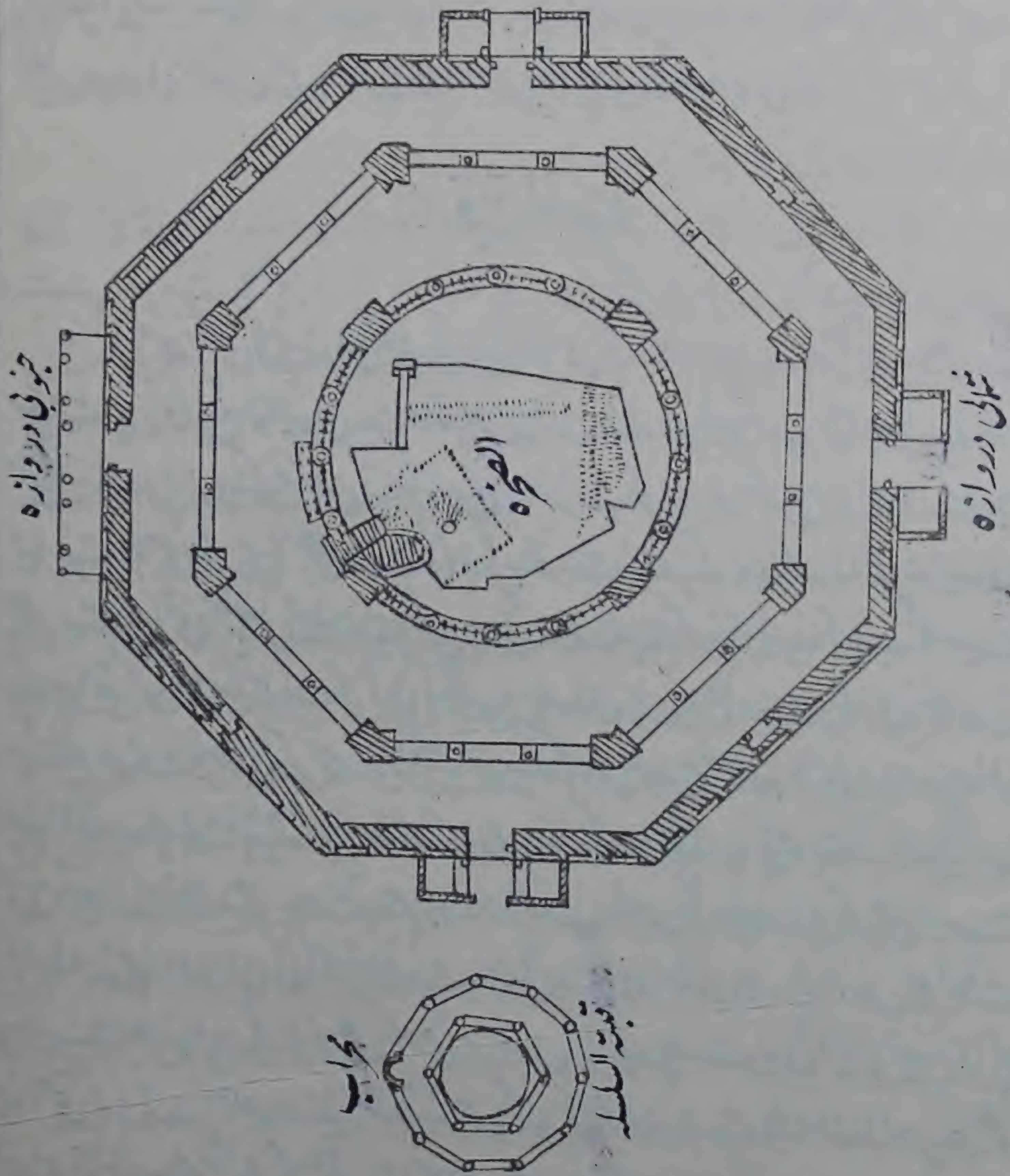
یہ وحی ہجرت کے بھی دوسرے سال رجب کے مہینے میں ہوئی کہ آئندہ سے ہمیشہ کے لیئے قبلہ کا رخ مکۂ معظمہ میں کعبۃ اللہ رہے گا اور حضورؐ کے متبعین نماز میں اسی طرف منہ کرکے کھڑے ہوں۔ دوسرے اہل ایمان کی نظر میں اس مبارک چٹان سے عقیدت کا یہ سبب بھی ہوا (جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا) کہ اسی کی نسبت حدیث میں وارد ہے کہ حضور سرورِ عالمؐ اسی سے شب معراج اوپر تشریف لے گئے اور درگاہ رب العزت میں باریابی کے بعد اسی جگہ دوبارہ زمین پر اُترے۔ امت اسلامی کے دل میں اس چٹان سے اتنی عقیدت کا ہونا ناظرین کے ذہن میں رہنا چاہئے تاکہ ان واقعات کے سمجھنے میں سہولت ہو جو عبدالملک کو اس عظیم الشان گنبد بنانے کے محرک ہوئے مگر اس واقعے کو عربی تاریخوں سے نقل کرنے کے قبل مناسب ہوگا کہ پروفیسر ای ایچ پامر سے چند سطریں مستعار لے لی جائیں جن میں قبۂ صخرہ کی تعمیر کے وقت خلافت اموی کی دلچسپ کیفیت دکھائی گئی ہے:۔

"۶۸۴ئ میں جب کہ بانی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نواں اور اموی خاندان کا پانچواں خلیفہ عبدالملک سریر آرائے سلطنت تھا، ایسے واقعات پیش آئے کہ پھر لوگوں کی توجہ حضرت داودؑ کے شہر کی طرف منعطف ہوگئی۔ آٹھ سال تک اسلامی سلطنت فرقہ بندی اور خانہ جنگی کی بلا میں مبتلا رہی تھی۔ حرمین شریفین یعنی مکۂ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے باشندے شاہان جائز سے منحرف ہوگئے اور انھوں نے عبداللہ ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ خلیفہ یزید اور معاویہ (ابن یزید) نے سرکشی کو دبانا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ حریف سلطنت کی تدبیروں نے سارے عربستان اور ولایات افریقہ میں اپنی حکومت منوالی اور خود شہر مکہ کو اپنا دارالخلافت قرار دیا۔ عبدالملک کو اپنی بادشاہی کی خیر نظر نہ آتی تھی۔ لوگوں کے گروہ ہر سال کعبۃ اللہ حج کرنے جاتے اور ان کے ذریعے ابن زبیرؓ کا دینی اور سیاسی اثر تمام اسلامی دنیا میں سرایت کرجاتا۔ اس قسم کے اثرات کا سدباب کرنے اور اپنے رقیب کا وقار گھٹانے کی غرض سے عبدالملک کو یہ تدبیر سوجھی کہ خانہ کعبہ

باب سوم

کے حج سے لوگوں کی توجہ ہٹا کے انھیں بجائے مکہ کے بیت المقدس کی زیارت کرنے پر مائل کرے"۔[1]

یعقوبی جو سب سے قدیم مسلمان مورخوں میں شامل ہے، عہد عبدالملک کے واقعات میں صاف طور پر بیان کرتا ہے کہ کس طرح اس خلیفہ نے ان سیاسی وجوہ سے، جن کا اوپر اشارہ ہوا، اس بات کی کوشش کی مکہ معظمہ کے حجر اسود کی بجائے بیت المقدس کی اس چٹان کا طواف کیا جائے۔ اگر یہ بات چل جاتی تو عبدالملک یروشلم میں سالانہ حج کی اسی نمونے کی رسمیں جاری کر دیتا جیسی کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے سے حرم مکہ میں ادا کی جاتی تھیں اور حاجیوں کے بیش بہا نذرانے اور محاصل کی رقم کثیر مکہ والوں کے ہاتھ آنے کی بجائے عبدالملک کے خزانے میں پہنچنے لگتی۔ اور اہل مکہ جو اس کے حریف ابن زبیرؓ کی خلافت کے ہوا خواہ تھے اس نفع سے محروم رہ جاتے۔ یہ بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبدالملک کی یہ کوشش چل جاتی تو بہت ممکن ہے کہ دمشق کی بجائے بیت المقدس ہی امویوں کا دارالخلافہ ہو جاتا۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ مسلمان حاجیوں کا رخ فلسطین کے مقدس شہر کی طرف پھیر دینے میں خلیفہ کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ابن زبیرؓ کی شکست اور قتل کے بعد بھی مکہ کی عظمت میں جو اسلام کے دینی مرکز کی حیثیت سے اسے حاصل تھی، کوئی فرق نہ آیا اور اموی دارالخلافہ دمشق کو بنا لیا گیا۔[2] آمدیم بر سر مطلب، مورخ یعقوبی کی وہ عبارت جس میں قبۃ الصخرہ کا

---

[1] "جیروسلم، دی سٹی آف ہیروڈ اینڈ سلےڈن"، از بیسنٹ و پامر مطبوعہ سنہ ۱۸۷۱ء صفحہ ۸۰، ۸۷۔

[2] مولانا عبداللہ العمادی (ناظر امور مذہبی) نے مترجم اردو کو انگریز مصنف کے اس قول کی تردید کر دینے کی تاکید فرمائی اور بتایا کہ خود یعقوبی کے منقولۂ بالا اقوال کی مولانا شبلی مرحوم اپنے عربی رسالے انتقاد میں مسکت تردید کر چکے ہیں۔ اس خاسد بنا، پر انگریز مصنفوں نے جو عمارت چنی اور اپنی طرف سے حاشیے چڑھائے ہیں وہ اور بھی کمزور اور لغو ہیں۔ پس اس بیان کا کہ عبدالملک، نعوذ باللہ حجر الاسود کی بجائے اس چٹان کو مسلمانوں کے حج اور طواف کا مرکز بنانا چاہتا تھا، عقلاً و نقلاً مطلق اعتبار کرنا نہ چاہیئے۔ (مترجم اردو)

حال بیان کیا ہے حسب ذیل ہے :-

"پھر عبد الملک نے شام کے لوگوں کو مکے کے حج سے منع کیا۔ سبب یہ کہ عبد اللہ ابن زبیرؓ حج کے زمانے میں لوگوں کو پکڑ لیتے اور اپنی بیعت کرنے پر مجبور کرتے۔ عبد الملک کو یہ اطلاع ہوئی تو اس نے لوگوں کو مکے کے سفر سے روکا۔ لیکن اس پر لوگ بڑبڑائے کہ تو ہمیں خانہ خدا کو جانے سے کس طرح روکتا ہے حالانکہ یہ خدا کا حکم ہے؟ خلیفہ نے جواب دیا۔ کیا تم سے ابن شہاب الزہریؒ[1] نے نہیں کہہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ صرف تین مسجدوں کی طرف سفر کریں۔ یعنی مسجد حرام، میری مسجد اور مسجد بیت المقدس کی طرف؟ لہٰذا اب اس آخری مسجد کو مسجد حرام کی بجائے تمہارے لیے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ بیت المقدس کی) چٹان، جس کی نسبت روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج پر جاتے وقت یہاں قدم مبارک رکھے، تمہارے لیے حجر اسود کی بجائے ہوگی۔ پھر عبد الملک نے چٹان پر ایک گنبد تعمیر کیا اور اس کے گرد کار چوب کے پردے لٹکائے اور دربان مقرر کئے اور لوگوں نے کعبہ شریف کی طرح اس کے طواف کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور یہ رسم خلافت امویہ کے پورے زمانے تک جاری رہی" (یعقوبی تاریخ - جلد دوم - ۱۱)

یہ تحریر بجائے خود اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے جسے مسٹر فرگسن متوفی نے بڑے سلیقہ سے مدلل کیا تھا اور جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہمارے آقا جناب مسیح علیہ السلام کے مقبرے پر قسطنطین نے جو کلیسائے کبیر تعمیر کیا تھا وہ موجودہ "کلیسائے مزار شریف" نہیں تھا بلکہ یہی قبۃ الصخرہ تھا۔ مسٹر فرگسن کا بیان ہے کہ میرا قیاس تاریخی مواد نیز عمارت کے طرز تعمیر سے

---

[1] مشہور محدث گزرے ہیں جو اکثر صحابۂ رسول صلعم سے ذاتی ملاقات رکھتے تھے۔ ۱۲۴ھ (۷۴۲ء) میں ۷۲ یا زیادہ عمر پا کے انتقال کیا۔ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں ان کا تذکرہ کیا ہے (ترجمہ انگریزی) جلد دوم صفحہ (۵۸)

باب سوم

جو دلائل بہم پہنچتی ہیں، ان پر مبنی ہے۔ (اور طرز تعمیر مصنف کی نظر میں خالص بائزنطی تھا) ساتھ ہی فرگسن نے یہ بھی لکھ مارا کہ "صلاح الدین کے شہر کو دوبارہ عیسائیوں سے لینے کے قبل، کسی ایک مسلمان مصنف کو بھی یہ یقین دلانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ قبۃ الصخرہ کو میرے ہم مذہبوں نے بنایا ہے"[1] لیکن اوپر جو سند ہم نے پیش کی اس کے بعد فرگسن کا یہ سارا بیان بالکل باطل ہو جاتا ہے کو مقدسی جس کی تحریر ۹۸۵ء کی ہے ان وجوہ کو جن سے خلیفہ عبد الملک کو قبۃ الصخرہ کے بنانے کی تحریک ہوئی دوسری طرح بیان کرتا ہے اور مناسب ہوگا کہ اسے بھی اس موقع پر نقل کر دیا جائے۔ یہ فقرہ اس مقام پر آیا ہے جہاں مصنف نے جامع دمشق کی کیفیت لکھی ہے (جسے ہم آگے باب ششم میں نقل کریں گے) اسی سلسلے میں مقدسی لکھتا ہے:-

"میں نے ایک روز اپنے چچا سے باتوں باتوں میں کہا کہ چچا خلیفہ الولید نے یہ تو اچھا نہ کیا کہ مسلمانوں کی اتنی دولت دمشق کی مسجد پر صرف کر ڈالی۔ اگر یہی روپیہ وہ سڑکیں یا سرائیں بنانے میں یا سرحد کے قلعے از سر نو تعمیر کرنے میں خرچ کرتا تو کس قدر بہتر اور مناسب ہوتا۔ لیکن میرے چچا نے جواب میں کہا، بیٹا! تجھ میں عقل نہیں ہے یقین جان الولید نے جو کچھ کیا درست کیا اور وہ بہت قابل قدر کام کرنے پر آمادہ ہوا کیونکہ اسے نظر آیا کہ شام وہ ملک ہے جس پر مدتوں عیسائی قابض رہے اور اس نے وہ خوبصورت گرجا بھی دیکھے جو ابھی تک ان کے قبضے میں ہیں اور ان کی خوشنمائی ایسی دلکش اور شان و شوکت ایسی مشہور ہے جیسی (بیت المقدس میں) کمامہ (یعنی مزار مسیح کا گرجا) یا لدیہ اور ادلیہ کے کلیسا۔ لہذا اس نے مسلمانوں کے لیے ایسی مسجد بنانی چاہی کہ پھر وہ ان عیسائی عمارتوں کو پلٹ کر بھی نہ دیکھیں اور جو بے مثل و اعجوبۂ روزگار ہو۔ اسی طرح کیا یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ خلیفہ عبد الملک کو کمامہ کے گنبد کی عظمت و شان دیکھ کر ہی غیرت

[1] دیکھو فرگسن کا مضمون "جیروسلم" مندرجہ ڈکشنری اوف دی بائبل۔ جلد اول ۱۰۳۰

آئی کہ کہیں مسلمانوں کے دل اس سے مرعوب نہ ہوں اور اسی لیئے اس نے چٹان پر یہ گنبد تعمیر کیا جو وہاں نظر آتا ہے[1] (مقدسی - ۱۵۰)

خود گنبد جن ہشت پہلو ستونوں پر قائم ہے، ان کے بالائی حاشیئے کے مشہور و معروف کتبے سے مزید تصدیق ہوتی ہے کہ قبۃ الصخرہ کا بانی عبدالملک ہی تھا۔ حاشیئے کی نیلی چینی پر زرد حروف اور قابل دید کوفی خط میں پورے حاشیئے پر کتبہ تحریر کیا ہے جسے عمارت کی تکمیل کے بعد ہی عبدالملک نے یہاں لگایا ہوگا۔ سنہ کتابت ۷۲ھ (۶۹۱ء) ہے۔ افسوس ہے کہ کوئی ڈیڑھ صدی کے بعد جب ہارون الرشید کے بیٹے خلیفہ المامون کے زمانے میں گنبد کی مرمت ہوئی تو معلوم ہوتا ہے چینی کے بعض چوکے نکال کے ان کی جگہ دوسرے چوکے جو زیادہ گہرے نیلے رنگ کے تھے، لگادیئے گئے جن پر عبدالملک کی بجائے المامون کا نام تحریر تھا۔ مگر یہ جعلسازی یا بناوٹ جس کے مجرم ہوں نہ ہوں دربار عباسیہ کے خوشامدی معمار ہوں گے، اپنا پردہ خود فاش کر رہی ہے کیونکہ بناوٹ کرنے والے عبدالملک کے عہد حکومت کی تاریخ یعنی ۷۲ھ ہجری کو بدلنا بھول گئے۔ حالانکہ تاریخ سے ملا ہوا ہی نام لکھا تھا جسے بدل کر المامون کا نام لکھا جس کی ولادت ہی ۱۷۰ھ کی ہے اور جو ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک خلیفہ رہا۔

مزید برآں جیسا کہ ہم نے لکھا، نئے چوکوں کا رنگ ذرا گہرا ہے اور پرانے چوکوں کے رنگ سے پوری طرح نہیں ملتا۔ پھر یہ کہ چونکہ المامون کا نام اور القاب زیادہ پھیلتے تھے اور جگہ کم تھی، لہٰذا اصلی کتبے کا جو خط ہے اس کے مقابلے میں اس نام کے حروف کو زیادہ قریب قریب اور گنجان لکھنا پڑا ہے۔ ذیل میں اس کتبہ کا ترجمہ جلی حروف میں ہم تین سطروں میں نقل کرتے ہیں۔ جہاں زیادہ گنجان حروف لکھے ہیں، یہ دراصل جعلی حصہ ہے جو عربی میں

[1] نیز دیکھو صفحہ ۹۸ جہاں مقدسی کلیسائے مزار مسیح کے تذکرہ میں دوبارہ لکھتا ہے کہ مسجد اقصیٰ شان و شوکت میں اس کا مقابلہ کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔

گہرے سبز اور گہرے رنگ کی چینی پر لکھا ہوا ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جسے المامون کے معماروں نے بدل دیا تھا اور دوسری سطر کے نیچے خود ہم نے جو حروف بنا دئے ہیں، قرینہ کہتا ہے کہ اصل کتبے میں اسی طرح لکھے ہوئے ہوں گے۔ یہ عبدالملک کے نام کا ٹکڑا ہے جسے مٹا کے المامون کا نام بنایا گیا تھا:۔

اُس گنبد کو اللہ کے خادم

عبداللہ الامام المامون امیر المومنین نے

الملک

سن بہتّر میں بنایا۔ اللہ قبول فرمائے"

ایک اور باتاریخ کتبہ بھی قبۃ الصخرہ میں دستیاب ہو گیا ہے۔ اس ہشت پہلو عمارت کے چار صحیح السمت دروں کی سرول پر جو بھرت کے پتر جڑے ہیں، یہ کتبہ ان کے دونوں پہلوؤں پر کندہ ہے۔ تاریخ کتابت سنہ ۲۱۶ ہجری (مطابق سنہ ۸۳۱ء) درج ہے۔ یہ عبارت بھی بہت پاکیزہ کوفی خط میں کندہ ہے اور غالباً اسی مرمت کا حال سناتی ہے، جو المامون کے حکم سے ہوئی تھی اور جس کے سلسلے میں عبدالملک کے چینی کے بڑے کتبے میں مذکورۂ بالا جعل سازی کی گئی۔ پتروں کے اس کتبے کا ترجمہ اس طرح کیا جا سکتا ہے[۲]

[۱] ایم دووگے نے اپنی کتاب "ل تمپل د ژیروسلم" کی وصلی ۲۱ میں اصلی کتبہ کی (بخط کوفی) نہایت خوشنما تصویر چھاپ دی ہے۔ اسے وہ پیلس ٹائن ایکس پلوریشن فنڈ کی کتاب "جیروسلم" کے صفحہ ۸۸ پر بھی (کوفی خط میں) طبع کر دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا اس کا پتھر پر عکس لے کے ژورنل ایشیاٹیک (جلد نہم، سنہ ۱۸۸۷ء) میں بھی شائع کر دیا ہے۔

[۲] اصل کتبہ ایم دوگے کی کتاب میں درج ہے۔ صفحہ ۸۶

"اللہ کے خادم عبداللہ الامام المامون امیر المومنین اطال اللہ عمرہ کے احکام کے موافق اور امیر المومنین کے بھائی ابو اسحق ابن امیر المومنین ہارون الرشید کے زمانہ ولایت میں یہ کام انجام پایا۔ اور اسے امیر المومنین کے مولی صالح ابن یحیی نے سنہ ۲۱۶ھ ماہ ربیع الآخر میں اتمام کو پہنچایا"

المامون کا زمانۂ خلافت ۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ (یا ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) ہے اس کے بعد اس کا بھائی ابو اسحق جس کا اوپر ذکر آیا "المعتصم" کے نام سے خلیفہ ہوا۔ بھائی کے زمانۂ خلافت میں بھی ابو اسحق کے تعلقات (المامون کے ساتھ) بہت اچھے رہے۔ اور خاص اس سال میں جو کتبے میں مندرج ہے تاریخ[1] بیان کرتی ہے کہ جب المامون نے یونانیوں پر چڑھائی کی تو ابو اسحق ایک حصہ فوج کا سپہ سالار تھا اور بعد میں خلیفہ کے ہمراہ دمشق واپس آیا۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ وہ اس وقت شام کا والی تھا (جیسا کہ کتبے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے) البتہ قرینہ کہتا ہے کہ اسی وقت سے اس کی ولی عہدی مسلم تھی اور بے شبہ اسی لئے اس کا نام ان سردلوں پر کندہ کیا گیا۔

قبۃ الصخرہ کی سب سے قدیم تفصیلی کیفیت وہ ہے جو ابن الفقیہ سنہ ۹۰۳ء (سنہ ۲۹۰ھ) میں لکھ گیا ہے۔ جیسا کہ باب ششم کے آخر میں احاطۂ حرم کے نقشے سے واضح ہوگا، گنبد کے نیچے کی ہشت پہلو عمارت ایک مربع نما چبوترے کے وسط میں بنی ہوئی ہے۔ خود چبوترہ حرم شریف کے صحن سے قد آدم اونچا ہے اور اس پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنا دی ہیں۔ چبوترے پر قبۃ الصخرہ کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے گنبد بنے ہوئے ہیں ان کا حال تفصیل سے اگلے اوراق میں آئے گا (دیکھو باب چہارم) ابن الفقیہ ان سب عمارتوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

احاطۂ حرم کے وسط میں ایک چبوترہ تین سو ہاتھ لمبا اور ایک سو چالیس ہاتھ عریض، ۹ ہاتھ اونچا بنا ہوا ہے۔ اس کی چھ[6] سیڑھیاں چڑھ کر قبۃ الصخرہ میں

[1] تاریخ ابن الاثیر۔ جزو چہارم ۲۹۵

باب سوم

پہنچتے ہیں جو چبوترے کے بیچ میں تعمیر کیا گیا ہے اس کا عرض وطول سو سو ہاتھ، بلندی ستر ہاتھ اور محیط تین سو ساٹھ ہاتھ ہے۔ قبے کے اندر ہر شب تین سو فانوس روشن کئے جاتے ہیں۔ اس کی چار مسقف ڈیوڑھیاں ہیں اور ہر ایک ڈیوڑھی میں چار دریں اور اوپر سنگ مرمر کا کمانچہ بنا ہوا ہے۔ خود چٹان ۳۴ ہاتھ طویل اور ۲۷ ہاتھ عریض ہے اور اس کے نیچے ایک غار بنا ہوا ہے جہاں لوگ نماز ادا کرتے ہیں۔ غار میں باسٹھ آدمیوں کی گنجائش ہے۔ گنبد پر اوپر سفید سنگ مرمر اور نیچے کی چھت طلائے سرخ کی بنائی ہے۔ دیواروں میں اوپر کے رخ ۵۶ دریچے رکھے ہیں کہ ۶ ہاتھ لمبے ۶ ہاتھ چوڑے ہیں اور ان پر مختلف رنگ کے شیشے چڑھا دئے ہیں یہ گنبد جسے عبدالملک ابن مروان نے تعمیر کیا بارہ بیل پائے اور تیس ستونوں پر قائم ہے اس میں گنبد کے اوپر (دوسرا) گنبد بنایا ہے جس پر سیسے کی چادریں اور نیچے سنگ مرمر ہے۔

"قبۃ الصخرہ کے مشرق کی جانب "قبۃ السلسلہ" بیس ستونوں پر قائم ہے اور چھت پر سیسے کی چادریں چڑھا دی ہیں۔ اس کے روبرو (مشرق ہی کی طرف) حضرت خضرؑ کا مقام (عبادت) ہے، چبوترہ حرم شریف کے بیچ میں ہے اور اس کے شمالی رخ پر قبۃ النبی صلعم اور مقام جبرئیلؑ ہیں اور چٹان کے برابر قبۃ المعراج واقع ہے"۔ (ابو الفقیہ ۔۔۔ ۱۰۰-۱۰۱) ملخص

آج بھی قبۃ الصخرہ اس ۳۰۳ھ؍۹۱۵ء کی لکھی ہوئی کیفیت کے اتنا مطابق ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں جو ہاتھ یا درع استعمال ہوتا تھا وہ مالکی یا سرکاری درع تھا جسے تخمیناً اٹھارہ انچ کے مساوی قرار دے سکتے ہیں۔ دیواروں کی پوری پیمائش ۳۶۰ ہاتھ دی ہوئی ہے جس سے ہشت پہلو عمارت کے ہر پہلو کا عرض ۴۵ ہاتھ یا تقریباً ½۶۷ فیٹ برآمد ہوتا ہے اور آج بھی اس کی پیمائش ۶۶ فیٹ ہے۔

پورے نقشے کا عرض وطول سو سو ہاتھ بھی حالیہ پیمائش کے بخوبی مطابق ہے چنانچہ بیرونی اور مقابل کے دروازوں کے درمیان، شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً فرش کی پیمائش قریب قریب ٹھیک ۱۵۰ فیٹ ہے۔

ستر ہاتھ یا ۱۰۵ فیٹ کی بلندی چڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں گنبد اتنا ہی اونچا تھا، جتنا آج کل ہے حالانکہ یہ زلزلوں کے بعد از سر نو بنایا گیا اور اب فرش سے چوٹی تک ۱۱۲ فیٹ ناپ میں ہے۔ ڈیوڑھیاں اور ان کے اوپر کے کمانچے بعینہا ویسے ہی تحریر ہیں جیسے آج نظر آتے ہیں اور اسی طرح چٹان اور اس کے نیچے کے غار میں کوئی فرق نہیں ہے مگر دریچوں کی تعداد میں جو ابن الفقیہ نے لکھی ہے اور بھی حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ موجودہ عمارت میں ۱۶ رنگین شیشے کے دریچے تولداؤ کے اندر سے توڑے ہیں اور اس کے نیچے ہر پہلو کی دیوار میں پانچ پانچ روشندان رکھے ہیں۔ اس طرح چالیس یہ اور سولہ اوپر کے ملا کے میزان وہی چھپن ہو جاتی ہے جیسی کہ ابن الفقیہ نے ۳۰۰ھ میں گن کر قلمبند کی تھی ؎

البتہ معلوم ہوتا ہے گنبد کے ستونوں کی تعداد اور ترتیب میں ۹۰۳ء کے بعد سے وقتاً فوقتاً (خصوصاً زلزلوں کے بعد کی ترمیم و تجدید کے باعث) موقعوں پر تبدیلیاں ہوتی رہیں ؎

بارہ پائے جن کا ابن الفقیہ نے ذکر کیا ہے ابھی تک موجود ہیں۔ پچھلا نقشہ دیکھنے سے ظاہر ہوگا کہ ان میں سے چار تو وہ ہیں جن پر گنبد کا اندرونی دور قائم ہے اور آٹھ بیرونی دور کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ جن سے ہشت پہلو کے زاویے مرتب ہوتے ہیں لیکن دوسرے اور چھوٹے ستونوں کی تعداد اس طرح بعینہ مطابق نہیں ہے۔ اندرونی دور کے ہر پائے کے درمیان آج کل تین تین اور بیرونی دور کے آٹھ پایوں کے درمیان دو دو ستون ہیں۔ گویا اس وقت ستونوں کی مجموعی تعداد ۲۰ ہے اور ابن الفقیہ نے اپنے زمانے میں ۳۰ بتائی ہے۔ بریں ہم یہ کوئی بڑا فرق نہیں ہے ؎

پایوں اور ستونوں کی تعداد کے سلسلے میں مناسب ہوگا کہ ہم اندلسی عرب ابن عبد ربہ کی تفصیلی کیفیت کو بھی پیش نظر رکھیں جس نے اسی کے قریب زمانے (تخمیناً ۳۰۰ھ: ۹۱۳ء) میں اپنی کتاب لکھی ہے ؎ اس کا بیان ہے کہ "صخرہ (یعنی قبۃ الصخرہ) کے اندر تیس اور اس کے باہر ("خارج")

باب سوم

اٹھارہ ستون ہیں" لیکن لفظ "خارج" میں کسی قدر ابہام ہے اور جو تعداد ستونوں کی تحریر ہے وہ نہ اُس کے ہمعصر ابن الفقیہ کے قول کے مطابق ہے نہ موجودہ تعداد سے ملتی ہے، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں نقشے کے دیکھنے سے واضح ہوگا۔

چبوترے کے عرض و طول اور اس کے اوپر کے دوسرے گنبدوں کی نسبت ابن الفقیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس پر آئندہ اوراق میں ہم بحث کرینگے۔ (باب چہارم)

ترتیب زمانی کے اعتبار سے قبۃ الصخرہ کی نسبت دوسرا بیان وہ ہے جو ابن الفقیہ کے پچھتر برس بعد اصطخری اور ابن حوقل نے قلمبند کیا ہے۔ اسی تحریر (مرقومہ ۳۴۰ھ) کو جغرافیہ نویس ابوالفداء نے اپنے فلسطین کے حال میں بلفظہٖ نقل کر لیا ہے اور اس واقعے کو بطور مثال کے پیش کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح عرب مصنفین اپنے ماسبق لکھنے والوں سے بے تکلف مضمون اڑا لیا کرتے ہیں۔ ابن حوقل و اصطخری لکھتے ہیں کہ:-

"یہ مقدس شہر تقریباً اتنا بڑا ہے جتنا (ولایت فلسطین کا صدر مقام) الرملہ یہ شہر پہاڑیوں کی چوٹی پر آباد ہے اور جدھر سے جائیں چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ یہاں وہ مسجد بنی ہوئی ہے کہ دنیائے اسلام میں اس سے بڑی مسجد کہیں نہیں۔ اسکی صدر عمارت (یعنی مسجد اقصیٰ) (حرم شریف کے) احاطہ کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے اور اس کے تقریباً نصف عرض پر پھیلی ہوئی ہے۔ حرم شریف کا باقی ماندہ احاطہ کھلا ہوا ہے اور سوائے اس حصے کے جہاں صخرہ کے گرد عمارتیں ہیں، اور کہیں عمارت بنی ہوئی نہیں ہے البتہ اس حصے میں بڑے بڑے ناتراشیدہ پتھروں کا ایک اونچا چبوترہ بنایا ہے جس کے وسط میں چٹان کے اوپر عالیشان گنبد ہے۔ خود چٹان زمین سے نیم قد کے برابر بلند ہے اور اس کا عرض و طول مساوی یعنی دس دس ہاتھ سے کچھ زیادہ سمجھنا چاہیئے[1] اس کے نیچے ایک دروازے

[1] یہ اندازہ اصل سے بہت کم ہے۔

باب سوم

سے جو ضرب ۱۰ ہاتھ ہوگا۔ اس طرح زینہ بزینہ راستہ جاتا ہے جیسے تہ خانے میں جاتے ہوں مگر چٹان کے نیچے کا کمرہ نہ مربع ہے نہ گول اور بلندی میں قد آدم اونچا ہے" (اصطخری ۵۶۔ ابن حوقل ۱۱۱۔ ابوالفدا ۲۲۷)۔

مقدسی خود بیت المقدس کا باشندہ ہے اور اس کا بیان (۳۷۵ھ/۹۸۵ء) ابن حوقل کے مذکورہ بالا بیان سے چند ہی سال بعد کا ہے۔ لیکن اسے ایرانی سیاح ناصر خسرو کے نوشتہ حالات کے ساتھ جو ۴۳۸ھ/۱۰۴۷ء میں بیت المقدس آیا تھا، ملا کے پڑھیئے تو مجاہدین صلیب کے آنے سے ماقبل صدی میں قبۃ الصخرہ کی نہایت روشن و واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مسجد اقصیٰ کی کیفیت کے بعد ہی (جسے ہم گزشتہ اوراق میں نقل کر آئے ہیں) مقدسی تحریر کرتا ہے کہ "(حرم شریف کا) صحن ہر جگہ پختہ ہے۔ اس کے وسط میں مدینہ شریف کی مسجد کی طرح ایک چبوترہ اٹھا ہوا ہے جس کے چاروں طرف چوڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں۔ اس چبوترے پر چار گنبد بنے ہوئے ہیں۔ ان میں "قبۃ السلسلہ" و "قبۃ المعراج" اور "قبۃ النبی" چھوٹے پیمانے کے ہیں۔ یہ بغیر دیواروں کے سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم ہیں اور اوپر سیسے کی چادریں چڑھی ہوئی ہیں۔

چبوترے کے وسط میں قبۃ الصخرہ ایک ہشت پہلو عمارت پر قائم ہے اور اس کے چار بڑے دروازے ہیں جن سے حرم شریف کے صحن میں آنے جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:- قبلہ دروازہ (یا جنوبی)۔ اسرافیل دروازہ (مشرق میں)، صور دروازہ (شمال میں)، نسا دروازہ (مغرب میں)۔ ان سب پر سونے کا کام ہے اور ہر ایک میں دیودار کے نہایت خوبصورت اور منقش ہیٹ ہیں۔ یہ کواڑ خلیفہ المقتدر باللہ[1] کی ماں کے حکم سے یہاں بھیجے گئے تھے۔ ہر دروازے کے اوپر سنگ مرمر کا کمانچہ بنا ہوا ہے جس میں دیودار کا چوبی اور باہر کے رخ برنجی کام کیا ہے۔ کمانچے میں بھی کواڑ ہیں مگر ان پر کوئی نقش و نگار نہیں ہے"۔

[1] عہد خلافت از ۲۹۵ھ/۹۰۸ء تا ۳۲۰ھ/۹۳۲ء

"عمارت کے ستونوں کی تین واحد المرکز قطاریں ہیں۔ یہ ستون نفیس ترین سنگ مرمر کو جلا دے کے، جیسا کہ نظر آتا ہے، بنائے ہیں اور ان کے اوپر لداؤ کی چھت ہے۔ انہی ستونی دالانوں کے اندر کے رخ قبۃ الصخرہ کا صدر ایوان ہے۔ یہ ہشت پہلو نہیں مدوّر ہے اور اس کے پورے دور میں گول محرابیں چلی گئی ہیں جو مجلّیٰ مرمر کے ستونوں پر قائم ہیں۔ محرابوں کے اوپر اور بہت بلند ڈھولنا ہے جس میں بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں اور ڈھولنے کے اوپر گنبد ہے۔ فرش سے گنبد کے کلس تک سو ہاتھ بلندی ہے۔ یہ خوبصورت کلس ایک بانس ایک بالشت بلند گنبد کے اوپر لگا ہوا دُور دور سے نظر آتا ہے۔ گنبد کے بیرونی رخ پر پیتل کے جلا کئے ہوئے پترے جڑے ہیں اور اندر کی عمارت فرش، دیواریں اور ڈھولنا یا لداؤ سب اندر باہر سے سنگ مرمر کے ہیں اور ان پر طرح طرح کے نقش و نگار بنائے ہیں جن کی کیفیت مسجد دمشق کے حال میں ہم آگے بیان کریں گے[1]۔ گنبد کی چھتری کو تین حصوں میں تعمیر کیا ہے۔ اندر کے حصے میں آرائشی گولے لگائے ہیں۔ اس کے بعد لوہے کے شہتیروں کی قینچیاں ہیں جنھیں سروں پر سے کھول دیا ہے کہ تیز ہوا گولے کو جگہ سے ہلا نہ دے۔ پھر تیسرا حصہ چوبی بنایا ہے جس کے اوپر کے رخ پیتل جڑا ہے۔ چھتری میں نیچے سے اوپر تک راستہ چھوڑ دیا ہے کہ مرمت یا دیکھ بھال کے لئے کاریگر کلس تک جا سکے۔ طلوع صبح کے وقت جب سورج کی روشنی سب سے اول چھتری پر پڑتی ہے اور اس کی کرنیں پھیلتی ہیں تو اس وقت یہ عمارت قابل دید اور ایسی عجیب و غریب ہو جاتی ہے کہ دنیائے اسلام میں اس کی نظیر میں نے نہیں دیکھی نہ میں نے کسی سے سنا کہ عہد جاہلیت (یعنی ماقبل اسلام زمانے) میں کہیں کوئی عمارت ایسی بنی ہو جو حسن و شان میں اس قبۃ الصخرہ کا مقابلہ کر سکے"
(مقدسی - ۱۶۹)

مقدسی اور ناصر خسرو کے درمیان کے زمانے میں بیت المقدس کو

[1] دیکھو باب ششم۔

باب سوم

سخت زلزلوں سے نقصان پہنچا، جیسا کہ ابن اثیر کی تاریخ سے جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں ثابت ہوتا ہے اور ۴۰۷ھ (۱۰۱۶ء) میں چٹان کے اوپر کا گنبد گر پڑا۔ مرمت کی تاریخیں دو کتبوں سے معلوم ہوتی ہیں جو چھتری کے اندر ابھی تک لگے ہوئے موجود ہیں۔ پہلے کی طرز عبارت مسجد اقصیٰ کے اس کتبے کی یاد دلاتی ہے جو علی ہروی نے نقل کیا اور ہم اوپر اس کی تحقیق کر آئے ہیں۔

واضح رہے کہ ۳۵۸ھ (۹۶۹ء) سے یہ مقدس شہر خلیفہ مصر کے قبضے میں آگیا تھا۔ چنانچہ وہ فاطمی خلیفہ الظاہر تھا، جس کے حکم سے گنبد کی مرمت ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء) اور ۴۱۸ھ (۱۰۲۷ء) میں اتمام کو پہنچی۔ جیسا کہ ذیل کے کتبوں میں مذکور ہے۔

ان میں سے پہلا کتبہ قرمطی خط میں گنبد کی چھت کے ایک شہتیر پر نظر آتا ہے وو گے نے اس کا چربہ اپنی کتاب "ل تمپل ؤ ژیروسلم" کی وصلی ۳۵ پر چھاپ دیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ تحقیق جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہی اللہ کی مسجدیں بحال و درست کرتے ہیں۔ اس گنبد کی بحالی اور مرمت کا حکم امام ابوالحسن علی الظاہر لاعزاز الدین اللہ ابن الحاکم بامر اللہ امیر المومنین نے دیا۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر اور اس کے فیاض اجداد مطہرین پر رحمتیں نازل ہوں! یہ خدمت اس کے ملازم امیر معین الامۃ حافظ دولت علی ابن احمد انابت اللہ نے ۴۱۳ھ (=۱۰۲۲ء) میں انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے آقا امیر المومنین کے اقبال و استقامت کو دائم قائم رکھے اور مشرق و مغرب ارض پر اس کی حکومت کو وسیع کرے۔ اور سب کاموں کے آغاز و انجام میں ہم اسی کی حمد کرتے ہیں!"

دوسرا کتبہ گنبد کے اندر چینی کے چوکوں میں لکھا ہوا پایا گیا۔ افسوس ہے کہ یہ بہت بگڑ گیا ہے تاہم آخری لفظ صاف پڑھے جاتے ہیں۔ ایم دو گے نے اپنی کتاب (وصلی ۲۳) میں اس کا بھی عکس چھاپا ہے۔ گہرے سبز رنگ

باب سوم

کی چینی پر حروف زرد رنگ میں تحریر کئے ہیں۔ آخری الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :۔

"سنہ چار سو اٹھارہ میں"

یہ ہجری ۴۱۸ھ، ۱۰۲۷ء کے مطابق ہے اس سے ہم یہ بھی قیاس کرسکتے ہیں کہ زلزلوں سے چینی کو نقصان پہنچا تھا اور یہ چوکے پہلے چوکوں کی بجائے لگائے گئے ہیں ؎

ناصر خسرو کا بیان جس میں اس نے اپنی ۱۰۴۷ء کی سیاحت بیت المقدس کی کیفیت لکھی ہے، صلیبیوں کے آنے سے قبل زمانے کی آخری تحریر ہے۔ اس جگہ یہ تصریح ضروری ہے کہ ہاتھ یا ذرع (جو ہم نے فارسی کے ارش اور گز کا یہاں ترجمہ کیا ہے) الگی ذرع یا ۱۸ انچ کا سرکاری ہاتھ نہیں ہے بلکہ بعد کا عربی ہاتھ ہے جو انگریزی پیمانے کے ۲ فیٹ کے قریب ہوتا تھا۔ اس حساب سے دیکھئے تو ناصر خسرو کی دی ہوئی پیمائش اُس زمانے کے قبۃ الصخرہ کے عرض و طول سے حیرت انگیز مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن ستونوں اور پایوں کی تعداد و ترتیب جیسی ناصر خسرو نے بیان کی ہے، وہ اسوقت کے حال سے مطابقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ناصر خسرو نے اندر کے دور میں چار پائے اور ہر پائے کے درمیان دو ستون (گویا کل آٹھ ستون) بتائے ہیں۔ اور بیرونی دور میں تین ستون فی پایہ اور کل آٹھ پائے گنوائے ہیں۔ برخلاف اس کے آج کل اندرونی دور کے ہر پائے کے درمیان تین ستون ہیں اور باہر کے حلقے میں آٹھ پایوں میں فی پایہ دو ستون کے حساب سے کل سولہ ستون نظر آتے ہیں۔ (دیکھو نقشہ محاذی صفحہ ۱۲۴) اس طرح پایوں کو چھوڑ کر ستونوں کی کل تعداد جو ناصر خسرو نے بتائی ہے، بتیس ہوتی ہے بحالیکہ آج کل یہ تعداد صرف اٹھائیس ہے ؎

(دیکھو صفحات ۱۳۰ و ۱۳۱)۔

قبۃ الصخرہ اور قبۃ السلسلہ کے ستون اور پایوں کی ترتیب

(ناصر خسرو کے بیان کے مطابق ۱۰۴۷ء میں)

جنوبی دروازہ

الصخرہ

قبۃ السلسلہ

شمالی دروازہ
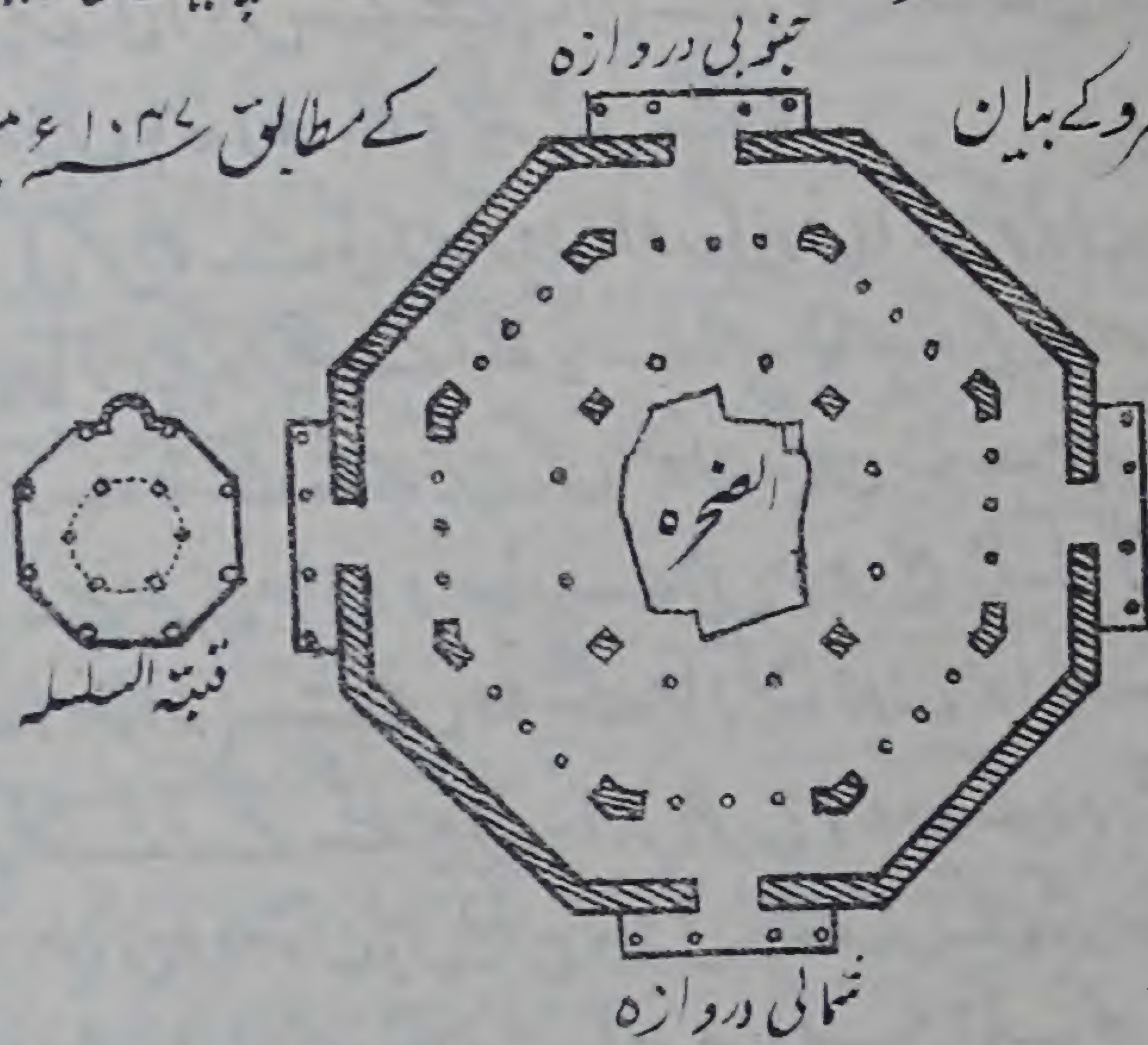
مسجد اقصیٰ کی کیفیت لکھنے کے بعد ناصر خسرو اسی سلسلے میں تحریر کرتا ہے کہ :-

قبۃ الصخرہ جس کی چٹان پہلے قبلہ تھی، اس طرح واقع ہے کہ اس چبوترے کے بیچ میں آگیا ہے، جو خود احاطۂ حرم کے وسط میں ہے یہ عمارت ایک باقاعدہ مثمن کی شکل میں بنائی ہے اور اس کے آٹھوں پہلو ۳۳، ۳۳ ہاتھ (یا ۶۶ فیٹ) کے ہیں چاروں اسماتِ صحیحہ کے مقابل یعنی مشرق، مغرب، جنوب، شمال میں دروازے ہیں اور ان کے درمیان کا پہلو ترچھا ہے۔ دیواریں ہر جگہ سے مربع پتھروں کی بنائی ہیں اور ۲۰ × ۲۰ ہاتھ (= ۴۰ فیٹ) بلند ہیں۔ خود چٹان کا محیط سو درع ہے۔ اس کی کوئی باقاعدہ صورت نہیں۔ یعنی نہ یہ گول ہے نہ چوکور بلکہ ایک ناتراشیدہ پتھر ہے جیسے کہ پہاڑوں میں ہوتے ہیں۔ اس کے چار طرف سے دیوار کے پائے اٹھائے ہیں جو بلندی میں بیرونی عمارت کے برابر بلند ہیں اور چاروں طرف دو دو پایوں کے درمیان سنگ مرمر کے ستونوں کا ایک ایک جوڑ قائم اور پایوں کے مثل ہی بلند ہے۔ ان بارہ پایوں

اور ستونوں پر گنبد کی (جس کے نیچے چٹان ہے) عمارت بنائی ہے اور گنبد کا محیط ایک سو بیس ہاتھ (= ۲۴۰ فیٹ) ہے[1]۔

باہر کی مثمن عمارت کی دیواروں اور پایوں اور ستونوں کے اندرونی حلقے کے درمیان چوکور پتھر کے آٹھ پائے اور بنائے ہیں اور ہر دو کے درمیان برابر کے فاصلے سے تین تین ستون رنگین سنگ مرمر کے قائم کئے ہیں۔ پائے سے میری مراد وہ سہارے ہیں جو مربع بنا کے قائم کئے جائیں اور ستون (= استوانہ) سے میں وہ کھمبے مراد لیتا ہوں جو ایک ہی پتھر سے گول تراش کر کھڑے کئے گئے ہوں۔ اس طرح اندر کے دور میں تو ہر دو پایوں کے درمیان دو ستون ہیں لیکن بیرونی حلقے میں تین تین ہیں[2]۔ ہر پائے کی سر دل سے چار چار شاخیں نکالی ہیں اور ہر ایک، ایک محراب بناتی ہے مگر ہر ستون کے اوپر کی چوکی پر سے صرف دو دو کمانیں بنتی ہیں۔

یہ گنبد عظیم جو چٹان کے گرد بارہ پایوں پر قائم ہے، ایک فرسخ دور سے پہاڑ کی چوٹی کی طرح اٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ گنبد کی بنیادوں سے کلس تک اس کا ارتفاع ۳۰ ہاتھ ہے اور یہ اصل مثمن عمارت سے جس کی دیواریں ۲۰ درعہ اونچی ہیں، اوپر ہے کیونکہ وہ ستون جن پر سے گنبد کو اٹھایا ہے، بیرونی دیواروں کے برابر بلند ہیں پھر پوری عمارت جس چبوترے پر بنی ہوئی

ف۱۔ ایم دوگے نے اپنی کتاب میں نہایت صحت کے ساتھ ناپ کر جو پیمائش دی ہے اس میں گنبد کے ڈھولنے کا قطر ۲۳ میٹر یا ½ ۷۵ فیٹ لکھا ہے۔ اس حساب سے محیط ۲۳۷ فیٹ ہوا جو ناصر خسرو کی بیان کردہ پیمائش (۲۴۰ فیٹ) سے بخوبی مطابق ہے۔

ف۲۔ متحف برطانی کے قلمی نسخے اور ایم شیفر کی عبارت میں بیرونی حلقے کے پایوں کی تعداد چھ لکھی ہے لیکن یہ چند ہی سطر آگے جو عبارت ہے اس سے مطابقت نہیں رکھتی جہاں اندر باہر کے پایوں کی تعداد ۴+۸ کل ۱۲ بتائی ہے۔ اور نہ یہ قبۃ الصخرہ کی صورت واقعی سے کوئی مناسبت رکھتی ہے کیونکہ عمارت کے مثمن شکل میں ہونے کے باعث بظاہر لازم تھا کہ اس کے بیرونی حلقے میں آٹھ اور اندر کی طرف چار پائے رکھے جائیں اور ان کی ہمیشہ یہی تعداد (یعنی ۱۲ پائے) رہی۔

باب سوم

ہے وہ خود حرم شریف کے صحن سے ۱۲ درع اونچا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ حرم شریف کے صحن سے گنبد کے کلس تک کل بلندی ۶۲ ہاتھ (= ۱۲۴ فیٹ) ہے[1] - عمارت کی چھت اوپر نیچے دونوں طرف چوبی ہے جیسے ستونوں، پایوں اور دیواروں کے اوپر اس طرح بنایا ہے کہ یہ وضع اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی ٭ خود چٹان زمین سے آدمی کے قد کے برابر بلند ہوگی - اس کے چاروں طرف سنگ مرمر کا محجر بنا ہوا ہے تاکہ اسے کوئی ہاتھ نہ لگا سکے - چٹان کا جھکاؤ قبلے کی سمت (یعنی جنوب کو) ہے اور ظاہر میں ایسا نظر آتا ہے کہ گویا کوئی شخص پتھر پر جب کہ وہ چکنی مٹی کی طرح نرم تھا، زور زور سے پاؤں رکھ کر گزرا ہے جس سے اس کے نقش پا اب تک بنے ہوئے رہ گئے ہیں - چٹان پر ایسے نقوش پا سات ہیں اور میں نے روایت سنی کہ ابراہیم علیہ السلام ایک مرتبہ اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ جب کہ وہ لڑکے تھے، یہاں تشریف لائے اور حضرت اسحٰقؑ اس جگہ پھرے اور یہ انہی کے پاؤں کے نشان ہیں ٭

قبۃ الصخرہ کے مکان میں زائرین اور عبادت گزاروں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے - عمارت میں ریشم اور دوسری قسم کے نفیس قالین کا فرش ہے گنبد کے وسط میں اور چٹان کے اوپر چاندی کی زنجیریں چاندی کا فانوس آویزاں ہے اور دوسرے حصوں میں بھی کثرت سے چاندی کے فانوس لگے ہوئے اور ہر ایک پر اس کا وزن کندہ کر دیا ہے یہ سب فانوس (فاطمی خلیفہ یعنی) سلطان مصر کے عطیہ ہیں اور میرے تخمینے میں یہاں کے مختلف ظروف نقرہ کا کل وزن ایک ہزار من (یعنی تقریباً ڈیڑھ ٹن یا ہندوستان کا

---

[1] اس فقرے کو میں اس امر کی خاص شہادت میں پیش کرتا ہوں کہ ناصر خسرو "ارش" "گز" (ہاتھ اور درع) دونوں کو مرادف استعمال کرتا ہے - اوپر ایک جگہ وہ کہ آیا ہے کہ چبوترہ ۱۲ ارش اونچا ہے اور یہاں بارہ گز بتاتا ہے اور دیواروں کے ۲۰ گز اور گنبد کے ۳۰ ارش جوڑ کر ان کی میزان (۶۲ گز) گزوں میں لکھتا ہے - آج کل گنبد کی بلندی تخمیناً ۱۱۲ فیٹ ناپی گئی ہے (مترجم) کا تخمینہ (چبوترے کی بلندی چھوڑ کر) ۵۰ درع ہے جو سو فیٹ کے مساوی ہوا ٭

باب سوم

ایک پختہ من) ہوگا۔ یہاں میں نے ایک بڑی شمع دیکھی جو سات ہاتھ اونچی اور تین بالشت قطر کی تھی۔ وہ زیباجِ[1] کے کافور کی مثل سفید تھی اور اس کے موم میں عنبر گندھا ہوا تھا۔ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ سلطان مصر ہر سال کثیر تعداد میں بتیاں روانہ کرتا ہے اور انہی میں ایسی بڑی شمع بھی ہوتی ہے جس کا میں نے حال بیان کیا اور جس پر سنہری حروف میں سلطان کا نام تحریر تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا قبۃ الصخرہ کی چھتیں اور بالائی حصے سب پر سیسہ جڑا رکھا ہے قبے کے چاروں پہلوؤں پر ایک ایک بڑا آتشدان ہے جس میں دوہرے ہوجانے والے ساج کے پٹ ہیں۔ یہ پٹ ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ معراج کی رات حضور نبی کریم علیہ الصلواۃ والتسلیم نے پہلے قبۃ الصخرہ میں چٹان پر دست مبارک رکھ کر دعا فرمائی اور جس وقت آپ باہر تشریف لانے لگے تو چٹان تعظیم کے لیئے بلند ہوئی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک رکھدیا کہ وہ اپنی جگہ رہے اور مضبوطی سے وہیں اسے جمادیا۔ بایں ہمہ بلند ہوجانے کے باعث وہ آج تک زمین سے کسی قدر اوپر اٹھی رہ گئی ہے پھر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے بڑھے اور اس گنبد میں تشریف لائے جو اب تک حضورؐ کے نام سے منسوب ہے اور یہاں (مرکب) براق پر سوار ہوئے۔ اسی لیئے یہ گنبد مبارک محترم سمجھا جاتا ہے۔ چٹان کے نیچے ایک وسیع غار ہے جس میں برابر موم بتیاں جلاتے رہتے ہیں اور لوگوں کا بیان ہے کہ جس وقت چٹان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے لیئے اٹھی تو یہ جگہ خالی ہوگئی اور جب تھام کر اسے جمایا تو وہیں لگے وہیں جم گئی جس حال میں کہ اب نظر آتی ہے" (ناصر خسرو ۴۴ تا ۵۰)

---

[1] ۔ صاحب مراصد کے قول کے مطابق زیباج یا زابج ہندوستان کے آگے کے ان علاقوں کا نام ہے جو چین کی سرحد پر واقع ہیں اور ممکن ہے اس سے کوچین (چین) مراد ہو؟

خود چٹان کی نسبت ناصر خسرو نے حسبِ ذیل کیفیت لکھی ہے:

"یہ چٹان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے موسیٰ علیہ السلام کو قبلہ (یعنی سمت نماز) بنانے کا حکم دیا۔ اس حکم کے آنے اور صخرہ کو بطور قبلہ قائم کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور یک بیک پیام رحلت آ گیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ آیا تو انھوں نے اس چٹان کو سمت قبلہ دیکھ کر اس کے گرد ایک مسجد تعمیر فرما دی اور یہ چٹان مسجد کے وسط میں آ گئی اور اس پر کھڑے ہو کے لوگ خطبہ دیا کرتے تھے۔ ہمارے رسول سرور کائنات سیدالموجودات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہی حال رہا اور آں حضور نے بھی شروع میں اسی چٹان کو سمت قبلہ تسلیم فرمایا یعنی اسی کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے کچھ روز بعد (سنہ ۲ھ ماہ رجب میں) حکم دیا کہ آئندہ (مکۂ معظمہ کے) خانۂ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جائے۔" (صفحہ ۲۷)

سنہ ۱۳۵۱ء میں مثیر کے مصنف نے ایک واقعے کا جسے وہ حیرت انگیز سمجھتا ہے ذکر کیا ہے اور یہ واقعہ ناصر خسرو کی سیاحت کے چند ہی سال بعد کا ہے وہ لکھتا ہے کہ:-

"۴۵۲ھ (= سنہ ۱۰۶۰ء) میں قبۃ الصخرہ میں جو بڑا جھاڑ (تنور) آویزاں تھا وہ نیچے گر پڑا۔ اس میں پانچ سو فانوس تھے۔ اس وقت جو مسلمان بیت المقدس میں تھے انھوں نے اسے بدشگونی سمجھا اور کہنے لگے کہ عالم اسلامی میں ضرور کوئی بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔"

سنہ ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا اور قبۃ الصخرہ کو ہیکل

۱؎ عربی کتاب میرے مضمون (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی، سلسلہ جدیدہ، جلد ۱۹، ص ۳۰۹) میں درج ہے یہ فقرہ سیوطی نے (ملاحظہ ہو رسالہ مذکور صفحہ ۲۸۷) اور نیز مجیر الدین نے (نسخہ مطبوعہ قاہرہ - ۲۷۰) لفظاً لفظاً نقل کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس سال تاریخوں میں کسی زلزلے کے آنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

مسیح علیہ السلام سمجھکر شہسواران دیر (= فرقہ الداؤیہ) کے حوالے کردیا۔ چونکہ یہ لوگ اسے خاص خانۂ خدا جانتے تھے۔ لہذا اس کی تصویر انھوں نے اپنے جنگی طغرے میں داخل کی اور اس کا نقشہ اور روکارہ دونوں کی ان گرجاؤں میں نقل کی جانے لگی جو لنڈن، لیئون، منٹیز وغیرہ یورپ کے مختلف شہروں میں اس طبقے کے شہسواروں نے تعمیر کرائے۔ رافائیل کی مشہور تصویر "اسپوسالی زیو" میلان کے تصویر خانہ بریرا میں محفوظ ہے۔ اس میں حضرت مریمؑ کی خدمت میں تحائف عروسی ایک معبد کے دروازے کے روبرو پیش کئے جارہے ہیں ان میں جو معبد دکھایا ہے وہ خاص طرح قبۃ الصخرہ کی تصویر نظر آتا ہے۔

صقالوی جغرافیہ نویس ادریسی نے ۱۱۵۴ء میں قبے کی مختصر کیفیت تحریر کی ہے مگر وہ خود فلسطین کبھی نہیں گیا لہذا جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ یقیناً ان بیانات سے جو گیارھویں صدی کے اوائل میں اس تک پہنچے، اخذ کیا ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ "مسجد اقصیٰ کے وسط صحن میں وہ گنبد عظیم جو قبۃ الصخرہ کے نام سے مشہور ہے، بلند ہوتا ہے گنبد پر کمال ہنرمندی اور خوبصورتی سے سونے کی میناکاری کی ہے اور مسلمان خلفا کی بنائی ہوئی عمارت ہے۔ اس کے بیچ میں وہ چٹان (صخرہ) ہے جس کی نسبت لوگ کہتے ہیں کہ وہ جنت سے پھینکی گئی تھی۔ یہ ایک سنگ تودہ ہے کہ چبوترے کے برابر بلند گنبد کے وسط کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے ایک پہلو کا سرا فرش سے نیم قد آدم یا کچھ زیادہ اوپر اٹھا ہوا ہے اور دوسرا چبوترے کے ہم سطح ہے۔ چٹان کی لمبائی، قریب قریب چوڑائی کے برابر ہے اور دونوں رخ دس دس ہاتھ سے کچھ زیادہ ہوں گے نیچے کے رخ سے آپ ایک تاریک حجرے میں جو تہ خانے سے مشابہ ہے، اندر اتر سکتے ہیں اور اس حجرے کا طول ۱۰ ہاتھ اور عرض ۵ ہاتھ اور بلندی آدمی کے قد سے قدرے اونچی ہے۔ لیکن روشنی کے بغیر اس حجرے میں جانا غیر ممکن ہے۔

قبۃ الصخرہ کے چار دروازے ہیں۔ غربی دروازے کے مقابل ایک قربان گاہ بنی ہوئی ہے جس پر بنی اسرائیل نذر و نیاز لا کے رکھا کرتے تھے۔ شرقی دروازے سے ملا ہوا گرجا ہے جسے "حظیرۃ القدس" کہتے ہیں اس کا

طول وعرض نہایت متناسب اور قابل داد ہے۔ شمالی دروازے کے مقابل ایک نظر فریب باغ ہے۔ جس میں طرح طرح کے درخت ہیں اور اس باغ کے گرد سنگ مرمر کے ستونوں کا ایک دالان چلا گیا ہے جس میں کمال کاریگری صرف کی ہے۔ باغ کے آخری حصے میں نشست گاہ بنائی ہے جہاں علماء اور قسیس عام طور پر کھانا کھاتے ہیں" (ادریسی)

علماء کے اس باغ کا علی ہروی نے بھی ذکرہ کیا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے اور اس سے بالیقین اغسطینی مقیمین کا مکان مراد ہے جن کا گوڈفری ڈی بوئیلون نے ایک شعبہ یہاں قائم کیا تھا۔ ممکن ہے کہ ناصر خسرو نے ۱۰۴۷ء میں جس "گنج صوفیاء" کا ذکر کیا ہے[1] عیسائیوں نے یہ شعبہ اسی جگہ پر قائم کیا ہو۔ رہا کلیسائے "حظیرۃ القدس" تو اس سے وہ عمارت مراد ہے جسے مسلمان "قبۃ السلسلہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس کا ہم اگلے باب میں حال بیان کریں گے۔ لیکن بنی اسرائیل کی قربان گاہ جس کا ادریسی نے ذکر کیا بظاہر عیسائیوں کی گھڑی ہوئی بات ہے اور کسی اسلامی عمارت سے مطابقت نہیں رکھتی" سیتے دڑیروسلم (مصنفہ تقریباً ۱۲۲۵ء) اور بعض اور عیسائی تصانیف میں بھی اس کا حال آتا ہے اور ایک (عیسائی) مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ آخر میں مسلمانوں نے اس (قربان گاہ) کو بدل کے دھوپ گھڑی بنا دیا تھا۔

علی ہروی سلطان صلاح الدینؒ کے شہر کو دوبارہ تسخیر کرنے سے ۱۵ سال پہلے، یعنی ۱۱۷۳ء میں بیت المقدس آیا اور قبۃ الصخرہ کا مفصل حال جیسا دیکھا تھا، لکھ گیا ہے۔ چٹان کے گرد سنگ مرمر کے مجر کی بجائے جس کا ناصر خسرو نے حال لکھا ہے صلیبیوں نے لوہے کا جنگلا لگا دیا تھا اور علی ہروی کی نظر سے یہ تبدیلی مخفی نہیں رہی لوہے کے اس "جنگلے" کے بعض ٹکڑے ابھی تک موجود ہیں اور ووگے نے اپنی کتاب میں تصویر دے کے اس کی کیفیت دکھائی ہے "چٹان

[1] دیکھو کتاب کا پانچواں باب "حرم شریف کے دروازے"

[2] پیلسٹائن انڈر مسلمز لسٹرینج "صفحہ ۲۲۰"

باب سوم

کے نیچے کے غار کو علی "مغارۃ الارواح" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ آج کل جو روایت مشہور ہے اس میں "روحوں کا کنواں" (بیر الارواح) بھی ایک مقام کو کہتے ہیں مگر وہ یہ زمین دوز حجرہ نہیں بلکہ اس کے فرش میں چٹان کھود کر ایک کنواں بنالیا ہے۔ گنبد کی اور جو کیفیت علی نے تحریر کی ہے وہ اس زمانے کی حالت کا صحیح مرقع پیش کرتی ہے کہ اس میں اندرونی اور بیرونی حلقے کے ستون اور پائے جن پر گنبد قائم ہے' ان کی ترتیب و تعداد بجنسہ وہی ہے جیسی کہ اس زمانے میں حالانکہ یاد ہوگا کہ قدیم تر بیانات ان جزئیات میں اختلاف دکھاتے ہیں لیکن یہ ردو بدل کب ہوئی؟ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ ذرع جس سے علی ہروی نے پیمائش کی بظاہر وہی ۱۸ انچ یا کم کا سرکاری ذرع ہے۔ بہر حال علی کا بیان حسب ذیل ہے:۔

قبۃ الصخرہ (مصنف کا مطلب یہاں گنبد کے نیچے کی چٹان سے ہے) پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش پا موجود ہیں میں نے فرنگیوں کے تسلط کے وقت بھی چٹان کی زیارت کی تھی اور اس کا جو حصہ نظر آتا تھا وہ صرف گنبد کے شمالی رخ میں پڑا تھا اور اس کے گرد ایک لوہے کا جنگلا تھا۔ لیکن اب سلطان صلاح الدینؒ کے شہر مقدس کو دوبارہ تسخیر کرنے کے بعد گنبد میں جنوب کی طرف بھی چٹان نظر آتی ہے۔ اس کے نیچے کے رخ ہر طرف ایک حد بنا رکھی ہے جس پر چینی کا کام کیا ہے اس جگہ چٹان کا عرض صرف ایک بالشت اور بلندی ۲ ذرع ہے۔ محیط چار ذرع سے کچھ زیادہ چٹان کے نیچے "روحوں کا غار" ("مغارۃ الارواح") ہے جس کی نسبت لوگ کہتے ہیں کہ تمام اہل ایمان کی روحیں حکم الہی سے اس مقام پر جمع ہوں گی۔ غار میں پہنچنے کے لیے ۱۴ سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں اور لوگوں کا بیان ہے کہ زکریا علیہ السلام کی قبر بھی اس غار کے اندر ہے۔ غار کی بلندی قد آدم عرض، شرقاً غرباً ۱۱ قدم طول شمالاً جنوباً ۱۳ قدم ہے۔ اس کی چھت میں مشرق کی طرف ایک درز کوئی ڈیڑھ ذرع لمبی چوڑی پائی جاتی ہے۔ محیط میں ۵ "ذرع ہے" قبۃ الصخرہ کی عمارت کے چار بڑے دروازے ہیں اور میں پہلی مرتبہ یہاں سنہ ۵۶۹ھ (۱۱۷۳ء)

باب سوم

میں تسلط فرنگ کے زمانے میں جیسا کہ اوپر بیان کیا آیا تھا۔ اس وقت مغارۃ الارواح کے دروازے کے مقابل اور لوہے کے جنگلے کے قریب حضرت داؤد کے بیٹے سلیمان علیہ السلام کی تصویر لگی ہوئی تھی اور جنگلے کے قریب ہی جست کے دروازے کے مغرب میں اوپر کو اٹھی ہوئی مسیح علیہ السلام کی بھی تصویر تھی جس پر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

گنبد کا شرقی دروازہ قبۃ السلسلہ کی طرف کھلتا ہے۔ اس کے اوپر ایک محراب بنی ہوئی ہے اور محراب پر خلیفہ قائم بامر اللہ کا نام اور سورۂ اخلاص کندہ ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا قبۃ السلسلہ قبۃ الصخرہ کے مشرق میں ہے اور یہی مقام ہے جہاں حضرت سلیمانؑ ابن داؤدؑ بیٹھکر دادرسی فرماتے تھے۔ قبۃ الصخرہ کے شمال کی طرف دار القساس (علما کا مکان) تھا۔ یہ عمارت کھمبوں پر قائم ہے[1]۔ قبۃ الصخرہ کی مثمن عمارت کو آٹھ پایوں اور سولہ ستونوں پر بنایا ہے اور اس کے اندر کا گنبد چار پایوں اور بارہ ستونوں پر تعمیر کیا ہے۔ ڈھولنے کے دور میں سولہ سلاخ دار دریچے ہیں۔ ڈھولنے کا محیط ایک سو ساٹھ درع (= ۲۴۰ فیٹ) ہے اور ساری عمارت جس کے اندر یہ جملہ چیزیں بنی ہوئی ہیں سولہ کم چار سو درع (= ۳۸۴ درع = ۵۷۶ فیٹ) ناپا ہوا ہے۔ لیکن قبۃ السلسلہ اور اس کے ساتھ کی دوسری عمارتوں کو بھی ملا لیا جائے تو ان سب کے گرد جو خط کھنچے گا وہ ۴۸۲ درع (= ۷۲۳ فیٹ) کا ہوگا۔ چٹان کے گرد جو لوہے کی حد کھنچی ہے اس کی بلندی قد آدم سے دگنی ہے۔ قبۃ الصخرہ کے چار بڑے دروازے یا آہنی پھاٹک ہیں۔ پہلا شمال میں باب الرحمہ کی طرف دوسرا مغرب میں باب الجبرئیلؑ کی طرف۔ تیسرا قبلہ رو (جنوب میں) اور چوتھا مشرق میں قبۃ السلسلہ کی طرف۔ قبۃ السلسلہ کا دور ساٹھ قدم ہے" (علی ہروی۔ نسخہ اکسفورڈ۔ ورق ۳۸-۳۵)

۱۱۸۷ء میں بیت المقدس پر سلطان صلاح الدینؒ کا دوبارہ قبضہ ہوا

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۰ ایک

باب سوم

اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس نے حرم شریف کے احاطے کو پھر کامل طور پر اصلی حالت میں واگزاشت کیا۔ فرنگیوں کے جوش تبرک گیری سے چٹان کی جو حالت ہو گئی تھی اس کی کیفیت ابن اثیر کی تاریخ سے معلوم ہوتی ہے۔ علی ہروی نے چٹان کے گرد جس حد یا منڈیر کا ذکر کیا ہے وہ غالباً چٹان کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ ردا تھا جسے صلاح الدین نے ہٹا دینے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ ابن اثیر ۵۸۳ھ کے حالات میں تحریر کرتا ہے کہ "فرنگیوں نے چٹان پر سنگ مرمر کی ایک (ردا یا) تہ چڑھوا دی تھی اور اسے صلاح الدین نے حکماً اتروا دیا۔ اور اس تہ بندی کا سبب یہ تھا کہ ابتدا میں فرنگیوں کے مذہبی پیشوا چٹان کے ٹکڑے توڑ توڑ کر فرنگی زائرین کے ہاتھ بیچا کرتے تھے جو دور دور سمندر پار سے زیارت کے لئے آتے تھے اور یہ لوگ ان ٹکڑوں کو نہایت بابرکت سمجھ کر ان کے ہم وزن سونا دے دے کر خوشی سے خرید لیتے تھے۔ یہ دیکھ کر بعض (لاطینی) بادشاہوں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری چٹان اس طرح غائب نہ ہو جائے اور انھوں نے حکم دیا کہ اس کو محفوظ رکھنے کی غرض سے سنگ بستہ کر دیا جائے" (ابن اثیر۔ نہم ۳۶۵)

پوری درستی اور بحالی کے بعد سلطان صلاح الدین نے چٹان کے اوپر اور گنبد کی چھتری کے اندر چینی کے گول اور چوکور پتھروں میں نہایت خوبصورت کتبہ لگایا جو اب بھی اپنی جگہ پر نظر آتا ہے۔ اس طویل عربی کتبے کی اصل عبارت ووگے کی کتاب میں جس کا ہم بار بار حوالہ دے چکے ہیں[1] درج ہے ہم اس کے صرف ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں۔ عبارت ایک ہی سطر میں تحریر نہیں ہے۔ لیکن ذیل کے فقروں میں اعداد لگا کے تختیاں اور گول گتوں کی ترتیب دکھائی ہے جن میں عربی عبارت دائیں سے بائیں طرف لکھی ہوئی چلی جاتی ہے اور یہ پتھر چھتری میں ایک دوسرے کے اوپر نصب ہیں سلطان صلاح الدین کے کتبے کے علاوہ دو اور کتبے بہت بعد کے زمانے

[1] "ل ٹمپل دیروسلم"، صفحات ۹۱-۹۲ ۔

کے بھی اسی مقام پر لکھے ہوئے ہیں جہاں پہلے جگہ خالی چھوٹ گئی تھی :۔

۱ - ۱۴ - ۲ - ۱۵ - ۳ - ۴ - ۸ - ۱۶ - ۹ - ۵ -

۱۰ - ۶ - ۱۱ - ۷ - ۱۲ - ۱۳ -

"۱ - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - تجدید جلا کا حکم نافذ کیا اس

۲ - قبہ شریف کی - ہمارے آقا سلطان بادشاہ فاتح

۳ - عاقل و عادل صلاح الدین یوسف نے

۴ - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵ - ماہ رجب ۵۸۶ھ کے تیسرے عشرے میں ......

۶ - اللہ تعالیٰ کے حقیر خادم صلاح الدین

۷ - یوسف ابن ایوب ابن شادی کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ اسے اپنی حفظ و حمایت میں رکھے!"

سہولت کے لیے ہم دونوں کتبوں کا بھی یہیں ترجمہ کیے دیتے ہیں جو صلاح الدین کے کتبے کے درمیان بین السطور تختیوں اور کتبوں میں لکھے ہوئے ہیں - ان میں سے پہلا مملوک سلطان مصر محمد ابن قلاعون کی تجدید عمارت کی یادگار ہے (۷۱۸ھ و ۷۱۹ھ = ۱۳۱۸ و ۱۳۱۹ء) اور دوسرا گزشتہ صدی میں سلطان محمود ثانی عثمانی نے تحریر کرایا ہے - اس کتبے کی تاریخ محفوظ نہیں رہی صرف صدی کے دو عدد رہ گئے اور آگے کے ہندسے مٹ گئے ہیں یعنی (۱۲××ھ) پڑھا جاتا ہے - سلطان محمود ثانی ۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ حکومت کرتا رہا (۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء)

"۸ - اس گنبد پر جلا کرنے اور اسی کے ساتھ جست کے بیرونی گنبد کو دوبارہ بنانے کا حکم دیا ہے،

۹ - ہمارے آقا ... ناصر الدین والدّنیا

۱۰ - سلطانِ آفاق، حامیِ دینِ متین

۱۱ - سلطان الاسلام محمد ابن السلطان والشہید

۱۲ - الملک المنصور قلاعون رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے - اور یہ (درستی کا کام) شہور ۷۱۸ھ میں اتمام کو پہنچا -

باب سوم

۱۳ - اور اس کی نگرانی اللہ تعالیٰ کے خادم حقیر صاحب عقل و ہنر
۱۴ - عالیجناب امیر جوالی مہتمم حرمین شریفین کے تفویض تھی
۱۵ - عفی اللہ تعالیٰ عنہ - اور یہ ۱۹۷ ھ میں (ہوا)"

---

۱۶ - اندر سے جلا اور بیرونی گنبد کی تعمیر کا حکم دیا ہمارے آقا سلطان محمود خاں نے سنہ ×× ۱۲ میں"

سیاح ابن بطوطہ جو ۱۳۵۵ء میں بیت المقدس آیا تھا، قبۃ الصخرہ کے متعلق سوائے چند باتوں کے زیادہ جزئیات نہیں بتاتا - وہ عمارت کی تحسین میں رطب اللسان ہے - اور چار بڑے دروازوں اور گنبد کے اندرونی ایوان کا جو نقوش و رنگ سے آراستہ تھے، تذکرہ کرتا ہے - چٹان کی کیفیت لکھ کر اور اس کے نیچے کے غار کا ذکر کرکے، وہ اسی سلسلے میں کہتا ہے کہ "چٹان کے گرد دو جنگلے اس کی حفاظت کے واسطے لگا دئیے ہیں - ان میں سے جو چٹان کے قریب تر ہے وہ لوہے کا ہے اور دوسرا چوبی - گنبد میں لوہے کی ایک بڑی سپر لٹکی ہوئی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ حمزہ ابن عبد المطلب (عم رسول اللہ صلعم) کی ڈھال ہے" (جلد اول - ۱۲۲ و ۱۲۳)

مجیر الدین بیان کرتا ہے کہ ۸۵۱ ھ (۱۴۴۸ء) میں قبۃ الصخرہ کی چھت آگ سے برباد ہو گئی تھی اور اسے سلطان الملک الظاہر نے اس طرح دوبارہ تعمیر کرایا کہ "وہ پہلے سے بھی زیادہ خوشنما ہو گئی" (صفحہ ۴۳۴) آگ لگ جانے کا سبب بعض ماخذوں میں بجلی کو لکھا ہے جو عمارت کے جنوبی حصے پر گری تھی دوسری روایت یہ ہے کہ ایک لڑکا کبوتر پکڑنے کی غرض سے چھت کے اندر شمع لئے ہوئے گھسا تھا اس کے ہاتھ سے آگ لگی"

سیوطی ۱۴۷۰ء میں چٹان اور اس کی حوالی کے عجائبات کا اس طرح تذکرہ کرتا ہے - یہاں جو نقوش پائے ہوئے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب سوم

کے ہیں۔ جب کہ آنحضور آسمان پر جاتے وقت براق پر سوار ہوئے۔ صلیبی جنگ کے زمانہ میں انھیں مسیح علیہ السلام کے نقش پا بتاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمرؓ تشریف لائے تو چٹان کو گویائی عطا ہوئی اور اس نے آپ کو مرحبا کہا اور جبرئیل علیہ السلام کی انگلیوں کے نشان، وہ ہیں کہ جب چٹان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آسمان پر جاتے وقت معیت کرنی چاہی تو حضرت جبرئیلؑ نے اسے دھکا دے کر اپنی جگہ پر قائم کیا اور یہ نشان باقی رہ گئے۔ آج کل یہ قدم شریف چٹان سے الگ ایک پتھر پر اور اسکے مقابل میں دوسری یعنی جنوب مغرب کی طرف نظر آتے ہیں۔ اس پتھر کو ایک ستون پر ٹکا دیا ہے اس زمانے میں چٹان نیچے کے غار کے ہر طرف دیوار کی طرح واقع ہے بجز جنوبی حصّے کے جہاں سے غار کی آمد و رفت کا راستہ ہے۔ اس جگہ چٹان غار کے جنوب میں اتری ہوئی نہیں ہے کیونکہ یہاں کھلی ہوئی جگہ ہے اور اسی میں سے زینے کے ذریعے اتر کے نیچے غار میں جاتے ہیں۔ زینے میں ایک چھوٹی سی الماری بنی ہوئی ہے جس کے قریب زائرین ٹھہر کر چٹان کی زبان کی زیارت کرتے ہیں اس جگہ ایک سنگ مرمر کا ستون ہے جس کا نیچے کا حصہ الماری کے جنوبی سرے پر ٹکا ہوا ہے اور اوپر کا رخ چٹان کے بالمقابل نکلا ہوا ہے گویا اسے جنوب کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے یا ممکن ہے کوئی اور غرض ہو۔ اور چٹان کے اس حصّے پر جو اس کے نیچے آگیا ہے، قائم ہے۔ جبرئیلؑ کی انگلیوں کا نشان چٹان کے مغربی جانب ہے اور قدم شریف کی مذکورہ بالا جگہ سے علٰحدہ ہے۔ یہ قبۃ الصخرہ کے مغربی دروازے کے سامنے مگر قریب ہی رکھا ہوا ہے" (سیوطی ۲۵۸۔ منقولہ مجیر الدین ۳۷۱)

قبۃ الصخرہ میں آج بھی لوگ یہ عجائبات دکھاتے ہیں اور وہ انہی مقامات پر ہیں، جہاں سیوطی نے انھیں دیکھا تھا؛

ختم کرتے وقت ذیل کی پیمائشیں خالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔ انھیں مجیر الدین نے تحریر کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی ۱۴۹۶ء میں

باب سوم

کیفیت لکھتے وقت اس نے احتیاط سے پیمائش کی تھی "کاریگروں کا درع" جیسا کہ اوپر بیان ہوا، $2\frac{1}{2}$ فیٹ سے کچھ زیادہ کا ہوتا تھا۔

"قبۃ الصخرہ کی عمارت مثمن ہے۔ کاریگروں کے درع سے اسکی بیرونی پیمائش ۲۴۰، اور اندرونی ۲۲۴ درع ہے۔ گنبد کی بلندی فرش سے چوٹی تک ۵۱ درع ہے۔ چبوترہ جس پر گنبد تعمیر ہے، حرم شریف کے صحن سے ۷ درع اونچا ہے، اس حساب سے حرم شریف کے صحن سے گنبد کی بلندی ۵۵ درع ہوئی۔ گنبد کے (اندرونی حلقے میں) ۱۲ ستون اور چپار پائے ہیں۔"

(مجیر الدین - ۳۷۰ و ۳۷۱)

باب چہارم

بیت المقدس

روایات :۔ حضرت عمرؓ کا چٹان کو معلوم کرنا ٭ خلیفہ عبد الملک کا خدام کو مقرر کرنا ٭
قبۃ السلسلہ : چھوٹے گنبد ــــ چبوترہ اور زینہ ــــ صحن اور احاطۂ حرم شریف ــــ مہد مسیحؑ اور اصطبل سلیمانؑ ــــ چھوٹی عمارتیں ــــ منارے ٭

روایات

گزشتہ باب میں ہم نے قدیم ترین عربی ماخذ یعنی تیسری چوتھی صدی ہجری سے لگا کے آگے تک کی جو عربی تاریخیں اور جغرافیے میسر آئے، ان سے نیز مسلمان زائروں کے بیانات سے جنھوں نے بیت المقدس کی سیاحت کے حالات تحریر کیے ہیں، قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی تاریخ مرتب کی ہے لیکن حالات مذکورہ کے پہلو بہ پہلو ان روایتوں کا سامنے رکھ دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا جن میں خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے چٹان کو دوبارہ دریافت کرنے اور خلیفہ عبد الملک کے قبہ تیار کرانے کے بعد مختلف خدام مقرر کرنے کی کیفیت

باب چہارم

بیان کی جاتی ہے۔ ان روایات کی تفصیلات محض سماعی ہیں اور غالباً انھیں صلیبی لڑائیوں کے بعد کے زمانے میں قلمبند کیا گیا تھا۔ جہاں تک میں دریافت کر سکا ان روایات کو سب سے اول کتاب مثیر الغرام (دیکھو صفحہ ۱۲) میں جمع کیا ہے جو ۱۳۵۱ء (۷۵۲ھ) میں یعنی حضرت عمرؓ سے سات صدی سے بھی زیادہ اور خلیفہ عبدالملک کے قریب قریب سات سو برس بعد تالیف ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ محاربات صلیب ختم ہو چکے اور فرنگی کچھ ہی مدت پہلے ارض مقدس سے نکال باہر کئے گئے تھے اور ان ایام میں ایسی تاریخی داستانوں کا (جیسی کہ مصنوعی واقدی کی "تاریخ" وغیرہ ہیں) ان تمام ولایات میں جن کو صلاح الدینؒ اور اس کے اخلاف نے انہی دنوں فرنگی نصاریٰ کے تسلط سے نجات دلائی، خوب چرچا تھا۔ حقیقت میں صلاح الدینؒ کا فلسطین کو دوبارہ فتح کرنا حضرت عمرؓ کے عہد کی پہلی اسلامی فتوحات کی یاد تازہ کرتا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ چودھویں صدی عیسوی تک اس قدیم زمانے کی بعض تاریخی روایات زبانی چلی آتی ہوں جن کی بنیاد پر ذیل کی روایتیں مرتب کر لی گئیں۔

مثیر میں جیسا کہ اقتباساتِ ذیل سے واضح ہوگا اسناد نقل کرکے محدثانہ شان بھی دکھائی گئی ہے کہ فلاں روایت فلاں شخص نے بیان کی اور اس نے اپنے باپ سے اور اس نے دادا سے اور اس نے فلاں فلاں سے اس کو سنا تھا۔ لیکن یہ طریقہ جو عربوں میں احادیث و روایات نقل کرنے کا عام طور پر مروج تھا مثیر کے معاملے میں محض بے معنی ہے اس لئے کہ سوائے مصنف کتاب کے اوپر کے کسی راوی کا کوئی معتبر حال معلوم نہیں ہے۔ پھر انہی روایتوں کا مثیر کے بعد کے مصنفوں نے سرقہ کیا اور بے تکلف اپنی اپنی کتابوں میں نقل کرتے رہے۔ شمس الدین سیوطی (۱۴۷۰ء) مثیر کی عبارتیں کی عبارتیں بلفظہٖ نقل کرتا ہے۔ اور مجیر الدین نے ۱۴۹۶ء میں انہی سب کو ادھر ادھر بعض حاشیے چڑھا کر دہرا دیا ہے[۱]۔ آئندہ صفحات میں ہم نے مثیر کی

ملہ:۔ اس ترجمہ کا عربی متن پیرس کے قلمی نسخہ مثیر سے نقل کرکے میں جنرل اوف دی رائل ایشیاٹک

ترتیب عبارات کی پابندی نہیں کی بلکہ واقعات کی ترتیب زمانی کے لحاظ سے ترجمہ پیش کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کی فتوحات از مثیر، باب پنجم [۱]

"الولید [۲] سعید ابن عبدالعزیز کی روایت سے، بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب شریف قیصر روم کے پاس آیا تو وہ اس وقت بیت المقدس میں آیا ہوا تھا [۳]۔ اس زمانے میں بیت المقدس کی چٹان پر ایک کوڑی کا بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا جس نے محراب داؤد کو بالکل چھپا لیا تھا اور اس کوڑی کو عیسائیوں نے محض یہودیوں کو جلانے کے لیے یہاں جمع کرایا تھا اور نصرانی عورتیں اپنے غلیظ کپڑے لتے تک یہاں آ آ کے پھینکا کرتی تھیں اور اس طرح ایک بڑا انبار غلاظت کا جمع ہو گیا تھا القصہ جب قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پڑھا تو چلایا کہ "اے رومیو یقین جانو کہ تمھیں وہ قوم ہو جو اس کوڑی پر ہلاک کی جائے گی کیونکہ تم نے اس مسجد کے تقدس میں خلل ڈالا اور اسے ناپاک کیا ہے۔ اور تمھارے ساتھ بھی وہی ہوگا جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا کہ انھیں یحییٰ ابن زکریا کا خون کرنے کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا۔" پھر قیصر نے انھیں جگہ کے صاف کرنے کا حکم دیا اور وہ صاف کرنے لگے تھے لیکن جب مسلمانوں نے شام پر

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ:۔ سوسائٹی، جلد نوزدہم، جزو دوم میں چھپوا چکا ہوں اور اسی میں مثیر کے رواۃ پر بھی تفصیلی بحث ملے گی۔

۱:۔ سیوطی نے اسے نقل کیا ہے (صفحہ ۲۷۸)

۲:۔ الولید ابن مسلم جس کی سند پر اکثر بیانات بنی ہیں، دمشق کا باشندہ اور مشہور محدث تھا۔ تہتر برس کی عمر میں ۱۹۴ھ یا ۱۹۵ھ (= ۸۱۰ء) میں وفات پائی (بقول نواوی مطبوعہ وسٹن فیلٹ صفحہ ۶۱۸)

۳:۔ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خسرو پرویز (بادشاہ ایران) اور قیصر روم کے پاس ایلچی بھیجے تھے اور انھیں دعوت دی تھی کہ وہ بلا تاخیر آپ کی رسالت تسلیم کریں۔

باب چہارم

حملہ کیا تو صرف ایک تہائی حصہ صاف ہونے پایا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ بیت المقدس میں تشریف لائے اور اس شہر کی تسخیر عمل میں آئی تو وہ چٹان پر غلاظت کا ڈھیر دیکھ کر لرز گئے اور حکم دیا کہ اس کی پوری صفائی کی جائے اور اس کام کے لیے لوگوں نے فلسطین کے نبطیوں کو مجبور کیا کہ بلا مزد اسے انجام دیں۔ جبیر ابن نفیر کی سند سے روایت کی گئی ہے کہ کوڑی کے ہٹنے کے بعد جب چٹان نظر آنے لگی تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک تین مرتبہ زور سے پانی نہ برس جائے، اس وقت تک چٹان پر نماز ادا نہ کی جائے؎

شداد ابن اوس سے جو حضرت عمرؓ کے بیت المقدس کے حرم شریف میں داخل ہوتے وقت، ہمراہ تھے۔ یہ روایت منسوب کی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ امان وہی اس شہر کو مفتوح کرا دیا، تو حضرت عمرؓ اور ان کے ہمراہی باب محمدؐ سے گھٹنوں کے بل (حرم شریف کے) صحن میں داخل ہوئے۔ صحن میں آکر آنحضرت نے ہر طرف نظر دوڑائی اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ "واللہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً یہی مسجد داؤدؑ ہوگی جس کی نسبت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ شب معراج میں وہاں لے جایا گیا تھا۔" پھر حضرت عمرؓ حرم شریف کے سامنے یعنی (جنوب) کے رخ بڑھے اور پھر مغرب کی طرف گئے اور فرمایا کہ آؤ اسے مسجد کی جگہ بنالیں؎

ملہ: اس بیان سے اور حضرت عمر کے حرم بیت المقدس میں بطریق شہر کے ساتھ پہلی مرتبہ آنے کی دوسری روایات سے، بائزنطی مورخ تھیوفانس کی تحریر کا مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس نے آٹھویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب "کرونوگریفیا" لکھی (ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۱۱۰) گویا صاحب متیر سے جو ہمارے لیئے اسلامی روایات کا تنہا ماخذ ہے، وہ پانچ سو سال سے بھی زیادہ متقدم تھا۔ اصل یونانی عبارت، جس کا یہاں ترجمہ نقل کیا جاتا ہے، کرونوگریفیا کے نسخہ مطبوعہ بون (۱۸۳۹ء) کی جلد اول صفحہ ۵۱۹ میں ملے گی۔ تھیوفانس لکھتا ہے:-

باب چہارم

"الولید ابن مسلم کی روایت سے خبر دی شداد ابن اوس کی اولاد میں سے ایک شیخ نے جس نے اسے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے باپ سے سنا تھا کہ جس وقت امیر المومنین حضرت عمرؓ نے معاہدہ فتح لکھنے سے فرصت پائی جو ان کے اور بیت المقدس والوں کے درمیان ہوا تھا، تو وہ بطریق یروشلم کی طرف مخاطب ہوئے کہ ہمیں مسجد داؤدؑ کو لے چلو، بطریق نے تعمیل کی۔ تب حضرت عمرؓ تلوار باندھے ہوئے آگے چلے اور چار ہزار صحابیؓ جو آپ کے ساتھ بیت المقدس تشریف لائے ہمراہ تھے اور وہ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے اور ایک گروہ ہم عربوں کا تھا جو بیت المقدس تک آیا تھا اور وہ بھی پیچھے پیچھے ہولیا اور کسی کے پاس سوائے تلوار کے کوئی ہتیار نہ تھا اور بطریق حضرت عمرؓ کے جو صحابہ کے جھرمٹ میں تھے آگے آگے چل رہا تھا اور ہم امیر المومنین کے عقب میں تھے۔ اس طرح ہم مقدس شہر میں داخل ہوئے اور بطریق ہمیں اس گرجا میں لایا جو کمامہؔ[1] کے نام سے مشہور ہے اور کہا کہ "یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- "سنہ آفرینش ۶۱۲۷ سنہ میلادی ۶۲۷۔ اس سال عمرؓ نے فلسطین پر فوج کشی کی اور شہر مقدس کو (عرب فوجوں نے) ہوشیاری سے دو سال تک گھیرے رکھا تا آنکہ شہر والوں نے اطاعت قبول کی اور وہ عمرؓ کے قبضے میں آگیا۔ سوفرونیوس رئیس (یا بطریق) یروشلم نے عمرؓ سے ایک عہد نامہ تحریر کرایا جو تمام فلسطین کے باشندوں کے واسطے تھا اور اس کے بعد عمرؓ شہر مقدس میں اس طرح داخل ہوا کہ اونٹ کے اون کا میلا کچیلا پھٹا ہوا لباس پہنے ہوئے تھا...... اس نے وہاں لے چلنے کی فرمائش کی جہاں پہلے ہیکل سلیمانؑ واقع تھی اور اسے بلا تامل کفر و عصیان* کی خطبہ گاہ بنا لیا۔ جس وقت سوفرونیوس نے یہ دیکھا تو چلایا کہ "واقعی بربادی کی ناپاکی جس کا دانیالؑ پیغمبر نے ذکر کیا ہے اور وہ اب مقدس مقام پر جلوہ گر ہے" اور (یہ کہہ کے "بطریق") بہت رویا"۔

[1] "الکمامہ" کے لغوی معنی بھوسے یا کوڑے کے ہیں۔ اصل عربی نام جو عرب نصاریٰ میں مروج تھا "القیامہ" (یعنی نشاۃ الثانیہ) ہے مگر مسلمانوں نے اسے جان کر بگاڑ لیا تھا۔

* مصنف نے "اسلام اور تقویٰ" کے لیے اپنے عقیدے کے موافق یہ الفاظ استعمال کیے ہیں (مترجم اردو)

مسجد داوؑد ہے" حضرت عمرؓ نے چاروں طرف دیکھا، تھوڑی دیر غور فرمایا اور پھر بطریق سے کہا "تو غلط کہتا ہے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے مسجد داؤدؑ کی کیفیت بیان فرمائی تھی اور اس بیان کے مطابق یہ جگہ وہ نہیں ہے" پھر بطریق اور آگے چلا اور کلیسائے صیہون میں ہمیں لایا اور پھر وہی بات کہی کہ "یہ مسجد داؤدؑ ہے" مگر خلیفہ نے دوبارہ فرمایا کہ "تو غلط کہتا ہے" اور بطریق پھر چلا اور حرم شریف کے دروازے تک جو (بعد میں) باب محمدؐ کے نام سے مشرف ہوا ہمیں لے آیا۔ اب سنو کہ اس وقت گوبر تمام حرم محترم میں پھیلا ہوا تھا اور اس دروازے کی سیڑھیوں تک اس طرح آگیا تھا کہ نیچے راستے میں بھی بکھرا پڑا تھا اور اوپر سیڑھیوں پر تو اس قدر انبار تھا کہ ڈیوڑھی کی چھت تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ بطریق نے کہا "اس میں جانے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہے سوائے اس کے کہ گھٹنوں کے بل چل کے جائیں" حضرت عمرؓ نے فرمایا "گھٹنوں کے بل ہی سہی" پس بطریق گھٹنوں کے بل حضرت عمرؓ کے آگے آگے داخل ہوا اور ان کے پیچھے ہم سب اسی طرح جھکے ہوئے چلے یہاں تک کہ بطریق ہمیں بیت المقدس کے حرم شریف کے صحن میں لے آیا۔ اور وہاں ہم اٹھے اور سیدھے کھڑے ہوئے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ہر طرف نظر کی اور دیر تک غور فرما کے کہا "والذی نفسی بیدہٖ، یہی وہ جگہ ہے جس کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمائی" (سیوطی، ۲۷۶ مجیر الدین ۲۲۶)

"اور ہو خبر الذکر، یعنی ہشام ابن عمر کی سند پر، جس نے الہیثم ابن عمر ابن عباس سے اسے سنا اور اس نے اپنے دادا عبد اللہ ابن ابو عبد اللہ سے سنا، روایت پہنچی ہے کہ کس طرح جب حضرت عمرؓ خلیفہ تھے وہ شام کے لوگوں سے ملنے آئے۔ آنحضرتؓ پہلے الجابیہ نام گانوں میں ٹھہرے اور

عہ :- یہ موضع جولان کے علاقے میں واقع ہے ؎

وہاں سے قبیلہ جدیلہ کے ایک شخص کو بیت المقدس بھیجا۔ پھر تھوڑی مدت کے بعد ہی شہر والوں نے اطاعت قبول کی اور بیت المقدس پر حضرت عمرؓ کا قبضہ ہوا اور امیر المومنین اُدھر روانہ ہوئے اور کعب[1] ان کے ساتھ تھے۔ حضرت عمرؓ نے کعب سے پوچھا "اے ابو اسحٰق، تجھے چٹان کا مقام معلوم ہے؟" کعب نے کہا "اس دیوار سے جو وادی جہنم کی طرف ہے، اتنے اتنے درع پیمائش کرو اور پھر کھودو تو تم کو وہ جگہ مل جائے گی" پھر کہا "آج کل وہاں کوڑی کا انبار ہے" پھر لوگوں نے اسی کے مطابق کھودا تو چٹان نکل آئی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم کیا کہتے ہو، مسجد یا قبلہ کس جگہ رکھا جائے؟ کعب نے جواب دیا "اس کے واسطے چٹان کے عقب میں جگہ رکھو جس سے دو قبلے ہو جائیں گے یعنی ایک قبلہ موسیٰؑ اور دوسرا قبلہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا" لیکن امیر المومنین نے ان سے کہا "اے ابو اسحٰق ابھی تک تمہارا میلان یہودیوں کی طرف ہے۔ مسجد چٹان کے (عقب میں نہیں) سامنے رہے گی" اس طرح مسجد احاطہ حرم کے اگلے حصے میں تعمیر کی گئی ہے۔

الولید نے کلثوم ابن زیاد کی سند سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب سے دریافت کیا کہ "تمہارے نزدیک اس حرم شریف میں ہم مسلمانوں کی نماز کی جگہ کہاں رکھیں؟" کعب نے جواب دیا "پچھلے (یا شمالی)

[1]:- ایک اور فصل میں صاحب مثیر لکھتا ہے کہ وہ کعب الاحبار یا الحبر، جن کی کنیت ابو اسحٰق ابن ماتی (الحمیری) تھی، اصلاً یہودی تھے اور حضرت ابو بکرؓ یا بعض لوگوں کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ وہ حدیث کے مشہور راوی اور علم و فضل میں ممتاز ہیں۔ حمص میں ۳۲ھ (۶۵۲ء) میں انتقال کیا" حقیقت یہ ہے کہ کعب اپنے دوسرے ہم کیش وہب ابن منبہ کی مثل کہ وہ بھی اسی طرح مشہور یہودی تھے جو مسلمان ہوئے اور یہ دونوں قرن اول کے مسلمانوں میں قدیم تاریخ کے متعلق مستند مانے جاتے تھے، آگے چل کر معلوم ہوا کہ بہت غلط بیان شخص ہیں اور پہلی صدی ہجری کے سادہ لوح عربوں کو خوب بناتے رہے" (یہ سچ ہے کہ محدثین اسلامی نے کعب (تابعی) کی اسرائیلیات کو معتبر نہیں مانا۔ مترجم اردو)

باب چہارم

حصے میں جو باب قبائل سے ملا ہوا ہے" لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حرم کا سامنے کا رُخ ہمارے حصے میں آیا ہے" اور پھر حضرت عمرؓ اگلے حصے کی طرف بڑھے۔ الولید ہی ابن شداد کی سند سے روایت کرتا ہے جس نے اسے اپنے باپ سے سنا تھا کہ حضرت عمرؓ حرم شریف کے اگلے حصے کی طرف بڑھے جو مغرب سے، (یعنی جنوب مغرب سے) ملا ہوا ہے' اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کوڑی کو اٹھا اٹھا کے دامن میں بھرنا شروع کیا اور ہم سب نے جو ان کے ساتھ تھے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کو لیے ہوئے روانہ ہوئے اور ہم بھی ان کی اتباع میں پیچھے پیچھے تھے' اور کوڑے کو وادی میں پھینک دیا جو وادی جہنم کہلاتی ہے۔ پھر ہم کوڑا اٹھانے کے لئے واپس آئے اور اسی طرح حضرت عمرؓ اور ہم جو ان کے ساتھ تھے' برابر کوڑا اٹھا اٹھا کے پھینکتے رہے یہاں تک کہ اس مقام کو جہاں اب مسجد قائم ہے' پوری طرح صاف کردیا۔ اور وہاں ہم نے نماز ادا کی اور حضرت عمرؓ نے ہمارے درمیان نماز ادا فرمائی ۔

ان روایتوں کو دوسری طرح بھی بیان کیا گیا ہے مگر ہر بات میں بجز اپنی مفروضہ اسناد کے' ان کے الفاظ تک یکساں ہیں۔ (دیکھو سیوطی ۲۲' منقولہ مجیرالدین ۲۲۵) مگر ذیل کی روایت مثیر میں نہیں ہے بلکہ صرف سیوطی نے لکھی ہے اور اس اعتبار سے پڑھنے کے قابل ہے کہ اس میں اس کنیسہ مریمؑ کا ذکر آیا ہے جو ممکن ہے کہ پروکوپوس کا بیان کردہ کلیسائے دوشیزہ ہو۔

"الغرض جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو بذریعہ عہد و پیمان اہل شہر سے لیا اور ان کے ساتھ داخل ہوئے تو اس وقت وہ دو لمبے کرتے اس کپڑے کے پہنے ہوئے تھے جسے سنبلانی کہتے ہیں۔ پھر انھوں نے کنیسہ مریمؑ میں نماز پڑھی اور پڑھنے کے بعد ایک کرتے پر تھوک دیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ "کیا آپ اس لئے تھوکتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں شرک کا

گناہ ہوا ہے؟" تو آپ نے جواب دیا "ہاں، بے شبہ یہاں شرک کا گناہ کیا گیا ہے۔ لیکن تحقیق اب اللہ سبحانہ کا یہاں نام پڑھا گیا" یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے وادی جہنم کے قریب نماز پڑھنے سے خاص طور پر احتراز فرمایا" (سیوطی - ۳۴)

عبد الملک اور قبۃ الصخرہ (مثیر، باب ششم[1])

وہ خلیفہ عبد الملک تھا جس نے بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ تعمیر کی۔ اور روایت کے بموجب ان عمارات کے مصارف کے لئے اس نے سات سال تک مصر کی مالگزاری وقف کر دی۔ مورخ سبط الجوزی اپنی کتاب "مراۃ الزمان" میں بیان کرتا ہے کہ عبد الملک نے یہ تعمیر سنہ ۶۹ ہجری میں شروع کی اور سنہ ۷۲ میں (= ۶۸۸ء تا ۶۹۱ء) اتمام کو پہنچی۔ لیکن ایک اور قول یہ ہے کہ اول جس نے بیت المقدس کا گنبد بنایا، وہ خلیفہ عبد الملک کا بیٹا سعید تھا اور اسی نے بعد میں اس کی مرمت کی[2]۔ لیکن رجا ابن حیاہ اور عبد الملک کے مولیٰ یزید ابن سلام[3] کی سند سے روایت کی گئی ہے کہ بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے وقت خود خلیفہ دمشق سے یروشلم آیا اور وہاں سے ہر ولایت اور شہر کے حاکم کو اس مضمون کے خط لکھے کہ "عبد الملک کی خواہش ہے کہ بیت المقدس میں چٹان کے اوپر ایک گنبد بنائے جس کے نیچے مسلمان دھوپ اور بارش سے پناہ لے سکیں اور ایک مسجد بھی تعمیر کرے۔ لیکن وہ اپنے لوگوں کی مرضی کے بغیر اس کام کو کرنا نہیں چاہتا۔ پس مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی منشا اور

---

[1]: منقول سیوطی، - ۲۸ -

[2]: - پہلے ماخذوں میں سے کسی میں یہ قول نہیں پایا جاتا ہے

[3]: - ابو المقدام رجا ابن حیاہ ابن جرول، کندی علم و فضل میں مشہور اور آخر زمانے میں خلیفہ عمرؓ ابن عبد العزیز کا خاص دوست تھا۔ اس کا ساتھی یزید ابن سلام یروشلم کا باشندہ تھا۔ آیندہ عبارت کو مجیر الدین نے بھی نقل کیا ہے :- متن قاہرہ، ص ۲۴۱ و ۲۴۲ ج

باب چہارم

جو کچھ ان کی خواہش ہے، تحریر کریں" والیوں کے پاس سے جواب میں خطوط آئے جن میں امیر المومنین کو سب لوگوں کی کامل رضامندی کا یقین دلایا تھا اور یہ کہ امیر کا منشا نہایت مناسب اور متقیانہ ہے اور انھوں نے لکھا تھا کہ "ہم دعا کرتے ہیں کہ خلیفہ نے حرم شریف میں گنبد و مسجد بنانے کا جو تہیہ کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ تکمیل کو پہنچائے اور اس کے ہاتھوں سے یہ کام جو اس کے اور اس کے اخلاف دونوں کے لیئے موجب شرف ہوگا، بخیر و خوبی اتمام کو پہنچے" تب خلیفہ نے اپنی سلطنت کے اقطاع و اکناف سے کاریگر جمع کئے اور حکم دیا کہ گنبد کی تعمیر شروع کرنے سے قبل عمارت کی کرسی اور اطراف تیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے حرم شریف کے صحن میں اس کا نقشہ بنایا اور خلیفہ نے حکم دیا کہ چٹان کے مشرق کی طرف ایک بیت المال تیار کیا جائے اور یہی عمارت اب چٹان کے قریب موجود ہے[1]۔ غرض تعمیر شروع ہوئی۔ خلیفہ نے زر کثیر اس کام کے لیئے علحدہ کر دیا اور رجا ابن حیاہ اور یزید ابن سلام کو مہتمم مقرر کیا اور اختیارات عطا کئے۔ انہی نے بنیادیں کھودنے اور اوپر کی عمارت بنوانے پر روپیہ خرچ کیا، یہاں تک کہ جو روپیہ تھا اس کی زیادہ مقدار خرچ ہو گئی جب وقت پوری عمارت تیار و استوار ہو چکی اور اس میں حرف رکھنے کی کہیں گنجائش باقی نہ رہی تو ان لوگوں نے خلیفہ کی خدمت میں دمشق عریضہ بھیجا کہ "اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ گنبد جسے بیت المقدس میں چٹان کے اوپر بنانے کا امیر المومنین نے حکم دیا تھا، نیز مسجد اقصیٰ کی تعمیر تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور اس سے بہتر و زیبا تر بنانے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی امیر المومنین کی طرف سے جو روپیہ اس کام کے واسطے علحدہ رکھا گیا تھا، اس میں سے عمارت کی تکمیل و استحکام کے بعد ایک لاکھ دینار سرخ باقی رہ گئے ہیں اب امیر المومنین کو اختیار ہے کہ اس ما بقی رقم کو جہاں چاہیں خرچ میں لائیں" اور خلیفہ نے جواب میں لکھا کہ اس صورت میں

[1]: جو آج کل قبۃ السلسلہ کہلاتا ہے۔ دیکھو صفحہ (۱۸۴)

مناسب ہے کہ اس معظم و محترم عمارت کے بنانے میں جو کارِ نمایاں تم نے کیا ہے اس کے صلے میں یہ باقی روپیہ تم دونوں بطور انعام اپنے کام میں لے آؤ" مگر اس کے جواب میں رجا اور یزید نے تحریر کیا کہ "نہیں، اے خلیفہ ہمیں تو چاہئے کہ اپنی بیویوں کے زیور اور ضرورت سے زیادہ جو کچھ دولت ہمارے پاس ہو، وہ بھی اس روپیہ میں شامل کر دیں اور پھر امیر المومنین اس کل روپیہ کو جس کام میں مناسب سمجھیں، خرچ کریں" تب خلیفہ نے حکم بھیجا کہ سونے کا سکہ پگھلا کر اسے گنبد کی تزئین میں لگا دیا جائے۔ چنانچہ اسے پگھلا دیا اور قبۃ الصخرہ کی تزئین میں اس افراط سے خرچ کیا کہ سونے کی جوت سے دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹھہر سکتی تھی۔ جانوروں کی اُون اور کھالوں کے دو غلاف بھی تیار کرائے گئے کہ سردی کے موسم میں گنبد کو بارش برف اور آندھی سے محفوظ رکھنے کے لیے چڑھا دئے جائیں۔ رجا اور یزید ابن سلام نے ساسم یعنی آبنوس کی ایک جالی بھی چٹان کے گرد بنوادی اور باہر کے رخ ستونوں کے درمیان زری کے پردے بنوا کے لٹکا دئے۔ روزانہ باون آدمی زعفران کوٹنے اور پیسنے پر مقرر تھے اور رات کو بھی کام کرتے رہتے تھے اور اس میں مشک و عنبر، گلاب اور گل جوڑی کا پانی ملاتے جاتے تھے۔ علی الصباح جو نوکر مقرر تھے وہ سلیمان ابن عبدالملک کے حمام میں داخل ہوتے اور جس حجرے (بیت المال)[۱] میں زعفران (= خلوق) رکھی تھی اس میں جانے سے پہلے اچھی طرح نہا دھو لیتے تھے، پھر حجرے سے باہر نکلتے تو کپڑے بدل کر مرو و ہرات کے کپڑے کی پوشاک اور بردیمانی جسے عصب کہتے ہیں، زیب تن ہوتی اور مرصع پٹیاں کمر میں بندھی ہوتی تھیں۔ پھر خلوق کے

---

[۱] سیوطی کے قلمی نسخے میں "حمام سلیمان" کا لفظ تحریر ہے گویا یہ حمام حضرت سلیمانؑ کا تھا لیکن کسی دوسری جگہ مجھے ایسے حمام کا ذکر نہیں ملا۔ اور مثیر کی سند پر میں نے اسے خلیفہ عبدالملک کے بیٹے سلیمان سے منسوب کیا۔ گل جوری سے جور یا گور کا گلاب مراد ہے، جو ایران کا شہر تھا اور بعد میں فیروز آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں کے گلاب اس قدر مشہور تھے کہ اس کا

مرتبان ہاتھوں میں لیے ہوئے چلتے اور چٹان پر اس کی مالش کرتے اور جہاں تک ہاتھ پہنچتا، اس خوشبو کو پھیلا دیتے تھے۔ اس کے آگے پاؤں دھو کر خود چٹان کے اوپر چڑھتے اور جو حصے باقی رہتے ان پر مالش کر دیتے یہاں تک کہ خلوق کے مرتبان بالکل خالی ہو جاتے۔ پھر سونے چاندی کے مجمروں میں قمار(ملک جاوا کا عود) اور وہ خوشبو جسے ند کہتے ہیں، مشک و عنبر کے ساتھ کوٹ کر سلگائی جاتی۔ پردے گرا کر مجمروں کو ادھر اُدھر جھلاتے رہتے تھے کہ بخورات گنبد کے اوپر تک تمام ہوا میں پھیل جائیں کیونکہ وہ مقدار کثیر میں استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ ہو چکتا تو پھر پردے باندھ دیئے جاتے اور مجمروں کو گنبد کے باہر لے آتے تھے جس کے باعث یہ لطیف خوشبو پھیل پھیل کر حرم کے باہر منڈی تک پہنچتی کہ آئندہ و روندہ کے دماغ معطر ہو جاتے۔ پھر مجمروں کو بجھا دیا جاتا اور جالی کے آگے کے نقیب پکار دیتے کہ "تحقیق، صخرہ شریف لوگوں کیواسطے کھل گیا ہے جو نماز پڑھنا چاہے، وہ اندر آ جائے۔ لوگ جلدی جلدی اندر داخل ہوتے اور اکثر دو رکعتیں اور بعض چار چار رکعتیں ادا کرتے تھے۔ ادائے نماز کے بعد لوگ باہر نکلتے تو دوست احباب خوشبو ہی سے سمجھ جاتے اور کہتے کہ فلاں شخص صخرے میں گیا تھا؛ نماز کا وقت ختم ہونے کے بعد خدام، لوگوں کے قدموں کے نشانات کو پانی سے دھو ڈالتے اور ہر جگہ سے بہ احتیاط ہری مہندی کی جھاڑو دے کر کپڑے سے فرش پوچھ دیتے تھے اس کے بعد دروازے بند کر دیئے جاتے اور ہر دروازے کی نگہبانی کیلئے دس دس حاجب مقرر تھے کہ سوائے خدام کے، دوشنبہ اور جمعہ کے دن کے علاوہ کسی کو صخرہ میں داخل نہ ہونے دیں"؛

ابو بکر ابن الحارث کی سند سے روایت کی گئی ہے کہ عبدالملک کی خلافت کے زمانے میں قبۃ الصخرہ کے اندر کلیۃً روغن مدین بان (=چھیان) اور چنبیلی کا تیل جلایا جاتا تھا جس کا رنگ سیسے کا سا ہوتا اور ابو بکر کہتا ہے کہ

یقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ عرف ہی "بلد الورد" پڑ گیا تھا؛ (ملاحظہ ہو یاقوت، دوم، ۱۴۸)

اس کی خوشبو ایسی اچھی ہوتی تھی کہ اکثر حاجب کہا کرتے تھے کہ "اے ابو بجرہ ذرا چراغ ہمیں دینا کہ ہم یہ تیل اپنے اور اپنے کپڑوں پر ڈال لیں" اور ابو بجر ان کی خوشی کرنے کی غرض سے اس کی تعمیل کر دیا کرتا تھا۔ "یہ خلافت عبد الملک کے واقعات ہیں"۔

اس کے علاوہ الولید کہتا ہے کہ مجھ سے روایت کی عبد الرحمن ابن منصور ابن ثابت نے، جس نے بیان کیا کہ اس نے سنا اپنے باپ سے اور اس نے سنا اپنے باپ سے اور اس نے سنا اپنے دادا سے کہ قبۃ الصخرہ کے وسط میں جو زنجیر لٹکتی تھی اس میں عبد الملک کے زمانے میں ایک عدیم المثال موتی آویزاں تھا۔ حضرت ابراہیم ؑ کے مینڈھے کے دو سینگ اور کسریٰ کا تاج بھی لٹکا ہوا تھا۔ لیکن جب خلافت خاندان عباسیہ میں منتقل ہوئی تو یہ تمام نوادر کعبہ شریف میں (حرسہا اللہ تعالیٰ) منتقل کر دیئے گئے۔

ذیل کا بیان جو متیر کے ساتویں باب میں درج ہے، سیوطی اور مجیر الدین دونوں نے نقل کیا ہے (سیوطی - ۲۸۵ - مجیر الدین، ۲۴۸) آئندہ اوراق میں بھی اسی قسم کا ایک بیان ہماری نظر سے گزرے گا جسے ایک قدیم تر مصنف یعنی ابن الفقیہ نے تحریر کیا ہے۔

"حافظ ابن عساکر کی سند سے، جس کا سلسلہ رواۃ ابو المعالی المقدسی تک چلا گیا ہے، بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح عبد الملک نے گنبد صخرہ اور مسجد اقصیٰ تعمیر کی۔ مزید براں عقبیہ بیان کرتا ہے کہ اس زمانے میں چوبی ستونوں کو چھوڑ کر صرف چھت میں چھ ہزار شہتیر لگے ہوئے تھے اور دروازوں کی تعداد پچاس تھی۔ چھ سو ستون سنگ مرمر کے اور سات محرابیں تھیں اور پندرہ کم چار سو (=۳۸۵) زنجیریں جھاڑوں کے واسطے لٹکتی رہتی تھیں جن میں سے دو سو تیس مسجد اقصیٰ میں تھیں اور باقی ماندہ (یعنی ایک سو پچپن) گنبد صخرہ میں تھیں۔ ان تمام زنجیروں کی کل لمبائی ملا کر چار ہزار ورع ہوتی تھی اور مجموعی وزن تینتالیس ہزار رطل شامی کے مساوی تھا[1]۔

---

[1]: یعنی ۲۸ ہزار پونڈ انگریزی کے

باب چہارم

پانچ ہزار فانوس تھے اور ان کے ماسوی جمعوں کی راتوں اور ماہ رجب، شعبان کی وسطی راتوں نیز عیدین کی راتوں میں دو ہزار موم بتیاں اور بھی روشن کی جاتی تھیں۔ حرم شریف میں قبۃ الصخرہ کے علاوہ پندرہ (چھوٹے) گنبد اور بنے ہوئے ہیں اور مسجد کی چھت کے اوپر سیسے کی سات ہزار سات سو چادریں چڑھی ہوئی تھیں جن میں سے ہر چادر کا وزن ستر رطل شامی (= ۴۲۰ پونڈ) تھا۔ اس میں گنبد کے اوپر کی پوشش شامل نہیں ہے۔ یہ سب کام وہ ہیں جو عبد الملک کے زمانے میں ہوئے۔ اسی خلیفہ نے حرم محترم کی دائمی خدمت کے واسطے تین سو خدام مقرر کیے تھے جو غلام تھے کہ خزانے کی شاہی خمس کی رقم سے خریدے گئے اور جب ان میں کوئی مرتا تو اس کا بیٹا پوتا یا اور کوئی عزیز اس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ خدمات نسلاً بعد نسلٍ ہر زمانے میں جاری رہیں اور سرکاری خزانے سے ان کو تنخواہیں ملتی رہیں ؎

حرم شریف کے اندر پانی کے چوبیس بڑے حوض اور چار مینار ہیں۔ یعنی تین تو وہ جو حرم شریف کے جانب غرب ایک قطار میں بنے ہوئے ہیں اور ایک وہ جو باب الاسباط (یعنی قبائل کا دروازہ) کے اوپر بنایا ہے حرم شریف کے خادموں میں بعض یہودی بھی تھے جن سے کوئی جزیہ نہ لیا جاتا تھا۔ ابتدا میں یہ دس آدمی تھے مگر بعد میں اولاد بڑھی تو بیس ہو گئے ان کا کام یہ تھا کہ گرمی یا سردی میں زیارتوں کے وقت لوگوں کے پاؤں کی جو مٹی پڑی رہ جاتی، اسے صاف کر دیں اور مسجد اقصیٰ کے گرد جو مقامات وضو بنے ہوئے تھے انھیں صاف کرتے رہیں۔ حرم شریف میں دس مسیحی خادم بھی تھے اور ان کی خدمات بھی اسی طرح موروثی تھیں۔ یہ مسجد کی چٹائیاں تیار کرتے اور ان کی صفائی کرتے رہتے۔ پانی کے خزانوں کی جہاں سے حوضوں میں پانی آتا اور خود ان حوضوں کی صفائی اور اسی قسم کے دوسرے کام بھی ان سے متعلق تھے۔ چند یہودیوں کے سپرد شیشے کے برتن، استوانے، فانوس اور روشنی کی ہنڈیاں بنانے کی خدمت تھی۔ ان لوگوں سے بھی کوئی جزیہ نہ لیا جاتا نہ ان سے جو فانوسوں کی بتیاں بناتے تھے۔ یہ معافی ان کے اور ان کی

اولاد کے حق میں جو ان کی جانشین ہوئے ہمیشہ سے، یعنی خود عبدالملک کے وقت سے لے کے دائماً برابر جاری رہی۔

ابو عمیر ابن وہرو کے حوالے سے جس نے اپنے باپ سے روایت کی، الولید نے یہ بھی لکھا ہے کہ شروع میں فانوس روشن کرنے کی خدمت پر یہودی مقرر تھے لیکن خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کا دور آیا تو اس نے انھیں اس کام سے علیحدہ کر دیا اور ان کی بجائے شاہی خمس سے خریدے ہوئے خدام مقرر کیے۔ انہی میں سے ایک زرخرید غلام ایک مرتبہ اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "اے خلیفہ مجھے آزادی دے" لیکن عمرؓ نے جواب دیا کہ "میں تجھے آزادی کیونکر دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر تو اپنی مرضی سے چل دے تو مجھے تیرے کتے کے بالوں میں سے ایک بال بیکا کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے"۔ع۱

یہ روایتی یا موضوع بیانات ہیں جن میں سے اکثر غالباً چودھویں صدی میں گھڑے گئے تھے اور جن میں حضرت عمرؓ کی فتح اور عبدالملک کے ساتویں صدی عیسوی میں عمارتیں بنانے کے قصے مذکور ہیں۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ ان پر کس حد تک اعتبار کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض صحیح واقعات پر مبنی ہیں لیکن ان روایات کی صورت ہی کہے دیتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ گھڑا ہوا ہے۔

بہر حال، انھیں چھوڑ کر ہمیں اب قدیم تر وقائع اور جغرافیہ نویسوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کے اقوال زیادہ اعتبار کے مستحق اور جن کی اسناد آسانی سے معلوم و متحقق ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اب ہم اسی سلسلہ مضمون کو دوبارہ شروع کرتے ہیں جس میں حرم شریف کا بیان تھا اور مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے علاوہ اس احاطے کی دوسری عمارتوں کی نسبت قدیم بیانات

ع۱:- مجیر الدین نے اس روایت کو نقل کیا ہے مگر کتے کے بالوں کی بجائے "تیرے جسم کا ایک بال" لکھا ہے۔ (حصہ ۲)۔

کو نقل کرتے ہیں۔

قُبّۃ السلسلہ

قبۃ الصخرہ سے چند قدم مشرق میں ایک چھوٹا سا گنبد صرف ستونوں پر قائم ہے اور نیچے کوئی دیوار گھری ہوئی نہیں ہے۔ بجز قبلہ رو (یعنی جانب جنوب) محراب کی دیوار کے جیسے دو ستونوں کے درمیان کی جگہ بند کر کے تیار کر دیا ہے اسے "قبۃ السلسلہ" یا "زنجیر کا گنبد" کہتے ہیں۔ بہت پہلے یعنی ۹۱۳ء میں ابن عبد ربہ نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ وہ گنبد ہے جس میں نبی اسرائیل کے زمانے میں وہ زنجیر لٹکتی رہتی تھی جو ان کے مابین کذب و صدق کا فیصلہ کرتی تھی" (صفحہ ۳۶۸)

عام طور پر جو روایت سب سے زیادہ مقبول ہے اس کی رو سے داؤد علیہ السلام کو حضرت جبرئیل نے زنجیر نہیں بلکہ لوہے کا ایک لٹھا دیا تھا کہ عدالت گاہ کے ایک طرف سے دوسری طرف لگا کر اس پر گھنٹا لٹکا دیا جائے جس وقت اس کو مدعی اور مدعا علیہ باری باری سے ہاتھ لگاتے تو جو سچا ہوتا اس کے ہاتھ لگانے پر گھنٹا بجنے لگتا تھا[1] لیکن عرب جغرافیہ نویس بلا اختلاف زنجیر ہی لکھتے ہیں اور یاقوت نے اس گنبد کے بیان میں تخصیص کے ساتھ لکھا ہے کہ یہی جگہ تھی "جس میں زنجیر لٹکتی تھی جو صرف سچ بولنے والے کے ہاتھ میں آسکتی تھی اور جھوٹی گواہی لانے والا اسے مس نہ کر سکتا تھا جب تک کہ فریب سے باز نہ آئے اور گناہ سے توبہ نہ کرے" (یاقوت چہارم - ۵۹۳)

ابن عبد ربہ کے ہمعصر ابن الفقیہ نے بھی قبۃ السلسلہ کا ذکر کیا ہے اور اپنے زمانے میں اس کا بیس سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم اور چھت

---

[1] :- دیکھو دیل و بلیش ..... مسلمانز" ص ۲۱۵

نقشہ حرم بیت المقدس

ناصر خسرو کے زمانے میں (۱۰۴۷ء)
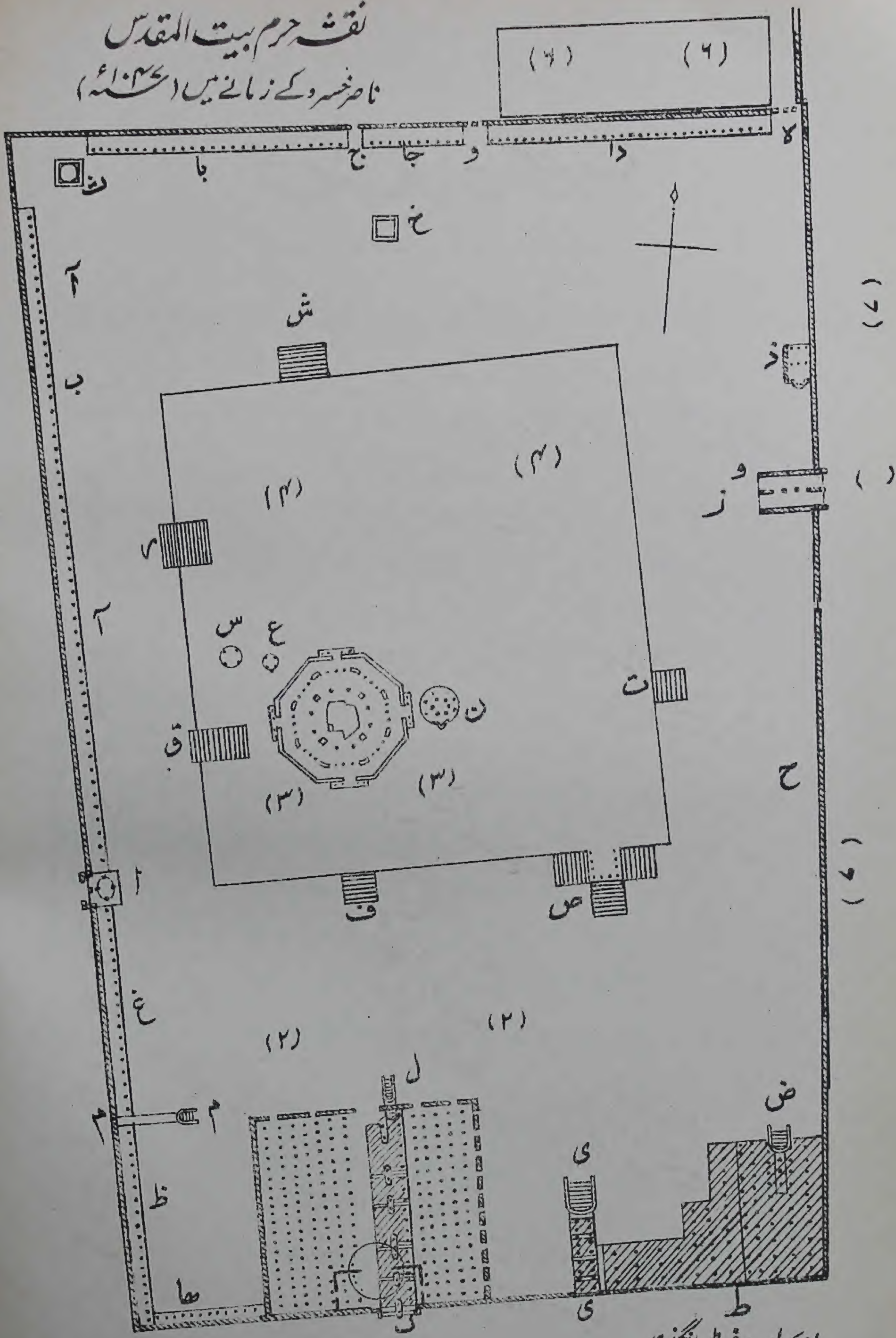
پیمانہ بحساب فیٹ انگریزی

تشریحات علامات نقشۂ حرم

ا	باب داؤدؑ
ب	بابُ السّقر
ج	دروازہ جس سے زاویہ صوفیہ میں داخل ہوتے ہیں۔
د	باب الاسباط
ﮦ	باب الابواب
و	باب التوبہ
ز	باب الرحمۃ
ح	قدیم باب البراق یا باب الجنائز
ط	باب الواحد (ان میں سے ایک باب العین ہے)
ی	باب الثلاث (ان میں سے ایک باب العین ہے)
ک	باب النبیؐ
ل	زمین دوز راستے کا زینہ
م	باب حِطّہ
ن	قبّۃ السلسلہ
س	قبّۃ الرسولؐ
ع	قبّۃ الجبرئیلؑ
ف	زینہ خانہ جسے مقام النبیؐ کہتے ہیں۔
ص	مقام محمدی کہتے ہیں۔
ق	مغربی زینے
ر	مغربی زینے
ش	شمالی زینہ یا مقام شامی
ت	مشرقی زینہ یا مقام شرقی

ث .... منبر زکریا علیہ السلام

خ .... قبلۃ یعقوب ؑ

ذ .... چھوٹی مسجد جو پہلے ایوان تھی

ض .... مسجد مہد مسیح کی سیڑھیاں

ظ .... مغربی دیوار کے ساتھ کا

غ .... محراب دار دالان

(۱ ....

(۲ ....

(۳ .... شمالی دیوار کے ساتھ کا دالان

(۴ ....

(۵ ....

(۶ .... جنوبی دیوار کے ساتھ کا ۲۴ محرابوں کا دالان جسکا سلسلہ مغربی دالان سے مل جاتا ہے ؛

پر جست کی چادروں کا " چڑھا ہونا بتایا ہے۔ (ص ۱۰۱) مقدسی کے زمانے میں بھی اس کی نسبت یہی لکھا ہے کہ "محض ایک چھتری ہے جس کے نیچے دیواریں نہیں بلکہ صرف ستونوں پر قائم ہے" (مقدسی ۱۶۹) ‏۔

ایسی کمزور عمارت کا ان زلزلوں سے برابر نقصان اٹھاتے رہنا یقینی تھا، جن کی نسبت تحریر ہے کہ حرم شریف کی اکثر عمارتیں بار بار انھوں نے گرائیں اور یہی وجہ ہے کہ ستونوں کی تعداد کے بارے میں مختلف زمانے کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آج کل اندرونی حلقے میں صرف ۶ کھمبے چھتری کو اٹھائے ہوئے ہیں اور بیرونی حلقے میں گیارہ ستون ہیں جن میں سے دو کو درمیان میں دیوار بنا کے محراب قبلہ نکالی ہے۔ اس طرح ستونوں کی کل تعداد سترہ ہے (ملاحظہ ہو نقشۂ مقابل صفحہ ۱۳۸)

ایرانی سیّاح ناصر خسرو نے اپنے زمانہ سیاحت یعنی ۱۰۴۷ء میں اس عمارت کی کیفیت اس طرح لکھی ہے:-

"قبۃ الصخرہ کے علاوہ (چبوترے پر) وہ گنبد بھی ہے جسے قبۃ السلسلہ کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ یا زنجیر وہ ہے جسے حضرت داؤد علیہ السلام نے لٹکایا تھا اور اس کا حال یہ تھا جو سچ نہ بولتا اس کی گرفت میں یہ زنجیر نہیں آ سکتی تھی۔ ظالم اور شریر آدمی اس پر ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا اور یہ واقعہ مستند ہے جس سے اہل علم بخوبی آگاہ ہیں۔ یہ گنبد سنگ مرمر کے آٹھ ستونوں اور چھ سنگی پایوں پر قائم ہے۔ سوائے سمت قبلہ کے جہاں دیوار جن کے خوبصورت محراب بنا دی ہے اور ہر طرف سے ستون کھلے ہوئے ہیں" (ناصر خسرو ۴۸) ‏۔

ادریسی ۱۱۵۴ء میں غالباً مسیحی بیانات کی بنا پر اور اس وقت جبکہ بیت المقدس صلیبیوں کے قبضہ میں تھا، قبۃ السلسلہ کے متعلق لکھتا ہے کہ "کلیسائے حضیرۃ القدس یہی ہے" (دیکھو گزشتہ باب صفحہ ۱۵۹) کتاب "سیتے ڈزرد سلم" ۱۱۲۵ء کے قریب تصنیف ہوئی ہے اس کے

باب چہارم

مصنف کا قول ہے کہ میرے زمانے میں یہ عمارت "کنیسائی سینٹ جیمس خورد" کہلاتی تھی کیونکہ یہ ولی جنھیں یہود نے ہیکل کے اوپر سے پھینک دیا تھا اسی مقام پر شہید ہوئے [۱]۔ صلاح الدینؒ نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد ضرور اس گنبد کو دوبارہ مسلمانوں کی خطبہ گاہ بنا دیا ہوگا جیسا کہ وہ پہلے کام دیتا تھا۔ مجیر الدین کا بیان ہے کہ قبۃ السلسلہ کو مصر کے سلطان بیبرس نے از سرِ نو بنوایا اور اس کا عہد حکومت سنہ ۱۲۶۰ء تا سنہ ۱۲۷۷ء ہے۔ (مجیر الدین ۴۳۴)

اکثر مقامات پر یہ بھی تحریر ہے کہ قبۃ السلسلہ شروع میں بطور نمونہ کے بنوایا گیا تھا جس کے مطابق بعد میں عبد الملک کے معماروں نے صخرہ کا عظیم الشان گنبد تعمیر کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجیر الدین (= سنہ ۱۴۹۶ء) سے پہلے کسی عرب مصنف نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا مجیر الدین زیادہ تر باتیں سیوطی سے نقل کرتا ہے اور سیوطی کی کتاب میں اس کے متعلق ایک لفظ بھی لکھا ہوا نہیں ہے لہٰذا یا تو یہ خیال کہ قبۃ السلسلہ بطور نمونہ بنوایا گیا تھا، جو مجیر الدین کا طبعزاد ہے یا اس زمانے کے اہل علم میں جو قصہ مروج تھا اس کو مصنف نے داخل کر دیا ہے۔ مجیر الدین کی اصل عبارت کا ترجمہ یہ ہے:۔

"کہتے ہیں خلیفہ عبد الملک نے اپنے معماروں کو تفصیل سے بتایا کہ (قبۂ صخرہ) کو وہ کیسا اور کس طرح تعمیر کرانا چاہتا ہے اور جب خلیفہ خود بیت المقدس آیا تو ان کاریگروں نے وہ چھوٹا گنبد بنایا جو قبۃ الصخرہ کے مشرق میں اب بھی موجود اور "قبۃ السلسلہ کہلاتا ہے"" اس عبارت سے چند سطر اوپر مجیر الدین یہ بھی لکھتا ہے کہ عبد الملک نے مصر کا ہفت سالہ خراج جو گنبد کی تعمیر کے لیے جمع کیا تھا "اس گنبد میں رکھوا دیا جو قبہ صخرہ کے مشرق میں بنا ہوا تھا اور جسے اس نے زیتون کے درخت کے قریب تعمیر کرایا تھا اسی کو ذخیرہ گاہ بنایا اور اس میں روپے بھر دادئے۔ (مجیر الدین

---

[۱] "پیلسٹائن پلگرمز ٹیکسٹ" ص ۱۳ ۔

۱۲۴۱) ہے
پھر مجیر الدین نے اپنے زمانے میں قبۃ السلسلہ کی کیفیت تحریر کی ہے
کہ "محراب کے دو ستون چھوڑ کر وہ سترہ ستونوں پر قائم تھا" (صفحہ ۳۷۲)
جیسا کہ ہم نے بیان کیا آج کل محراب کے ستون سمیت اس گنبد کے
سترہ ستون ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ ۱۴۹۶ء کے بعد اس میں ترمیم
و تبدیلی ہوئی ہے

چھوٹے گنبد

چٹان کے بڑے گنبد اور اسکے مشرق میں زنجیر کے گنبد کے سوا
اسی چبوترے پر کم سے کم دو خورد تر گنبد اور بھی ہمیشہ سے بنے ہوئے ہیں
اور حضور نبی کریم (علیہ التحیۃ والتسلیم) کے سفر معراج کے واقعات کی
یادگار رہیں۔ یہ عمارتیں ایسی کمزور بنی ہوئی تھیں کہ زلزلوں سے پیہم نقصان
اٹھاتی رہیں اسی لیے اگر مختلف زمانوں میں ان کے ناموں میں گڑبڑ پائی
جاتی ہے تو یہ کچھ حیرت کی بات نہیں ہے ہے
سنہ ۹۰۳ء میں ابن الفقیہ کی روایت کے مطابق چبوترے کے
شمالی حصے میں ۱۔ قبۃ النبیؐ ۲۔ (قبۃ) مقام جبرئیلؑ اور ۳۔ صخرہ کے
قریب قبۃ المعراج واقع ہیں" لیکن اسی کا ہمعصر ابن عبد ربہٗ ان کا اسطرح
بیان کرتا ہے:۔ "(۱) وہ گنبد جہاں سے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم)
آسمان پر تشریف لے گئے (۲) اس مقام کے اوپر کا گنبد جہاں حضورؐ نے
انبیائے پیشین کے ہمراہ نماز ادا فرمائی ۔۔۔۔ (۳) معبد جبرئیلؑ ہے اور
مقدسی (جس نے ۹۸۵ء میں کتاب لکھی) صرف دو چھوٹے گنبدوں کا ذکر
کرتا ہے یعنی "قبۃ المعراج اور قبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ناصر خسرو کے ۱۰۴۷ء
کے بیان کے بموجب اس کے وقت میں ان دو کا نام قبۃ النبی اور
قبۃ الجبرئیلؑ تھا ہے

ان مختلف بیانات سے بظاہر یہی اخذ ہوتا ہے کہ صخرہ کے شمال مغرب میں جو دو گنبد واقع تھے ان میں سے مغرب میں بعید تر قبۃ ابن الفقیہ کے زمانے میں قبۃ النبی کہلاتا تھا اور یہ وہی ہے جسے ابن عبد ربہ نے لکھا ہے کہ یہاں حضور صلعم نے نماز ادا فرمائی۔ اس کو مقدسی نے بھی قبۃ النبی لکھا ہے اور ناصر خسرو نے بھی اس کا اسی نام سے ذکر کیا ہے۔ جس مقام پر اس گنبد کا ہونا ان مصنفوں نے تحریر کیا ہے۔ وہاں آج کل جو گنبد موجود ہے وہ قبۃ المعراج کہلاتا ہے (ملاحظہ ہو نقشہ اس باب کے اخیر میں)

اس قبۃ المعراج اور صخرہ کے بڑے گنبد کے درمیان معلوم ہوتا ہے پہلے زمانے میں ایک دوسرا چھوٹا گنبد وہاں بنا ہوا تھا جہاں آج کل مقام یا قبۃ الجبرئیل واقع ہے (ملاحظہ ہو نقشہ، باب کے اخیر میں) لیکن بظاہر قدیم زمانے ہی سے ان چھوٹے گنبدوں کے ناموں میں ردو بدل ہوتا رہا۔ چنانچہ اس دوسرے گنبد کو ابن الفقیہ "(۴) قبۃ المعراج" کہتا ہے۔ ابن عبد ربہ "وہ گنبد جہاں سے حضور آسمان پر تشریف لے گیے" بتاتا ہے۔ مقدسی، قبۃ المعراج لکھتا ہے اور ناصر خسرو قبۂ جبرئیل کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مزید برآں ابن الفقیہ اور ابن عبد ربہ "مقام جبرئیل" کے نام سے ایک تیسرے گنبد کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا مقدسی اور ناصر خسرو کے ہاں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

ان دو چھوٹے گنبدوں کی جو صخرہ کے شمال مغرب میں واقع تھے جنگ صلیب سے پہلے کی اصلی کیفیت ۱۰۴۷ء میں صرف ناصر خسرو نے تحریر کی ہے۔ وہ قبۃ الصخرہ اور قبۃ السلسلہ کے حالات لکھنے کے بعد اسی سلسلے میں تحریر کرتا ہے:-

"پھر چبوترے ہی پر ایک اور گنبد ہے جو چار کھمبوں پر قائم ہے۔ اس میں کبھی قبلے کی طرف تیغہ دے کے نہایت خوبصورت محراب نکالی ہے اسے قبۂ جبرئیل کہتے ہیں۔ اس میں قالین بچھے ہوئے نہیں ہیں

کیونکہ فرش سنگ رخام کا بنایا ہے اور اسے تراش کر چکنا کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ معراج کی رات مرکب براق کو اس مقام پر باندھا گیا تھا تا آنکہ نبی کریم علیہ التحیٰوۃ والتسلیم سواری کے واسطے تیار ہوئے آخر میں ایک اور گنبد قبہ جبریئل سے کوئی بیس ہاتھ کے فاصلے پر واقع ہے جسے قبۃ الرسول ؐ کہتے ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم اسے بھی چار پیلپایوں پر تعمیر کیا ہے۔" (ناصر خسرو - ۴۹)

محاربین صلیبی کا جب بیت المقدس پر قبضہ ہوا تو یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے ان چھوٹے گنبدوں سے کیا کام لیا۔ لیکن سلطان صلاح الدین ؒ کے شہر کو دوبارہ فتح کرنے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ گنبد جسے قبۃ المعراج کہتے ہیں از سرِ نو تعمیر کیا گیا کہ وہ گر گر کھنڈر ہو گیا تھا۔ ۱۴۹۶ء میں مجیر الدین تحریر کرتا ہے کہ :-

"موجودہ قبۃ المعراج کو بیت المقدس کے والی عز الدین عثمان ابن علی الزنجلی نے ۵۹۷ھ (= ۱۲۰۰ء) میں دوبارہ تعمیر کیا کیونکہ پہلی عمارت ٹوٹ گئی تھی۔" (ص ۳۷۲) یہی تاریخ موجودہ قبہ کے ایک کتبے پر اب تک کندہ ہے۔

دوسری چھوٹے گنبد کی جسے پہلے قبۃ الرسول یا قبۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے تھے، ٹھیک جگہ کے متعلق بیت المقدس کے دوبارہ فتح ہونے کے بعد بظاہر مسلمان علما میں سخت اختلاف تھا۔ یاقوت (۱۲۲۵ء میں) اس کو قبۃ النبی داؤدؑ کے نام سے یاد کرتا ہے (یاقوت۔ چہارم (۵۹۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حضرت داؤدؑ کا نام مشہور ہونے کے باعث ہی غالباً سیوطی نے قبۃ الرسول کی شناخت کے متعلق حسب ذیل قیاس کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ قبۃ الرسولؑ کا تذکرہ قدیم اسلامی مصنفوں نے کیا ہے اور سیوطی صلیبیوں کے نکالے جانے کے بعد ۱۴۷۰ء میں اپنی کتاب لکھ رہا ہے۔ لیکن یاد رہنا چاہیے کہ سیوطی کا قبۃ السلسلہ کو قبۃ الرسول قیاس کرنا بعد کے مصنفوں میں مقبول نہیں ہوا۔ بہر حال سیوطی کا بیان یہ ہے :-

باب چہارم

"وہ گنبد جو قبۃ الرسولؐ کے نام سے موسوم ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہی صخرہ کے مشرق کی طرف والا گنبد ہے جسے قبۃ السلسلہ بھی کہتے ہیں۔ اسے خلیفہ عبدالملک نے بنوایا تھا۔ میرے اس قیاس کا سبب یہ ہے کہ حرم شریف میں قبۃ المعراج کے علاوہ صرف دو گنبد اور ہیں۔ ایک تو وہ خوردتر گنبد ہے جو صخرہ کے چبوترے کے کنارے پر اور ان سیڑھیوں کے دائیں جانب شمالی کونے پر واقع ہے[1]، جو مغرب کی طرف سے چبوترے پر لی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ گنبد آج کل حرم شریف کے بعض خدام کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کو اپنے کام میں لاتے ہیں۔ اس کو بیت المقدس میں کوئی شخص بھی قبۃ الرسولؐ کے نام سے نہیں جانتا۔ رہا دوسرا گنبد جو اس دروازے کے قریب شمالی جانب اندر کو ہٹا ہوا واقع ہے جسے باب الدوی دریہ یا باب شرف انبیاء کہتے ہیں، تو یہ گنبد سلیمان مشہور ہے۔ سلیمان سے یہاں پیغمبر سلیمانؑ مراد نہیں ہیں بلکہ غالباً خلیفہ عبدالملک کا بیٹا سلیمان۔ باقی رہا قبۃ المعراج تو سب جانتے ہیں کہ یہ صخرہ کے چبوترے پر واقع ہے اور کثرت سے زائرین یہاں آتے ہیں۔ اس طرح قیاس غالب یہی ہے کہ المشرف اور صاحب مستقصی اور باعث النفوس کے مصنف نے جس گنبد کا قبۃ الرسول کے نام سے ذکر کیا ہے، وہ یہی قبۃ السلسلہ ہے جسے خلیفہ عبدالملک نے بنوایا تھا۔"

رہا وہ مقام جہاں نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی، تو کہتے ہیں کہ یہ جگہ قبۃ المعراج کے باہر ہے جہاں صخرہ ہی کے چبوترے کے اوپر، ایک خوشنما گنبد بنا ہوا تھا۔ لیکن اس چبوترے کا جس وقت فرش بنوایا تو گنبد کو اڑا دیا اور اس کے بجائے ایک خوبصورت محراب بنا دی اور اس کے نیچے بھی سُرخ سنگ مرمر کے چوکوں کا، جیسی کہ صخرہ کے چبوترے پر جمائی تھیں، ایک گول فرش

[1] ۔ اسے آج کل قبۃ الخضرؑ کہتے ہیں ؏

تیار کر دیا غرض یہ جگہ جس پر محراب قائم ہے، روایت عام کی بموجب وہ مقام ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملائک و انبیاء علیہم السلام کیساتھ نماز پڑھی - پھر حضور صلعم نے ایک قدم آگے بڑھایا اور آپ کے آگے سونے چاندی کا زینہ نصب کر دیا گیا جس کے ذریعہ آپ آسمان پر چڑھے" (سیوطی - ۲۶۰، ۲۶۱ - آخری فقرہ مجیر الدین نے بھی نقل کیا ہے - صفحہ ۳۴۷) -

چبوترا اور سیڑھیاں

احاطۂ حرم شریف کے وسط میں وہ چبوترا ہے جس پر قبۃ الصخرہ اور دوسرے چھوٹے گنبد بنے ہوئے ہیں - ابن الفقیہ کے قول کے بموجب یہ چبوترا اس کے زمانے (۹۰۳ء) میں تین سو ہاتھ طویل ۱۴۰ ہاتھ عریض اور ۹ ہاتھ بلند تھا (ابن الفقیہ - ص ۱۰۰) اگر سرکاری پیمانے کے مطابق ہاتھ کی پیمائش ۱½ فیٹ سمجھی جائے، (جیسا کہ قبۃ الصخرہ کے عرض وطول کی قدیم پیمائشوں کا مقابلہ کرنے سے نکلتی ہے) تو مذکورۂ بالا طول و عرض ۴۵۰ × ۲۱۰ فیٹ ہوا جو آج کل کی پیمائش سے بہت کم ہے کیونکہ اسوقت چبوترے کا طول ۵۴۰ اور عرض ۴۶۵ فیٹ ہے ۔ ۱۰۴۷ء میں ناصر خسرو نے جو پیمائش تحریر کی ہے وہ ۳۳۰ ارش × ۳۰۰ ارش ہے لیکن یہ ارش قریب قریب دو فیٹ کے مساوی تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ناصر خسرو کے اعداد صحیح ہیں تو اس وقت چبوترا کچھ کم ۶۶۰ فیٹ لمبا اور ۶۰۰ فیٹ چوڑا تھا - گویا صلیبیوں کے آنے سے پہلے وہ موجودہ چبوترے کی نسبت بڑا تھا - دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ ابن الفقیہ کے زمانے کی نسبت اس کی بلندی بھی زیادہ کر دی گئی تھی یعنی ۹ ہاتھ کی بجائے ناصر خسرو کے زمانے میں اسے ۱۲ ارش یا قریب قریب ۲۴ فیٹ حرم شریف کے فرش سے اونچا کر دیا گیا تھا - مگر آج کل وہ حرم شریف کی سطح سے صرف دس فیٹ

باب چہارم

بلند ہے۔

مجیر الدین جو پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر میں کتاب لکھ رہا ہے اور خود ناپ کر عرض و طول تحریر کرتا ہے، اس کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں چبوترا لازماً ایسی حالت میں ہو گا جس میں آج کل ہے۔ اس مصنف نے عمارتی ذرع کا استعمال کیا ہے جو تقریباً ۲ ۱/۴ انگریزی فیٹ کے برابر ہوتا تھا۔ اس کی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"صخرہ کے صحن (یا چبوترے) کی پیمائش یہ ہے کہ جنوبی دیوار سے لے کے، دونو زینوں اور قبۃ الصخرہ کے مشرقی دروازے اور قبۃ السلسلہ کے درمیان سے گزرتا ہوا خط کھینچیے جو باب حطہ کے مقابل شمالی دیوار پر ختم ہو، تو یہ فاصلہ ۲۳۵ ذرع ہو گا اور مشرقی دیوار سے قبۃ الطومار اور اشجار زیتون کے آگے سے گزرتا ہوا مغربی دیوار تک خط کھینچیے جو مدرسہ سلطان کے مقابل ختم ہو تو یہ فاصلہ معماروں کے ذرع کے حساب سے ۱۸۹ ہے" (مجیر الدین۔ ۳۷۷)۔

ابن الفقیہ نے (۹۰۳ء میں) تحریر کیا ہے کہ چبوترے پر چڑھنے کے لیے ۶ زینے تھے۔ مقدسی اسی برس کے بعد بیان کرتا ہے کہ چبوترے کے ہر چہار پہلو پر ایک ایک زینہ تھا۔ مگر ناصر خسرو ۱۰۵۲ء میں ان زینوں کا شمار دوبارہ ۶ بتاتا ہے اور چبوترے اور سیڑھیوں کے متعلق یہ مزید معلومات بہم پہنچاتا ہے:۔

حرم شریف کے صحن کے وسط میں چبوترا اور چبوترے کے بیچ میں وہ صخرہ ہے جو ظہور اسلام سے قبل سمت قبلہ تھی۔ چبوترے کے بنانے کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ صخرہ یا چٹان اپنی بلندی کے باعث مسجد اقصیٰ کی عمارت اصلیہ کے دور کے اندر نہ لائی جا سکتی تھی۔ اسی لیے چبوترے کی بنیادیں رکھی گئیں جو ۳۳۰ × ۳۰۰ اور بلندی میں ۱۲ ارش ہے۔ اس کی بالائی سطح ہموار ہے اور اس پہ سنگ مرمر کے خوشنما چوکے جمائے ہیں اور منڈیروں کو بھی اسی طرح بنایا ہے اور جوڑوں کو سیسے سے جوڑ دیا ہے

چاروں کناروں پر سنگ مرمر کے بڑے بڑے پتھروں کی منڈیر بنادی ہے کہ سوائے ان راستوں کے جو اسی غرض سے چھوڑے گئے ہیں۔ کوئی چبوترے پر آجا نہیں سکتا۔ چبوترے کے اوپر سے مسجد اقصیٰ کی چھتیں تک نظر آتی ہیں۔ چبوترے کے بیچ میں ایک زمین دوز حوض ہے جہاں چروں کے ذریعے تمام بارش کا پانی جو چبوترے پر برستا ہے، جمع ہو جاتا ہے اور حرم شریف کے تمام حوضوں کے پانی سے یہ پانی زیادہ صاف اور میٹھا ہوتا ہے۔

"رہے وہ زینے جو حرم شریف کے صحن کے چبوترے پر جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ۶ اور سب کے الگ الگ نام ہیں۔ قبلے (یعنی جنوب) کی طرف اوپر جانے کے دو زینے ہیں۔ ان کے درمیان کی منڈیر کے بیچ میں (جنوب رو) کھڑے ہو کر دیکھئے تو ایک زینہ دائیں اور ایک بائیں ہاتھ پر نظر آئے گا۔ دست راست والے کو مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں اور دست چپ کا زینہ مقام غوری موسوم ہے۔ پہلے زینے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ معراج کی رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرف سے چبوترے پر تشریف لائے اور یہیں سے قبۃ الصخرہ (کے مقام) کو گئے حجاز کا راستہ بھی اسی زینے کی طرف آتا ہے۔ آج کل یہ زینہ ۲۰ ہاتھ عریض ہے اور ہر سیڑھی پتھر کی ایک اور بعض جگہ صرف دو مستطیل ڈالیں بہت ہنرمندی سے تراش کر بنائی ہے۔ سیڑھیاں اتنی بڑی اور اس وضع سے بنائی گئی ہیں کہ گھوڑے کا سوار گھوڑے سمیت چبوترے پر چڑھ سکتا ہے۔ اس زینے کے اوپر سنگ مرمر کے چار پائے زمرد کی طرح سبز رنگ کے بنے ہوئے ہیں اگرچہ پتھر پر جا بجا بے شمار چتیوں کی بوقلمونی ہے۔ پایوں کی بلندی دس ہاتھ اور مٹائی اتنی ہے کہ دو آدمیوں کی گود میں آسکتے ہیں۔ ان پایوں کے اوپر تین کمانیں اٹھائی ہیں جن میں ایک تو دروازے کے مقابل ہے اور ایک ادھر اور دوسری ادھر دونوں بازوؤں میں بنی ہوئی ہیں۔ کمانوں کے اوپر کے گردنے کا سرا چپٹا اور مستطیل ہے اور منڈیر بنا کے کنگنی نکالدی ہے۔ ان پایوں اور کمانوں پر سونے اور چینی کی ایک ایسی میناکاری ہے

باب چہارم

کہ اس سے بہتر قیاس میں نہیں آتی ؛

چبوترے کے گرد کی منڈیر ہرے سنگ مرمر کی ہے جس میں چتیاں اسطرح پڑی ہیں کہ گویا سبزہ زار میں پھول کھل رہے ہیں ؛ مقام غوری کے زینے میں تین رخ سیڑھیاں بنائی ہیں - ایک سامنے اور دو بازوؤں میں کہ تینوں طرف سے لوگ چڑھ سکتے ہیں تینوں سیڑھیوں کے اوپر کے سرے پر کنگورہ دار محرابیں ہیں - ہر زینہ پتھروں کو بڑی ہنرمندی سے چوکور تراش کر بنایا ہے جیساکہ اوپر بیان ہوا اور ہر ایک کی لمبائی میں دو یا تین پتھر ہیں یکانون کے اوپر ایک خوبصورت کتبہ سونے سے کندہ کیا ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ انہیں امیر لیث الدولہ نوشتکیں غوری کے حکم سے تعمیر کیا گیا - اور لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ لیث الدولہ سلطان مصر کا خادم تھا جس نے ان زینوں اور محرابی دروازوں کو بنوایا ؛

چبوترے کے مغربی پہلو پر بھی اوپر جانے کے دو زینے ہیں اور اسی طرح خوبی سے بنائے گئے ہیں جیسے کہ مذکورہ بالا زینے - مگر مشرق کے پہلو پر صرف ایک زینہ ہے اسے بھی دوسرے زینوں کی وضع پر تعمیر کیا ہے اور ستون پر محراب اٹھا کے اوپر کنگورہ بنا دیا ہے - اس کا نام مقام شرقی ہے (چبوترے کے) شمال کی جانب بھی صرف ایک زینہ ہے لیکن یہ دوسروں سے زیادہ بلند اور چوڑا ہے اور ان کی طرح اس کے اوپر بھی ستون اور محرابیں بنی ہوئی ہیں - اس کا نام مقام شامی (یعنی شام یا شمال کا دروازہ) ہے - میرا تخمینہ تو یہ ہے کہ ان زینوں کی تعمیر میں ضرور ایک لاکھ دینار (= پچاس ہزار پونڈ) خرچ ہوئے ہوں گے (ناصر خسرو ۴۲ - ۵۴) ؛

نوشتگیں غوری جس کا اوپر ذکر آیا فاطمی خلیفہ الظاہر کا ایک ترک سپہ سالار تھا - شروع میں وہ ختن میں غلام تھا پھر ترقی کرتے کرتے والی شام کے عہدے پر سرفراز ہوا جہاں ناصر خسرو کی سیاحت سے کچھ ہی قبل (یعنی ۱۰۲۸ء سے ۱۰۴۱ء تک) حکومت کرتا رہا ؛

حرم شریف کا صحن

قدیم حالات جن میں مختلف عمارات یعنی محراب، منبر اور گنبدوں کی جو حرم شریف کے وسیع صحن میں جا بجا بنے ہوئے تھے کیفیت بیان کی گئی ہے، ان میں ایسی عمارتوں کا بھی ذکر آتا ہے جن میں سے بعض مرورِ ایام سے ٹوٹ پھوٹ گئیں اور اب ان کا کوئی نشان نہیں ملتا اور بعض ایسی ہیں کہ نام بدلجانے سے موجودہ ابنیہ میں ان کو پہچاننا مشکوک ہوگیا ہے۔

اصل میں اٹھاسی برس تک جو بیت المقدس نصاریٰ کے ہاتھ میں رہا تو حرم شریف کی عمارتوں سے ان کا فرقہ الداویہ بالکل دوسرے خواہ مذہبی خواہ خانگی، کام لیتا رہا کیونکہ حرم شریف اسی گروہ (الداویہ) کی تحویل میں دیدیا گیا تھا۔ گوڈفرے کے قبضۂ شہر کو قریب تین پشتیں گزر چکی تھیں جب کہ سلطان صلاح الدینؒ نے دوبارہ اسے فتح کیا اور اس مدت میں یقیناً بہت سی اسلامی روایات جو حرم شریف کی عمارات کے متعلق تھیں، فراموش یا مسخ ہو چکی تھیں۔

دسویں صدی کے شروع کے دو بیان (یعنی ۹۰۳ھ و ۹۱۳ھ کے) ہم تک پہنچے ہیں جس میں رقبہ حرم کے عام حالات مذکور ہیں مگر ان میں مطابقت کے پہلو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ شاید ان دونوں کا ماخذ بھی ایک ہی ہو۔ پھر بھی تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں کہ ان دونوں بیانات کے مصنفوں یعنی ابن الفقیہ اور ابن عبد ربہ میں سے کسی نے ان مقامات کا ذاتی طور پر مشاہدہ بھی کیا تھا یا نہیں؟ انہی بیانات کو بعد کے اکثر مصنفوں نے جستہ جستہ نقل کیا ہے اور سب سے زیادہ سیوطی نے جس سے مجیر الدین نے بے تکلف نقلیں اڑائی ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۹) گزشتہ صفحات میں ان بیانات کی بعض جزئیات پر ہم پہلے ہی رائے زنی کر چکے ہیں۔ اب حرم شریف کی دوسری چھوٹی چھوٹی عمارتوں پر جو دسویں صدی میں وہاں بنی ہوئی تھیں نظر ڈالیں گے

باب چہارم

اور دوسرے ذرائع سے جو بیانات ہم تک پہنچے ہیں، ان سے مقابلہ کرینگے۔ لیکن مناسب ہوگا کہ سب سے اول رقبۂ حرم شریف کے مذکورۂ بالا دونوں بیانات کا پورا ترجمہ ذیل میں لکھ دیا جائے:۔

ابن الفقیہ کا ۹۰۳ء کا تحریر کردہ بیان حسب ذیل ہے:۔

"وہ بیان کرتے ہیں کہ بیت المقدس کے حرم شریف کا طول ایک ہزار درع اور عرض سات سو درع ہے۔ اس کی عمارتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر سات سو سنگین ستون اور پانچ سو پیتل کی زنجیریں ہیں۔ ہر رات ایک ہزار چھ سو فانوس کی وہاں روشنی ہوتی ہے اور ایک سو چالیس غلام اس کے لیے مامور ہیں۔ ماہانہ سو قسطؔ[1] روغن زیتون کا خرچ مقرر ہے اور ہر سال ۸ لاکھ درع بوریئے نیز پچیس ہزار پانی کے برتن وہاں کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ حرم شریف کے اندر سولہ بڑے صندوق قرآن شریف کے مجلدات کے واسطے رہتے ہیں کہ عام لوگوں کے پڑھنے کے کام آئیں اور یہ نسخے دیکھکر ہر شخص ان کی مدح وثنا کرتا ہے۔ واعظین کے لیے جو بطور خود وعظ کریں چار منبر ہیں اور ایک منبر صرف تنخواہ دار خطیب کے واسطے بنا ہوا ہے۔ وضو کے لیئے بھی چار حوض ہیں۔ مسجد اور گنبدوں کی چھتوں پر مٹی کی بجائے پینتالیس ہزار جست کی چادریں چڑھائی گئی ہیں۔ محراب کے پیارے ہاتھ پر (مسجد اقصیٰ میں) ایک لوح نصب ہے اور اس کے وسط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک تحریر ہے اور قبلے (یعنی جنوبی دیوار) کی پشت پر ایک سفید پتھر میں یہ کتبہ ہے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد رسول اللہ (صلعم) و حمزہؔ[2] ناصرہ" مسجد کے اندر مستورات کے لیے تین مقصورے ہیں جن میں سے ہر ایک ستر درع لمبا ہے حرم شریف کے اندر اور باہر سب ملا کے پچاس دروازے

---

[1]:۔ قسط (جو یونانی "کیستیک" اور رومی "سیکستاریوس" سے نکلا ہے) انگریزی کے تقریباً ساڑھے چار کوارٹ (= کوئی تین سیر) کے برابر کا وزن تھا۔

[2]:۔ یعنی حمزہ ابن عبد المطلب عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو احد کی جنگ میں شہید ہوئے تھے۔

ہیں"؛

اس کے آگے قبۃ الصخرہ اور دوسرے چھوٹے گنبدوں کی کیفیت ہے جس کا اوپر ہم ترجمہ کر چکے ہیں (صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷) اور پھر ابن الفقیہ لکھتا ہے کہ:-

"حرم شریف کے بڑے دروازوں میں بعض کے نام یہ ہیں:- باب داؤد - باب حطہ - باب النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) باب التوبہ اور اسی جگہ محراب مریم علیہا السلام ہے - باب الوادی - باب الرحمہ جس کیساتھ محراب زکریا علیہ السلام بنی ہوئی ہے - ابواب الاسباط (یعنی قبائل کے دروازے) جن کے پاس ہی غار ابراہیم علیہ السلام محراب یعقوب علیہ السلام اور باب دار ام خالد ہیں؛ احاطہ حرم کے باہر جانب مغرب شہر کے پھاٹک کے قریب محراب داؤد واقع ہے - براق کے باندھنے کی جگہ جنوبی مینار کے زاویے میں ہے عین صلوان احاطہ حرم کے جنوب میں ہے - کوہ زیتون سے حرم شریف کا احاطہ نیچے نظر آتا ہے اور ان دونوں کے درمیان وادی جہنم حائل ہے ۔ کوہ زیتون سے حضرت مسیح علیہ السلام اٹھائے گئے تھے اور وہیں سیدنا عمرؓ کا مقام عبادت اور بہت سے انبیا کے مقبرے ہیں" (ابن الفقیہ - صفحہ ۱۰۰ و ۱۰۱)؛

ابن عبدربہ کی کیفیت کوئی دس سال بعد کی لکھی ہوئی ہے اور بعض جزئیات میں مختلف ہے اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:-

"بیت المقدس کی مسجد اور انبیاء کے آثار کے حالات میں جو وہاں پائے جاتے ہیں؛ امامؒ کے ذرع کے مطابق حرم شریف کا طول ۷۸۴ اور عرض ۴۵۵ ذرع ہے - ان مبارک عمارات میں ڈیڑھ ہزار فانوس کی روشنی کی جاتی ہے اور ان کے بنانے میں ۶۹۰۰ شہتیر خرچ ہوئے تھے - دروازوں کی تعداد پچاس ہے اور ستون ۶۸۴ ہیں - صخرہ کے

ؒ:- اگر عبارت میں لفظ "امام" درست ہے تو مراد بالیقین حضرت علیؓ سے ہے جنھوں نے ذرع کا پیمانہ مقرر کرنے کے علاوہ اور بہت سی نئی باتیں مروج کی تھیں؛

اندر تیس اور باہر اٹھارہ ستون ہیں[1]۔ اس گنبد پر ۳۳۹۲ جست کی چادریں چھائی ہیں جن کے اوپر جلا کی ہوئی پیتل کی تختیاں جڑی ہیں اور یہ تعداد میں ۱۰۲۱۰ ہیں۔ اس قبہ کی روشنی کے واسطے کل ۴۶۴ فانوس کام میں لائے جاتے ہیں جو تانبے کی زنجیروں اور کنڈوں میں لٹکے رہتے ہیں۔ بیت المقدس میں صخرہ کی بلندی قدیم زمانے میں جب کہ وہ آسمان تک بلند تھا، بارہ میل تھی اور مشرق میں اریحا کے باشندے تک اس کے سائے سے مستفیض ہوتے تھے جس طرح مغرب میں عمواس والے اور (اسی قدیم زمانے میں) اس کے اوپر ایک یاقوت سُرخ لگا ہوا تھا جس کی روشنی بلقا کے باشندوں تک پہنچتی تھی (اور وہ بھی اتنی) کہ وہاں کے رہنے والے اس کی روشنی میں سوت کات لیا کرتے تھے۔ مسجد (الاقصیٰ ؟) میں عورتوں کے لیے تین مقصورے ہیں۔ ہر ایک کا طول ۸۰ اور عرض ۵۰ درع ہے[2]۔ فانوسوں کو آویزاں کرنے کی غرض سے مسجد میں ۶سو زنجیریں ہیں اور ہر زنجیر ۱۸ درع لمبی ہے۔ نیز ستر تانبے کی غربالیں (چھلنیاں) اور سات صنوبری شکل کی مینرین فانوسوں کے لیے جنھیں صنوبرات کہتے ہیں۔ پھر ستر کامل مجلدات قرآن شریف کے جن میں سے چھ بڑی تقطیع کے ہیں اور ہر صفحہ ایک پوری کھال کے قطعہ کا ہے۔ یہ چھ نسخے رحلوں پر دھرے رہتے ہیں۔ حرم محترم میں دس محرابیں، پندرہ گنبد، چوبیس حوض بچہ اور چار مینار اذان کے واسطے ہیں۔ مسجد، گنبد اور میناروں کی سب چھتوں پر ملمع کی ہوئی چادریں چڑھی ہیں۔ خدمت کے لیے جو لوگ نوکر ہیں، ان کی تعداد اہل و عیال سمیت ۲۳۰ نفوس ہیں۔ یہ مملوک کہلاتے ہیں اور خزانۂ عامرہ سے انھیں تنخواہ ملتی ہے۔ حرم شریف کے واسطے روغن

---

[1]۔ دیکھو صفحہ (۱۴۸) واضح رہے کہ "الصخرہ" (= چٹان) اس کو قبہ اور صرف چٹان دونوں معنی میں بولا جاتا تھا جس طرح "المسجد" سے حرم شریف کا پورا احاطہ اور خصوصیت کے ساتھ صرف اس کا جنوبی حصہ یعنی خاص مسجد اقصیٰ کی عمارت مراد لیتے تھے۔

[2]۔ ملاحظہ ہو صفحہ (۱۱۹)۔

زیتون کی ماہانہ مقدار سات سو قسط ابرآ بھی مقرر ہے اور قسط کا وزن یک ونیم رطل کے مساوی ہوتا ہے[1] چٹائیوں کی سالانہ تعداد جو حرم شریف کے لیے مقرر ہیں آٹھ ہزار ہے چراغ کی بتیوں کی روئی خریدنے کے لیے ۱۲ دینار سالانہ (= ۶ پونڈ) دیے جاتے۔ فانوسوں کے واسطے ۳۳ دینار اور کاریگروں کی اجرت کی مد میں جو حرم شریف کی مختلف چھتوں کی درستی کرتے ہیں، ۱۵ دینار سالانہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے مقدس مقامات شہر میں حسب ذیل ہیں:۔
مسجد اقصیٰ کے گوشے کے نیچے وہ جگہ ہے جہاں نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے اپنا مرکب البراق باندھا تھا حرم شریف کے دروازوں میں باب داؤد علیہ السلام باب سلیمانؑ اور باب حطہ ہیں اور جہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ "قولوا حطۃ نغفر لکم خطایاکم وسنزید المحسنین"[2] وہاں اسی مقام کا اشارہ ہے مگر بعض لوگ مسخرے پن سے "حنطہ" (بمعنی گیہوں) کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس بیہودگی کی سزا دے۔ ان کے علاوہ باب محمد صلعم اور باب التوبہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی۔ اور باب الرحمہ جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبارک میں باین الفاظ تذکرہ فرمایا کہ "فضرب بینہم بسور لہ باب۔ باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب"[3] وہاں اسی باب الرحمہ اور "عذاب" سے وادی جہنم کی طرف اشارہ ہے جو بیت المقدس کے مشرق میں ہے۔ پھر ابواب اسباط یعنی بنی اسرائیل کے قبیلوں کے دروازے جن کی تعداد اس جگہ چھ ہے ان کے علاوہ باب الولید، باب الہاشمی، باب الخضر، باب الیاس اور باب السکینہ ہیں۔

---

[1]:۔ گویا یہ قسط نو پونڈ کے برابر ہوا۔
[2]:۔ سورۂ بقر۔
[3]:۔ سورہ الحدید۔ ع ۲۔

حرم شریف میں اور آگے بڑھئے تو محراب مریم علیہا السلام بنت عمران ملتی ہے جہاں فرشتے ان کے واسطے گرمیوں میں سردی کے اور سردی میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے تھے۔ نیز زکریا علیہ السلام (حضرت یحییٰ کے والد) کی محراب ہے جہاں فرشتوں نے انھیں حضرت یحییٰ کی ولادت کی بشارت دی جبکہ وہ نماز میں کھڑے تھے۔ ایک محراب یعقوب علیہ السلام اور کرسی سلیمان علیہ السلام کا مقام ہے جس پر بیٹھکر حضرت سلیمان اللہ کی عبادت کرتے تھے اور ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا مینار جہاں آنحضرت علیہ السلام اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ پھر یہیں وہ گنبد ہیں جہاں سے ہمارے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ وہ گنبد جہاں حضور صلعم نے انبیائے پیشیں کے ساتھ نماز ادا فرمائی نیز وہ گنبد جس میں وہ زنجیر تھی جو صدق و کذب کا حال بتاتی اور لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتی تھی۔ آگے چل کے مصلی جبرئیل علیہ السلام اور مصلی خضر علیہ السلام ہیں
اب جس وقت صخرہ (یعنی قبۃ الصخرہ) کے اندر تم داخل ہوتے ہو تو اس کے تینوں کونوں میں نماز ادا کرنی ہوتی ہے اور اس لوح کے اوپر بھی جو حرمت میں خود چٹان کے مماثل ہے کیونکہ وہ بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر رکھی ہوئی ہے۔ حضرت مسیح ابن مریم علیہما السلام کا مقام ولادت (بیت اللحم) حرم شریف سے تین میل کے قریب فاصلے پر واقع ہے۔ مسجد ابراہیم (یعنی جیرون) جہاں آنحضرت علیہ السلام کا مزار مبارک ہے بیت المقدس سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ مالکی فرقے کی محراب اس مسجد میں جانب غرب ہے اور یہ بیت المقدس کے قابل دید مقامات میں سے ہے۔ پل صراط کا مقام بھی بیت المقدس میں ہے اور نہ وہ جہنم سے، اللہ اس کی آگ سے ہمیں بچائے۔ اس شہر مقدس تک آتا ہے۔ قیامت کے روز فردوس بریں دلھن کی طرح بیت المقدس کے پاس لائی جائیگی اور اسی کے ساتھ کعبہ شریف بھی یہاں آئے گا اور اسے دیکھ کر لوگ چلائیں گے کہ حج کرنے والوں کو مرحبا اور مرحبا اسے جس کا

باب چہارم

حج کیا جاتا ہے" اور حجرِ اسود جلوسِ شادی کے ساتھ بیت المقدس میں لایا جائیگا اور اس دن وہ (= حجر اسود) جبل ابو قبیس[1] سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔ بیت المقدس کی کرامتوں میں یہ باتیں داخل ہیں کہ:- اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسیح ابن مریم علیہما السلام کی طرح اسی شہر میں آسمان پر اٹھایا۔ اور، تحقیق قیامت کے قریب دجّال، حضرت مسیح کو زمین کے ہر حصے میں اور سب جگہ مغلوب کرلے گا، بجز بیت المقدس کے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یاجوج و ماجوج کے لیے ممنوع کر دیا ہے کہ وہ اس محترم شہر میں قدم دھر سکیں آخری کرامت یہ کہ بڑے بڑے اولیا اور ابدال سب اسی مقدس شہر گئے ہیں اور حضرت آدم، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام انبیائے بنی اسرائیل کے گروہ کثیر نے وصیت میں حکم دیا ہے کہ انھیں بیت المقدس میں دفن کیا جائے (ابن عبد ربہ۔ سوم۔ ۳۶۶ - ۳۶۸)

مقدسی ۹۸۵ء میں مذکورۂ بالا مصنفوں کی بیان کردہ بعض جزئیات کی تائید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:-

حرم شریف کے اندر متبرک مقامات میں محراب مریم (علیہا السلام) محراب زکریا، یعقوب، الخضر علیہم السلام مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقام جبرئیل علیہ السلام مقام نملہ (= چیونٹی) مقام النار، مقام الکعبہ نیز پل صراط کا مقام داخل ہیں اور یہ وہ پل ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان حد فاصل ہوگا۔ حرم شریف کا عرض و طول بادشاہی ہاشمی دِرع کے حساب سے سات سو اور ہزار درع کا ہے۔ مختلف عمارات کی چھتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر ڈالے ہیں جو سنگ مرمر کے سات سو ستونوں پر قائم ہیں اور چھتوں کے اوپر پینتالیس ہزار جست کی چادریں چڑھائی ہیں۔ خود صخرہ شریف کی پیمائش ۳۳ ضرب ۲۷ درع ہے اور اس کے نیچے جو کھو بن گئی ہے اس میں ۶۹ آدمی آجاتے ہیں۔ اوقاف میں ماہانہ ایک سو

[1]:- جبل بو قبیس مکہ معظمہ کی پہاڑی جو اس کے مغرب میں بلند ہے۔

قسط روغن زیتون کے خرچ کا انتظام کیا گیا ہے اور ہر سال آٹھ لاکھ درع کی چٹائی کام میں آتی ہے۔ مسجد کے خاص خدام علیحدہ مقرر ہیں ان خدمات کو خلیفہ عبد الملک نے مقرر کیا اور ان کے لیے پانچویں جیش کے آدمی منتخب کیے جو لڑائیوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے اور اسی پانچویں جیش کی مناسبت سے وہ الاخمس کہلاتے ہیں۔ ان کے سوائے اور کوئی ان خدمات پر مقرر نہیں ہوتا اور یہ لوگ باری باری صخرۂ شریف کی پاسبانی کرتے ہیں"۔ (مقدسی ۔ ۱۷۰ و ۱۷۱)

مذکورۂ بالا بیانات میں جو دلچسپ امور درج ہیں اب ہم انھیں ذرا تفصیل سے جانچیں گے اور دوسرے ماخذوں کے بیانات سے ان کا مقابلہ کریں گے۔

مہد مسیح علیہ السلام

احاطۂ حرم کے جنوب مشرقی زاویے میں قدیم برج کے آثار پر جو چھوٹی سی مسجد بنا دی ہے اور آج کل مہد مسیح علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے اس کا ابن عبد ربہ نے جیسا کہ اوپر نقل ہوا "محراب مریمؑ بنت عمران" کے نام سے تذکرہ کیا ہے اور مقدسی بھی حرم شریف کے متبرک آثار میں "محراب مریم و زکریا علیہما السلام" کا ذکر کرتا ہے۔

اس مقام کا سب سے پہلا مفصل بیان ناصر خسرو کے سفر نامے میں ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "حرم شریف کے جنوبی گوشے میں پہنچیے جہاں سمت قبلہ آپ کے سامنے جانب جنوب، کسی قدر مٹی ہوئی واقع ہے تو مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ایک زمین دوز مسجد ہے جس کے اندر کئی سیڑھیاں اتر کے داخل ہوتے ہیں۔ یہ احاطۂ حرم کی جنوبی دیوار کے متصل شمال کی طرف واقع اور ۲۰ × ۱۵ ادرع وسیع ہے۔ اس کے دالان پتھر کی چھت سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم ہے۔ زمانۂ قدیم سے حضرت مسیحؑ کا پنگورا

باب چہارم

یہاں رکھا تھا۔ یہ پنگورا پتھر کا ہے اور اتنا وسیع ہے کہ ایک آدمی اس میں اچھی طرح نماز ادا کر سکتا ہے چنانچہ خود میں نے اس میں نماز پڑھی۔ یہ پنگورا زمین میں گڑا ہوا ہے اور اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ پنگورا ہے جس میں حضرت مسیحؑ لٹائے گئے اور انھوں نے شیر خوارگی میں لوگوں سے گفتگو فرمائی۔ اسی کو مسجد کی محراب بنا دیا ہے اور اسی مسجد کے مشرقی پہلو میں محراب مریمؑ اور ایک اور محراب حضرت زکریاؑ کی واقع ہے۔ ان محرابوں کے اوپر قرآن شریف کی وہ آیات لکھی ہوئی ہیں جن میں حضرت مریم اور حضرت زکریا علیہما السلام کا ذکر آیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام اسی جگہ پیدا ہوئے تھے جہاں یہ مسجد واقع ہے۔ ایک ستون کے پیٹے پر اس قسم کا نشان بنا ہوا ہے گویا کسی نے پتھر کو انگلیوں سے مروڑا ہے اور لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت مریمؑ کو دردزہ کی تکلیف ہوئی تو آپ نے اس طرح پتھر کو زور سے پکڑا تھا جس کا یہ نشان یہاں پڑ گیا۔ اس مسجد کو مہد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس میں چاندی اور پیتل کے بہت سے فانوس لٹکے ہوئے ہیں جنھیں ہر رات روشن کیا جاتا ہے" (ناصر خسرو۔ ۳۳)

صلیبیوں کے قبضے کے زمانے میں ان کے فرقے الداویہ نے حرم شریف کے جنوب مشرقی کونے کے ان زمین دوز مکانات سے اصطبل کا کام لیا اور لاطینی وقائع نویس اس مقام کا اصطبل سلیمان کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ علی ہروی نے بھی جس کی تحریر صلیبیوں کے قبضے کے زمانے یعنی ۱۱۷۳ء کی ہے اسی نام سے اسے یاد کیا ہے۔ اس کی تحریر حسب ذیل ہے:۔

"حرم شریف کے نیچے حضرت سلیمان کے اصطبل ہیں جن میں انکے جانور رہتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی دیواروں میں غیر معمولی طور پر بڑے بڑے پتھر لگے ہوئے ہیں اور جانوروں کے گھر آج تک بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ غار بھی انھیں میں موجود ہیں جنھیں مہد عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام

باب چہارم

(کہتے ہیں" علی ہروی نسخہ قلمی اوکسفورڈ۔ ورق ۳۹)۔

مجاہدین صلیب کے آنے سے پہلے حرم محترم کے وسیع صحن میں بہت سی عمارتیں کھڑی تھیں جن کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اور مجیر الدین وسیوطی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر عمارتیں سلطان صلاح الدین کے دوبارہ شہر پر قبضہ کرنے سے قبل ہی محو ہو چکی تھیں چنانچہ ناصر خسرو ۱۰۴۷ء میں تحریر کرتا ہے کہ:۔

"چبوترہ پر تو نہیں لیکن حرم کے احاطے کے اندر ایک عمارت مسجد سے ملتی جلتی ہے۔ یہ شمالی پہلو کی طرف واقع ہے اور چار دیواری کا حظیرہ ہے جسے چوکور پتھروں سے قد آدم سے کچھ اونچی دیواریں اٹھا کے بنایا ہے۔ اسے محراب داؤد کہتے ہیں۔ اس حظیرے کے قریب ایک چٹان تقریباً قد آدم بلند ہے اور اس کی چوٹی پر جو ناہموار ہے، اس قدر جگہ بھی نہیں ہے جس پر جانماز اچھی طرح بچھائی جا سکے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہی جگہ کرسی سلیمان تھی اور آنحضرت علیہ السلام حرم شریف کی عمارات بنوانے کے زمانے میں اسی پر نشست فرماتے تھے"۔

یہ محراب داؤد جو حرم شریف کے شمالی حصے میں اور کرسی سلیمان کے قریب بتائی گئی ہے، مشکل سے وہ جگہ ہو سکتی ہے جسے آج کل منبر داؤد کہتے ہیں اور جو حرم شریف کی جنوبی دیوار کی دربستہ محراب ہے۔ غالباً یہ وہی عمارت ہے جسے مجیر الدین قبۂ سلیمان کے نام سے یاد کرتا ہے اور جو باب العتم کے سامنے اور اس دروازے کے قریب ہی جنوب مغرب میں واقع ہے" (دیکھو نقشہ آئندہ)

رہا محراب داؤد کی شناخت کا مسئلہ، تو سیوطی ۱۴۷۰ء کی تصنیف میں ان الفاظ میں اس مضمون پر بحث کرتا ہے کہ:۔

"رہی محراب داؤد تو اس کی شناخت کے بارے میں اختلاف آرا ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ وہ محراب کلاں ہے جو احاطۂ حرم کی جنوبی دیوار میں بنی ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ (مسجد اقصیٰ کے) منبر کے برابر

کی بڑی دیوار ہے "الفتح القدسی" کا مصنف یقین دلاتا ہے کہ محراب داؤدؑ بیت المقدس کے قلعے میں ہے جہاں حضرت داؤدؑ عبادت کیا کرتے تھے کیونکہ آنحضرتؑ قلعے ہی کے اندر سکونت رکھتے اور وہیں ان کا عبادت خانہ تھا۔ وہ محراب جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بایں الفاظ ذکر کیا ہے کہ "وھل اتاک نبوالخصم۔ اذ تسوروا المحراب" (سورہ ص آیہ ۲۰) تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس سے محراب داؤدؑ ہی مراد ہے جہاں وہ عبادت فرماتے تھے اور یہ جگہ قلعے کے اندر واقع تھی۔ ادھر وہ مقام جس کو آج کل محراب کلاں کہتے ہیں اور وہ احاطۂ حرم شریف کے اندر ہے، اس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ جب حرم شریف کے اندر تشریف لاتے تو اس وقت اس جگہ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ یہاں تشریف لائے تو انھوں نے داؤد علیہ السلام کی پیروی کرنی چاہی اور وہیں نماز ادا کی جہاں آنحضرت علیہ السلام ادا فرماتے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ کی تسخیر بیت المقدس کے بعد پہلی مرتبہ اس جگہ نماز پڑھنے کے باعث یہ مقام محراب عمرؓ موسوم ہو گیا حالانکہ اصلی اور قدیمی نام محراب داؤدؑ ہی تھا۔ اس واقعے کی تصدیق وہ مسلمہ تکریم و احترام ہے جو حضرت عمرؓ نے اس مقام کا ملحوظ فرمایا۔ چنانچہ جب انھوں نے کعب سے پوچھا کہ "تمھارے نزدیک اس مقدس مقام میں ہم نماز کی جگہ کونسی مقرر کریں؟" اور کعب نے جواب دیا کہ "عقب میں، جہاں صخرہ سے قریب رہو تاکہ دونوں قبلے (یعنی موسوی اور محمدی) مل جائیں" تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ "اے ابو اسحٰق، تم ابھی تک یہودی وضع پر چلتے ہو۔ کیا ہم وہ قوم نہیں ہیں جو اس مقدس احاطے کے اگلے حصے کے حقدار مالک ہیں؟[1]" پھر حضرت عمرؓ نے محراب کی وہ جائے منتخب فرمائی جہاں محراب داؤدؑ تھی اور حضرت داؤدؑ حرم کے اندر آ کے وہاں نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ پس حضرت عمرؓ کی رائے

ملا :۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۴)

باب چہارم

اور اس مقام کا اتنا احترام فرمانا، دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ قدیم زمانے میں حضرت داؤدؑ نے اسی جگہ کا تعین فرمایا اور اسی کو اپنی نماز کی جگہ قرار دیا۔" (سیوطی ۲۶۲ و ۲۶۴)

ناصر خسرو حرم شریف کے شمالی حصے میں منبر داؤدؑ کے علاوہ دو اور گنبدوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے پہلے موسوم بہ قبہ یعقوبؑ کی نسبت وہ کہتا ہے کہ یہ گنبد دالان کے قریب اس دروازے کی دیوار کے برابر چلا گیا تھا جو آج کل باب حطہ کہلاتا ہے اور اس زمانے میں باب زوایائے صوفیہ موسوم تھا اور احاطہ حرم شریف کے شمال مغربی گوشے میں بنا ہوا ہے۔ دیکھو آئندہ صفحہ ۔۔۔۔ نیز نقشہ مقابل صفحہ ۱۸۱)

دوسرا گنبد بظاہر حرم شریف کے شمال مشرقی گوشے میں تھا (نقشہ مقابل صفحہ ۱۸۱) اسے محراب زکریاؑ کہتے تھے۔ آج کل اس کا کوئی اثر آثار باقی نہیں رہا۔ لیکن قبۂ یعقوبؑ سے غالباً وہ گنبد مراد ہے جسے آج کل قبۂ سلیمانؑ کہتے ہیں؛ (نقشہ مقابل صفحہ ۲۰۶)

کرسی سلیمانؑ کے بارے میں جس کا مقدسی اور ناصر خسرو دونوں نے تذکرہ کیا ہے، سیوطی نے حسب ذیل روایت نقل کی ہے:-

"یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ سلیمانؑ بنی اللہ نے جس وقت (ہیکل کی) عمارت کی تکمیل کی تو تین ہزار بچھیاں اور سات ہزار بھیڑیں اس مقام پر قربان کیں جو حرم شریف کے عقبی یا شمالی حصّے میں باب الاسباط کے قریب ہے یہی جگہ ہے جہاں آج کل کرسی سلیمانؑ نامی عمارت بنی ہوئی ہے" (سیوطی ۲۵۰۔ دیکھو نقشۂ مقابل ۲۰۶)

یہ فقرہ مجیر الدین نے بھی نقل کیا ہے مگر اتنا اور بڑھا دیا ہے کہ ہمارے زمانے کی مروجّہ روایت کے بموجب کرسی سلیمانؑ کی جگہ باب الدویدریہ کے قریب گنبد سلیمانؑ کے اندر ہے" (مجیر الدین ۱۱۱۔ نقشہ مقابل صفحہ ۲۰۶)

دوسرے گنبدوں کے بارے میں مجیر الدین ۱۴۹۶ء میں حسب ذیل

تحریر کرتا ہے :-

"باب السلسلہ کے مقابل میں قبۂ موسیٰ بنا ہوا ہے لیکن یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام پر موسوم نہیں ہے اور آنحضرت علیہ السلام سے کوئی روایتی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) میں از سر نو تعمیر کیا گیا اور اس سے پہلے قبۃ الشجرہ کہلاتا تھا" (مجیر الدین - ۳۷۵)

قبۃ الطومار جنوب مشرقی کونے پر چبوترے کے کنارے پر بنا ہوا تھا" (مجیر الدین - ۳۷۶)

حرم شریف کے میناروں کے ذکر میں مجیر الدین لکھتا ہے کہ "چار مینار اسی مقام پر قائم ہیں، جہاں عبد الملک کے زمانے میں تھے۔ ان میں سے پہلا حرم شریف کے جنوب مغربی گوشے میں مدرسہ فخر الدین کے اوپر بنا ہوا ہے۔ دوسرا باب السلسلہ کے شمال میں۔ تیسرا شمال مغربی زاویے میں ماذنۃ الغوانمہ کہلاتا ہے۔ یہ اسی نام کے دروازے کے قریب ہے (دیکھو نقشۂ مقابل صفحہ ۲۰۶) اور ۶۹۷ھ (= ۱۲۹۸ء) میں دوبارہ تعمیر کرایا گیا تھا۔ چوتھا مینار باب الاسباط اور باب الحطہ کے درمیان ہے اس کی ۷۶۹ھ (= ۱۳۶۷ء) میں از سر نو تعمیر ہوئی" (مجیر الدین - ۳۷۹، ۳۸۰)

آخر میں حرم شریف کے مختلف چھوٹے گنبدوں اور خانقاہوں کے حال کو مختصر طور پر دہرا دینا مناسب ہوگا، جن کا پہلی جنگ صلیب کے قبل کے مصنفوں نے حال لکھا ہے اور جس کے بعد حرم شریف کی عمارتوں میں اتنی کچھ تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

موجودہ قبۃ المعراج کو ابن الفقیہ "قبۃ النبی" کے نام سے یاد کرتا ہے ابن عبد ربہ اور مقدسی اسے قبۃ المعراج کہتے ہیں۔ مگر ناصر خسرو نے قبۃ النبی ہی لکھا ہے۔

موجودہ قبۃ جبرئیل (قبۃ الصخرہ کے قریب کا گنبد) وہ ہے جسے ابن الفقیہ "مقام جبرئیل" اور ابن عبد ربہ "مصلی جبرئیل" موسوم کرتے ہیں۔ مقدسی اسے قبۃ النبی کہتا ہے اور ناصر خسرو موجودہ نام کے مطابق قبۃ الجبرئیل پکارتا ہے"

! بے جہارم

وہ گنبد جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے انبیاؑ کے ساتھ نماز پڑھی، ابن عبد ربہ اس کا ذکر کرتا ہے۔ مقدسی صرف مقام النبیؐ اور مقام جبرئیلؑ لکھتا ہے کہ یہ بھی حرم شریف کی متبرک عمارتوں میں داخل ہیں ؂

مقام خضرؑ (یا الیاسؑ) کا ابن الفقیہ، ابن عبد ربہ اور مقدسی نے ذکر کیا ہے مگر مقدسی اسے "محراب" لکھتا ہے ؂

ابن الفقیہ، ابن عبد ربہ، مقدسی اور ناصر خسرو چاروں موجودہ مہد عیسیٰؑ کا نیز محراب مریمؑ اور محراب زکریاؑ کا تذکرہ کرتے ہیں ؂

ناصر خسرو نے ایک اور محراب یا قبۂ زکریاؑ کا بھی حال لکھا ہے (جس کا اب کوئی پتہ نہیں چلتا) اور حرم شریف کے شمال مغربی گوشے میں تھا ؂

کہف ابراہیمؑ کا ابن الفقیہ، اور منارا براہیمؑ کا ابن عبد ربہ تذکرہ کرتے ہیں اور یہ دونوں اس زمانے میں بے پتہ ہیں ؂

مقام النمل، مقام النار اور مقام کعبہ ان سب کا مقدسی نے ذکر کیا ہے ؂

ابن الفقیہ، ابن عبد ربہ اور مقدسی محراب یعقوبؑ کا ذکر کرتے ہیں ناصر خسرو نے گنبد یعقوب کی کیفیت لکھی ہے جو حرم شریف کے شمالی حصے میں تھا ؂

اسی شمالی حصے میں ناصر خسرو محراب داؤدؑ کا ذکر کرتا ہے ؂

کرسی سلیمان کا ابن عبد ربہ اور ناصر خسرو دونوں تذکرہ کرتے ہیں ؂

ابن الفقیہ، ابن عبد ربہ اور مقدسی تینوں پل صراط کا جو دوزخ و جنت کے درمیان قائم ہے، تذکرہ کرتے ہیں ؂

ابن الفقیہ اور ابن عبد ربہ اس مقام کا بھی ذکر کرتے ہیں، جہاں براق باندھا گیا تھا ؂
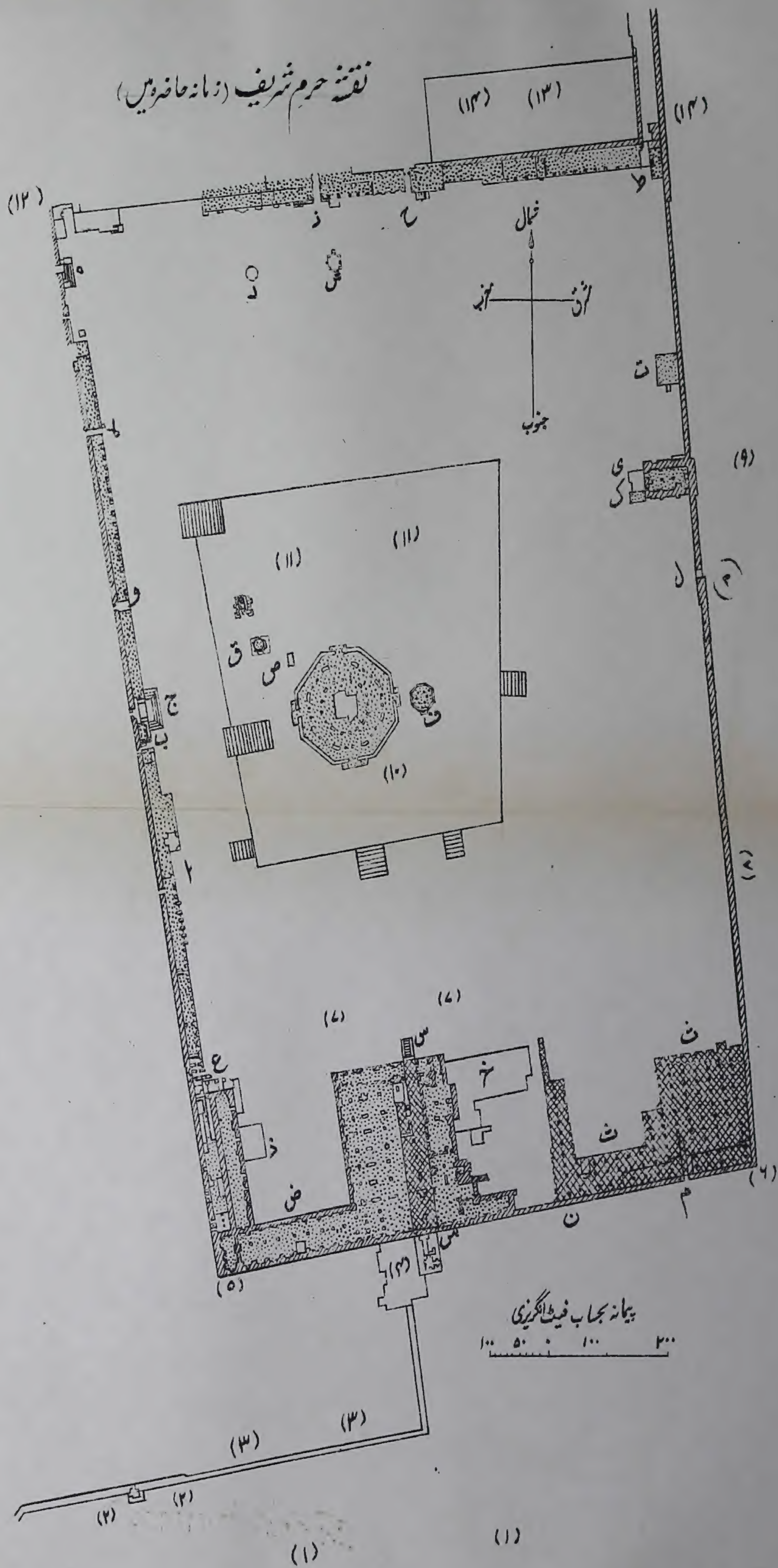
تشریحات نقشۂ حرم شریف (زمانۂ حاضرہ میں)

ا .... باب السلسلہ
ب .... باب المتوضی یا باب المطارہ
ج .... باب القطانین
د .... باب الحدید
ہ .... باب الناظر
و .... باب الغوانمہ یعنی خاندان غانم کا دروازہ
ز .... باب العتم یعنی تاریکی (جسے باب شرف انبیاؑ بھی کہتے ہیں)
ح .... باب حطہ
ط .... باب الاسباط
ی .... باب التوبہ
ک .... باب الرحمہ
ل .... تیغا کیا ہوا دروازہ (جسے پہلے باب الجنائز کہتے تھے)
م .... اکہرا دروازہ
ن .... تہرا دروازہ
س .... دوہرا دروازہ (جس سے زمین دوز راستے کو جاتے ہیں)
ع .... باب المغاربہ
ف .... قبۃ السلسلہ
ص .... قبۃ المعراج
ق .... قبۂ جبرئیلؑ
ر .... کرسیٔ عیسیٰ علیہ السلام
ش .... قبۂ سلیمانؑ

باب پنجم

بیت المقدس

(بسلسلۂ باب گزشتہ)

احاطۂ حرم کے دروازے — دالان — حرم شریف کا رقبہ — تالاب اور چوہڑ — کنیسۃ الکمامہ — آتش مقدس کا معجزہ — روضہ "جسمانیہ" — مقبرہ دوشیزہ — دوسرے مشہور گرجا؛

شہر کے دروازے — القلعہ — وادی جہنم اور مقبرۂ البسلوم — میدان — الساہرہ — عین سلوان — بیر ایوب — غار قارون —

احاطۂ حرم کے دروازے

احاطۂ حرم کے پھاٹک یا بڑے بڑے دروازوں کی شناخت کے متعلق مجھے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں نظر آتی کہ کرنل سر سی ولسن کے ایک مضمون کے اقتباسات بلفظہٖ نقل کردوں جو پیلس ٹائن ایکس پلوریشن فنڈ" کی "سہ ماہی کیفیت" ماہ جولائی ۱۸۸۸ء (صفحہ ۱۴۱) میں شائع ہوا تھا اور سفرنامہ ناصر خسرو کے ترجمے میں بھی، جسے میں نے کیا اور "پیلس ٹائن پلگرام ٹیکسٹس" کے سلسلے میں چھپا ہے، اس مضمون کو دوبارہ ضمیمہ ج کی صورت میں داخل کتاب کرلیا ہے۔ اس کی مجوزہ شناختوں

باب پنجم

سے میں کلیتہً اتفاق رکھتا ہوں اور سر سی ولسن سے جیسی کچھ مدد مجھے اس الجھے ہوئے مسئلہ کے صاف کرنے میں میسر آئی ہے، اس پر اپنی احسان مندی کا یہاں اعتراف کرتا ہوں ؛

لیکن دروازوں کی شناخت کا مسئلہ چھیڑنے سے پہلے مناسب محل ہوگا کہ ہم اپنے سب سے قدیم دو ماخذوں، یعنی ابن الفقیہ اور ابن عبد ربہ کی تصانیف سے دروازوں کی فہرستیں نقل کر دیں جس کے بعد مقدسی کی فہرست اور پھر ناصر خسرو کی تفصیلی کیفیت جو ۱۰۴۷ء میں اس نے تحریر کی، درج کرینگے اور پھر یہ آسانی سے ممکن ہوگا کہ قدیم دروازوں کے جو مختلف نام لکھے ملتے ہیں، ان کا موجودہ ناموں سے مقابلہ کیا جائے ؛

ابن الفقیہ ۹۰۳ء میں اور ابن عبد ربہ ۹۱۳ء میں دروازوں کی فہرست میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ انھوں نے حرم شریف کی محرابوں اور گنبدوں کے ذکر میں ان کا ضمناً اور بلا ترتیب ذکر کر دیا ہے۔ ان کے بیان کردہ دروازوں کے نام حسب ذیل ہیں :-

ابن الفقیہ	ابن عبد ربہ
باب داؤدؑ	باب داؤدؑ
باب سلیمان	
باب حطہ	باب حطہ
باب النبیؐ	باب محمدؐ
باب التوبہ	باب التوبہ
باب الوادی	
باب الرحمہ	باب الرحمہ
باب الاسباط	ابواب الاسباط (تعداد میں چھ)
باب دار ام خالد	

باب پنجم

باب الولید ــــــــ
باب الہاشمی ــــــــ
باب الخضرؑ ــــــــ
باب الصخرہ ــــــــ

دوسری فہرست مقدسی نے ۹۸۵ء میں مرتب کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "احاطۂ حرم میں تیرہ (۱۳) راستوں سے داخل ہوتے ہیں اور بیس دروازے اس میں کواڑوں کے ہیں اُن کے نام یہ ہیں :-

(۱) باب حطہ۔
(۲) دو دروازے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پر۔
(۳) محراب مریمؑ کے دروازے۔
(۴) دو دروازے "باب الرحمہ"۔
(۵) باب برکۂ بنی اسرائیل۔
(۶) ابواب الاسباط۔
(۷) ابواب ہاشمیہ۔
(۸) باب الولید۔
(۹) باب ابراہیمؑ۔
(۱۰) باب ام خالد۔
(۱۱) باب داؤدؑ۔

(مقدسی۔ ۱۷۰)

بیت المقدس کی خوبیاں گنواتے وقت مقدسی نے ایک جگہ ایک اور دروازے "باب السکینہ" اور قبۃ السلسلہ کا بھی ذکر کیا ہے (صفحہ ۱۵۱) مقدسی کے حالات نوشتہ ۹۸۵ء اور ناصر خسرو کی سیاحت ۱۰۴۷ء کے درمیان دو زلزلے آئے جن سے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو اتنا کچھ نقصان پہنچا۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۰) اس میں دروازوں کو بھی بلا شبہ نقصان پہنچا ہو گا۔ یہ تو ہمیں کتابات سے یقین کے ساتھ علم ہے کہ احاطۂ حرم کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں اور جب زلزلوں کے بعد از سرِ نو ڈیوڑھیاں تعمیر ہوئیں تو معلوم

باب پنجم

ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں انھیں نئے ناموں سے موسوم کر دیا گیا ۔
ناصر خسرو ابواب کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے :-
"حرم شریف کا فرش پتھر کا ہے اور جوڑ سیسے سے جمائے ہیں[1] جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں احاطہ حرم شہر کے مشرقی حصّے میں واقع ہے اور اس حصے میں آپ اس کے خوبصورت مسقّف دروازے سے داخل ہوتے ہیں جس کا ارتفاع ۳۰ درع (= ۶۰ فیٹ) اور عرض ۲۰ درع ہے۔ مسقف کے دو پہلو اور کھلے ہوئے دالان ہیں اور چھتے اور دالانوں کے صندلے پر ایسی رنگین و خوشنما مینا کاری کی ہے کہ دیکھنے سے آنکھ خیرہ ہو جاتی ہے۔ چھتے کے اوپر مینا کاری ہی میں ایک کتبہ لگا یا ہے جس میں سلطان (فاطمی خلیفہ) مصر کے القاب درج ہیں اور جب سورج کی اس پر شعاعیں پڑتی ہیں تو وہ چمک پیدا ہوتی ہے کہ آنکھ اس کی جوت کی تاب نہیں لا سکتی ۔ مسقف کے اوپر چوکور پتھروں سے ایک بڑا گنبد بنا دیا ہے۔ دروازہ بند کرنے کے دونوں پٹ بڑے اہتمام سے بنائے ہیں۔ ان پر سامنے کے رخ پیتل کا دمشقی کام اور ایسی جلا کی ہے کہ سونا معلوم ہوتا ہے اور انکو مختلف نقوش سے مزین کیا ہے۔ ان میں سے ہر پھاٹک ۱۵ درع (۳۰ فیٹ) بلند اور ۸ درع عریض ہے۔ اس مسقف دروازے کا نام باب داؤد ہے علیہ السلام ۔
باب داؤدؑ سے (احاطۂ حرم میں) داخل ہوں تو دائیں طرف دو بڑے دالان ملتے ہیں[2] جن میں سے ہر ایک کے سنگ مرمر کے ۲۹ ستون ہیں اور ان کے پائے اور ردے رنگین سنگ مرمر کے ہیں جن کے جوڑ سیسے سے ملا دئے ہیں۔ ستونوں کے اوپر محرابیں اٹھائی ہیں جن میں چونا یا گچ مطلق نہیں لگایا بلکہ ہر محراب صرف پانچ یا چھ بڑے بڑے پتھروں کو جوڑ کر

---

[1]:- ان اعداد کی ترتیب وہ رکھی ہے جس ترتیب سے یہ دروازے دیواروں میں بنے ہوئے ہیں ۔ (دیکھو صفحہ ۲۲۸)
[2]:- یہ دالان حرم شریف کی مغربی دیوار کے برابر برابر چلے جاتے ہیں۔

تیار کردی ہے۔ یہ دالان مقصورہ[1] کے قریب تک چلے گئے ہیں (یعنی مسجد اقصیٰ) کی اصلی عمارت تک) اور باب داؤدؑ کے بائیں ہاتھ پر جانب شمال بھی ۴۶ محرابوں کا ایک طویل دالان ہے جس کے ستون سنگ مرمر کے ہیں۔

(۲) دیوار کے اس حصے میں (یعنی باب داؤدؑ اور حرم شریف کے شمال مغربی زاوئے کے درمیان کے دالان میں) وہ دروازہ ہے جسے باب السقر کہتے ہیں۔

(۳) شمالی حصے میں ایک راستہ ہے جس کے دو دروازے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک سات درع طویل اور ۱۲ درع بلند ہے یہ پھاٹک باب الاسباط کہلاتا ہے۔

(۵) باب اسباط سے گزر جانے کے بعد ایک اور بڑی ڈیوڑھی حرم شریف کے عرض یعنی شمالی دیوار میں بنی ہوئی ہے جو مشرق کی طرف جاتی ہے۔ اس میں باب الاسباط کے دروازوں کے برابر کے تین دروازے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے ہیں جنھیں لوہے سے ڈھالا اور برنجی کام سے آراستہ کیا ہے جس سے زیادہ نفیس کام کہیں نہ ہوگا۔ ان دروازوں کو باب الابواب کہتے ہیں کیونکہ اور جگہ دروازے دُہرے ہیں اور یہ ڈیوڑھی تین دروازوں کا مجموعہ ہے"۔

حرم شریف کے شمالی حصے سے ملا ہوا اور مذکورۂ بالا دونوں دروازوں کے درمیان ایک دالان ٹھوس ستون کی محرابوں پر قائم ہے۔ اسی سے ملا ہوا ایک گنبد لمبے لمبے ستونوں پر بنایا ہے اور قندیل و فانوس سے اس کی زیب و زینت بڑھائی ہے۔ اسے قبۂ یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کیونکہ یہ آنحضرتؑ کی عبادت کا مقام ہے۔

(۳) حرم شریف کے عرض میں (یعنی شمالی دیوار میں) آگے بڑھ کے

---

[1] ناصر خسرو نے مسجد اقصیٰ کے بڑے دالان کا اکثر "مقصورہ" کے لفظ سے ذکر کیا ہے حالانکہ مقصورہ دراصل مسجد کے اندر اس حصے کا نام ہے جس کو کٹہرے سے گھیر دیا ہے اور جس میں سلطانی منبر بنا ہوا ہے۔

باب پنجم

ایک اور دالان ملتا ہے جس کی دیوار میں ایک بڑا دروازہ صوفیہ کے ان دو زاویوں کو لے جاتا ہے جو اس فرقے کی عبادت کا مقام ہیں اور انہی نے یہاں نہایت خوبصورت محراب تعمیر کی ہے۔ صوفیوں کی تھوڑی بہت تعداد یہاں ہمیشہ اقامت گزیں رہتی ہے اور وہ اپنی روزانہ نمازیں اسی محراب میں ادا کرتے ہیں۔ بجز روز جمعہ کے جب کہ وہ نماز جمعہ جماعت کے ساتھ پڑھنے کی غرض سے حرم شریف میں آتے ہیں۔ حرم شریف کے شمالی (غربی ؟) زاویئے میں ایک خوبصورت دالان ہے اور اس پر وسیع و خوشنما گنبد بنا ہوا ہے۔ اس گنبد[1] کے اوپر کتبے میں تحریر ہے کہ یہ زکریا پیغمبر علیہ السلام کی محراب ہے کیونکہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ اس مقام پر وہ شبانہ روز عبادت فرمانے کے عادی تھے۔

(۴) حرم شریف کی شرقی دیوار میں ایک بڑا چھتہ چوکور پتھروں سے بہت خوبی کے ساتھ بنا ہوا ہے کہ دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ گویا تمام و کمال ایک ڈال سے تراش لیا گیا تھا۔ اس کی بلندی پچاس درع (۱۰۰ فیٹ) اور عرض تیس ۳۰ درع ہے اور اس پر ہر جگہ نقش و نگار ترشے ہوئے ہیں۔ اس چھتے میں دس خوبصورت دروازے، ایک دوسرے سے اتنے قریب بنے ہوئے ہیں کہ ان کے بیچ میں ایک ہاتھ کی جگہ بھی چھوٹی ہوئی نہیں ہے۔ ان کا ہر کواڑ لوہے کا ڈھلا ہوا ہے اور اس پر دمشقی پیتل کا کام ہے اور چھلے اور کھٹکے جڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت حضرت سلیمان ابن داؤد علیہما السلام نے اپنے والد بزرگوار کی خوشنودی کے واسطے بنائی تھی۔ آپ چھتے میں داخل ہوں تو شرق رویہ دو بڑے دروازے ملیں گے۔ دائیں ہاتھ والے کو باب الرحمہ کہتے ہیں اور دوسرا باب التوبہ کہلاتا ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہی باب التوبہ وہ دروازہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ سبحانہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تھی۔

---

[1] اس عمارت کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ (۲۰۴)

اس چھتے کے قریب ایک خوبصورت مسجد ہے[1]۔ گزشتہ زمانے میں یہ صرف ایک حجرہ تھا لیکن بعد میں اسے مسجد بنا لیا گیا۔ اس میں طرح طرح کے خوشنما قالین بچھے رہتے ہیں اور اس کے خدام علیحدہ مقرر ہیں۔ یہاں لوگوں کی بہت آمد و رفت ہے جو یہاں نماز پڑھنے اور توجہ الی اللہ کرنے آتے ہیں کہ جہاں داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی، شاید دوسروں کو بھی گناہوں سے توبہ و استغفار کی توفیق میسر ہو۔

اس کے آگے ناصر خسرو نے مسجد، مہد مسیح اور مسجد اقصیٰ کی کیفیت لکھی ہے (دیکھو صفحہ ۲۰۰ تا ۲۴۱) اور اس کے بعد تحریر کرتا ہے کہ:-

وہ مسجد اقصیٰ کی عمارت اصلیہ سے آگے اور حرم شریف کی مذکورہ بالا جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک دالان بیالیس[2] محرابوں کا چلا گیا ہے جس کے سب ستون رنگین سنگ مرمر کے ہیں۔ یہ اس دالان سے مل جاتا ہے جو مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ بنا ہوا یہاں تک آتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی عمارت کے اندر زمین میں ایک حوض بنا ہوا ہے جس کا ڈھکنا ڈھانک دیا جائے تو فرش کے ہمسطح ہو جاتا ہے یہ حوض بارش کے پانی کے لئے ہے جو پہنچے ہی نیچے اگر یہاں سے باہر نکل جاتا ہے۔

(۱-۷) حرم شریف کی جنوبی دیوار میں ایک دروازہ ان طہارت خانوں میں جانے کے لئے بنا ہوا ہے جہاں آب رواں موجود ہے۔ کسی کو طہارت کی ضرورت ہو تو وہ اس جگہ آتا اور حسب احکام شرع طہارت کرتا ہے۔ کیونکہ اگر طہارت خانے حرم شریف کی وسیع چار دیواری کے باہر

---

[1] - میں جانتا ہوں کہ اس سے مراد وہ عمارت ہوگی جو موجودہ کرسی سلیمانؑ کے مقام پر تھی۔ (ملاحظہ ہو نقشہ بالمقابل صفحہ ۲۰۶)

[2] - ملاحظہ ہو صفحہ ۲۲۹) یہ اس جگہ ہے جہاں مسیحی مجاہدین نے اپنے زمانے میں اسلحہ خانہ بنایا تھا اور آج کل مسجد اقصیٰ کی طرف سے اس میں سے راستہ آتا ہے اور اسے **البقعات البیضا یا اقصیٰ القدیمہ** کہتے ہیں۔

باب پنجم

رکھے جاتے تو مسجد کی وسعت کے باعث لوگ وہاں جا کے نمازوں کیوقت پر اندر پہنچ نہ سکتے تھے ؏

جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا، بیت المقدس ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے اور اس کا محل وقوع مسطح زمین پر نہیں ہے۔ بایں ہمہ حرم شریف جس جگہ واقع ہے وہ مسطح اور ہموار قطعہ ہے۔ البتہ اس کے باہر کی چاردیواری زمین کے نشیب و فراز کے باعث بلندی میں کم یا زیادہ ہے۔ جہاں کہیں یکایک بہت نشیب آگیا ہے وہاں دیوار کی بلندی سب سے زیادہ ہے کیونکہ بنیادیں گڑھے کی تہ کے اندر رکھی گئی ہیں۔ اور جہاں ٹیکرا آگیا ہے دیوار کو خواہ مخواہ نیچا بنا دیا ہے۔ خود شہر اور مضافات میں جس جگہ کی زمین حرم شریف کی سطح سے نیچی ہے وہاں لوگوں نے زمین دوز سرنگوں کی طرح چھتے بنا لئے ہیں جن کے ذریعہ صحن حرم میں پہنچ جاتے ہیں ؏

اسی قسم کے چھتوں میں سے ایک باب النبیؐ مشہور ہے (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جو قبلہ رُو یعنی جانب جنوب کھلتا ہے۔ اس چھتے کا راستہ دس درع چوڑا ہے اور زمینوں کی وجہ سے اس کی بلندی کم و بیش ہے۔ ایک مقام پر اس کی بلندی پانچ درع رہ گئی ہے تو بعض جگہ ۲۰ درع تک اونچی ہے۔ اسی زمین دوز راستے پر مسجد اقصیٰ کی اصلی عمارت تعمیر کی گئی ہے کیونکہ چھتے کی چنائی ایسی پختہ اور سنگین ہے کہ اس کے اوپر اتنی بڑی اور عظیم الشان عمارت استادہ ہے اور نیچے کے چھتے کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ واقع میں اتنے بڑے بڑے پتھر اس میں لگائے ہیں کہ عقل میں نہیں آتا کہ انھیں آدمیوں نے اٹھایا اور یہاں لگایا ہوگا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی تعمیر ہے اور نبی کریم علیہ التحیاۃ والتسلیم شب معراج اسی راستہ سے گزر کر مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے کیونکہ راستے کا بیرونی دروازہ مکہ معظمہ کی جانب ہے۔ اس چھتے کے دروازے کے قریب دیوار میں پتھر پر ایک سپر کا نقش ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ عمّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی ڈھال کا نقش ہے جو ایک مرتبہ

پشت پر سپر باندھکر اس دیوار کے سہارے کمر لگا کے بیٹھے تھے جس سے یہ نقش پڑ گیا۔ حرم شریف کے زمین دوز راستے کی اس ڈیوڑھی میں دُہرے پٹ کے دروازے ہیں اور اس کے باہر حرم شریف کے احاطے کی دیوار پچاس(۵۰) درع کے قریب اونچی ہے۔ اس ڈیوڑھی کو زمین دوز بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مضافات میں جو لوگ ترچھے رُخ دور رہتے ہیں وہ شہر کے دوسرے محلّوں میں چکر کھائے بغیر اس راستہ کے اندر ہی اندر بے تکلف حرم شریف میں آسکیں۔ ڈیوڑھی کے دائیں جانب دیوار میں ایک پتھر کی ڈال گیارہ[1] درع اونچی اور چار(۴) درع عریض لگی ہوئی ہے جو دیوار کے سب پتھروں سے بڑی ہے اگرچہ بعض اور پتھر بھی ۴ ضرب ۵ درع کے پائے جاتے ہیں جو تیس تیس چالیس چالیس درع کی ارتفاع پر دیواروں میں چنے ہوئے ہیں۔

(۷) حرم شریف کے عرض میں ایک دروازہ مشرق کی طرف کھلتا ہے جسے باب العین کہتے ہیں کہ اسی سے گزر کر آپ اس نشیب تک پہنچتے ہیں جہاں (چشمہ یا) عین صلوان واقع ہے۔

(۸) ایک اور گزرگاہ کا دروازہ بھی زمین دوز بنایا ہے اور اسے باب حطہ کہتے ہیں روایت ہے کہ اسی دروازے سے اللہ تعالیٰ سبحانہ نے بنی اسرائیل کو حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا جیسا کہ فرمایا ہے "وادخلوا الباب سجدًا وقولوا حطّۃ نغفر لکم خطایاکم وسنزید المحسنین" سورۂ بقر)۔

(۱-۱) حرم شریف میں ایک اور دروازہ موسوم بہ باب السکینہ بھی ہے جس کے متصل کمرے میں کئی محرابوں کی ایک مسجد ہے۔ اس دروازے کو بند کرا دیا گیا ہے کہ کوئی آ جا نہیں سکتا کہتے ہیں کہ وہ تابوت سکینہ جس کا قرآن شریف میں ذکر آیا ہے ایک وقت میں یہیں رکھا تھا مگر بعد میں اسے

[1] دوسرے مسودوں میں "پندرہ" درع جو بڑی چار دیواری کے پتھر ہیں۔

باب پنجم

فرشتے اٹھا کر لے گئے ؛ الغرض، جیسا کہ ہم نے اوپر شمار کیا بیت المقدس کے حرم محترم کے کل دروازے یا ڈیوڑھیاں تعداد میں نو ہیں (۹)؛ (ناصر خسرو ۲۹ تا ۳۲ - ۳۹ تا ۴۳)؛

ناصر خسرو کے اس بیان میں جو نام آئے ہیں۔ ان میں اختلاف کی بہت سی گتھیاں ہیں جن کو سر سی ولسن نے نہایت خوبی سے سلجھایا ہے اور اسے انہی کے الفاظ میں نقل کرنا بہتر ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"مقدسی (۹۸۵ء) اور ناصر خسرو (۱۰۴۷ء) کے بیانات کا آپس میں، اور مجیر الدین (۱۴۹۶ء) کے بیان کا موجودہ آثار قدیمہ کے ساتھ مقابلہ کرنے سے مجھے کئی دروازوں کا صحیح پتہ چلانے اور یہ ثابت کرنے میں سہولت ہوئی کہ دروازوں کے عربی ناموں میں یہ تبدیلی گیارھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان ہوئی ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ خاص اس وقت جب کہ سلطان صلاح الدینؒ نے شہر کو دوبارہ تسخیر کیا؛ باب النبیؐ کی جو کیفیت ناصر خسرو نے لکھی ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کے نیچے کے رخ واقع تھا، اسے پڑھ کر یہ شناخت کرنا ذرا بھی مشتبہ نہیں رہتا کہ یہ وہی دُہری ڈیوڑھی اور راستہ ہے جو مسجد کے نیچے سے ہوتا ہوا حرم شریف میں اوپر تک آتا ہے۔ ناصر خسرو نے ایک اور زمین دوز دروازے باب حطہ کا حال لکھا ہے اور اس وقت حرم شریف میں اس طرز کا صرف ایک ہی دروازہ باب محمدؐ موجود ہے جو باب المغاربہ کے نیچے تیغا کیا ہوا ہے؛ اب اگر مقدسی کے بیان کردہ ابواب کی طرف متوجہ ہوں، تو ان میں وہ سب سے پہلے باب حطہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کا دوسرا دروازہ باب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اس فہرست کا آخری دروازہ باب داؤدؑ ہے جو بلاشبہ اس زمانے کا باب السلسلہ ہے۔ اس ترتیب کے دیکھنے سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ مقدسی نے تمام ابواب کو ایک سرے سے باترتیب بیان کیا ہے اور باب حطہ سے شروع کر کے باب داؤدؑ پر فہرست ختم کی ہے اور محض بلا ترتیب دروازوں کا حال نہیں لکھ ڈالا ہے جیسا کہ گمان ہو سکتا تھا؛

ان قدیم دروازوں کو موجودہ دروازوں کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کی جائے تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ حرم شریف کی عمارات اور اطراف و جوانب میں مختلف زمانوں میں بہت کچھ ردّو بدل کیئے جا چکے ہیں۔ مثلاً مجاہدین صلیبی کی حکومت کے زمانے میں۔ یا مسلمانوں کی دوبارہ تسخیر کے وقت یا اس وقت جب کہ سلطان سلیمان نے سولھویں صدی میں چار دیواری کو از سر نو تعمیر کرایا۔

مقدسی نے جس ترتیب سے فہرست ابواب تیار کی ہے اور باب حطّہ سے اسے آغاز کیا ہے، اس کی تطبیق کے واسطے ناصر خسرو کی فہرست کو بالکل الٹ دینا پڑے گا جو دوسرے سرے یعنی باب داؤدؑ سے داخل ہوا اور بائیں طرف چلتا ہوا دروازوں کو اس ترتیب سے بیان کرتا ہے جو مقدسی کی ترتیب سے معکوس ہے اور اس ترتیب سے بھی جس کو ہم نے ذیل میں اختیار کیا ہے۔ ناصر خسرو کے منقولہ بالا بیان میں ہم بعد کے مصنفوں کے چند اقوال کا اور اضافہ کرتے ہیں اور ان سب کے آخر میں سیوطی کا بیان نقل کریں گے، جو ۱۴۷۰ء میں کتاب مرتب کرتے وقت ان ابواب میں وہ تاریخ و کیفیت بیان کرتا ہے جو کہ سلطان صلاح الدینؒ اور اس کے اخلاف کی از سر نو تعمیر کے بعد اس کے علم میں آئی۔ اسی کیفیت کو مجیر الدین نے بلفظہٖ نقل کر دیا ہے اور مطلق کوئی اضافہ نہیں کیا نہ اپنے پیشرو کا حوالہ دیا۔ مجوزہ تطبیق و شناخت کا خلاصہ جو آگے آتا ہے، سر سی ولسن کے مضمون محولہ بالا سے اخذ کیا گیا ہے۔

مقدسی کا باب حطّہ، ناصر خسرو کی فہرست کا نواں دروازہ اور وہ باب الحطّہ ہے جسے اس نے زمین میں کھدا ہوا ہونا بیان کیا ہے۔ ابن فقیہ اور ابن عبد ربہٖ دونوں اس باب حطّہ کا تذکرہ کرتے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱۵) لیکن صلیبیوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام بدل گیا اور اب قدیم باب حطّہ کو آج کل کا "باب البراق" یا "باب النبی محمدؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی قرار دے سکتے ہیں۔ جس کا آدھا حصّہ زمین کے اندر ہے اور جس میں موجودہ باب المغاربہ کے

باب پنجم

نیچے سے راستہ جاتا ہے اسے "باب المغاربہ" کی نسبت جو باب حطّہ کے قدیمی دروازے کے اوپر بنا ہوا تھا سیوطی نے یہ عبارت تحریر کی ہے کہ "باب المغاربہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ اہل مغرب (یعنے باشندگان الجزائر و مراکش وغیرہ) کی مسجد کے دروازے کے قریب واقع ہے جہاں یہ مغربی لوگ نماز ادا کرتے ہیں۔ اس دروازے کے نام پر جو محلہ موسوم ہے وہ شہر کے جنوب مشرقی کونے میں ہے۔ یہ دروازہ بھی باب النبیؐ کہلاتا ہے" (سیوطی - ۲۶۸ - مجیر الدین ۳۸۳)

مقدسی کے "باب بین النبیؐ" (۲) (نیز ابن الفقیہ کا "باب النبیؐ" اور ابن عبدربہ کا باب محمدؐ) لازماً ناصر خسرو کے دروازہ "باب النبیؐ" سے مطابق ہے جسے وہ جنوبی دیوار میں مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگ کی مثل بتاتا ہے اور جس سے حرم شریف میں آنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں (دیکھو صفحہ ۲۱۴) اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ دروازہ ہے جسے ناصر خسرو نے ایک دوسرے فقرے میں (صفحہ ۲۱۴) طہارت خانوں کا راستہ بتایا ہے (۲) اور پانی کے نلوں اور حجروں کے آثار باقیہ آج کل بھی اس مقام پر زمین میں دبے ہوئے نکلتے ہیں حقیقت میں "اقصیٰ کے نیچے کا" باب النبیؐ وہی دوہرا دروازہ ہو سکتا ہے جس کو ایک مدت سے تیغا لگا کے بند کرا دیا گیا ہے لیکن جو مسجد کے زمین دوز حجروں کے سرے پر ابھی تک نظر آتا ہے یہ حجرے یا تہ خانے، مجیر الدین کے زمانے (۱۴۹۶ء) میں "الاقصیٰ القدیمہ" کہلاتے تھے (مجیر الدین صفحہ ۳۷۹) اگرچہ ابن بطوطہ کا قول صحیح مانا جائے تو اس کے زمانۂ سیاحت یعنے ۱۳۵۵ء تک یہ چھتا کھلا ہوا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ "حرم شریف کے تین طرف پھاٹک بنے ہوئے ہیں لیکن قبلے کی طرف جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف ایک دروازہ ہے جس سے امام مسجد

---

(۱) مقابل کی تصویر اس قدیم چھتے کی موجودہ شکل کو ظاہر کرتی ہے۔ جنوبی دیوار کے تیغا کیے ہوئے راستے میں گھستے ہی جو گوشہ ملتا ہے وہاں سے یہ تصویر لی گئی ہے۔

میں داخل ہوتا ہے" (ابن بطوطہ - جلد اول ۱۲۱) سیوطی یا مجیر الدین کسی نے اس دروازے کا ذکر نہیں کیا ہے
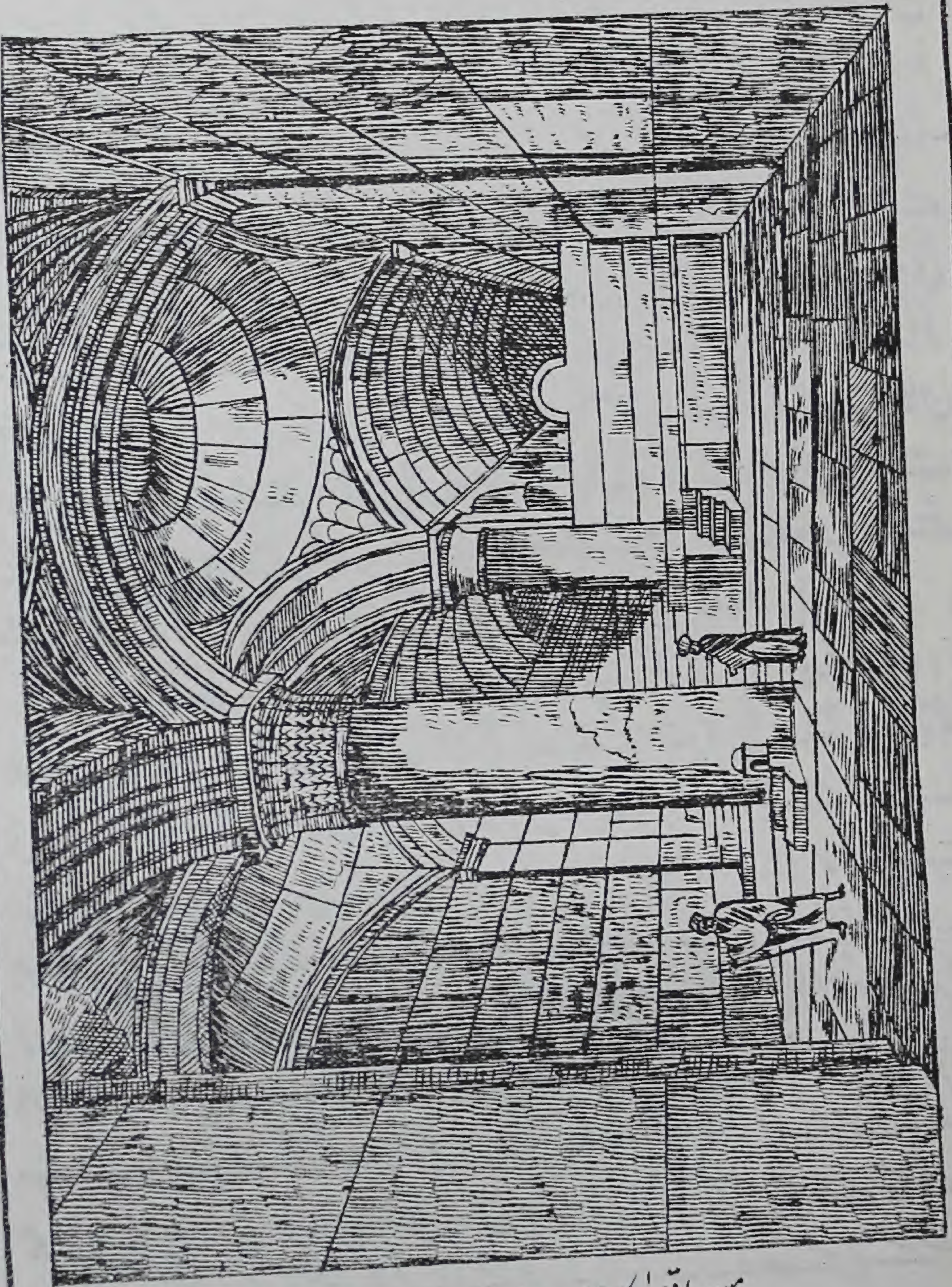
مسجد اقصیٰ کا زمیں دوز راستہ

مقدسی کے "ابواب محراب مریمؑ" (۳۔ت) لازماً محراب مریمؑ کے قریب ہوں گے۔ (جسے اب "مہد مسیح" موسوم کرتے ہیں) اور مصنف نے خود اس محراب مریمؑ کی بھی کیفیت بیان کردی ہے۔ یہ دروازے بظاہر "باب العین" کے جس کا ناصر خسرو نے حال لکھا ہے (ےٹ) کہ اس کے راستے چشمہ صلوان کو جاتے ہیں، مطابق ہے (دیکھو صفحہ ۱۹۹) اب یقینی طور پر صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ قدیم "اکہرا پھاٹک" یا ممکن ہے کہ گذشتہ زمانے کا "تہرا پھاٹک" جو دونوں جنوبی دیوار میں تھے اور مہد مسیحؑ و اصطبل سلیمانؑ کو ان میں سے راستہ جاتا تھا، اور جو اب بند کرادئے گئے ہیں، انہی میں سے کوئی نہ کوئی مذکورہ بالا دروازے کا موجودہ جانشین ہے مسیحی فرقہ الداویہ نے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، ان کے زیریں حجروں میں اصطبل بنالیا تھا۔ جب سلطان صلاح الدینؒ نے بیت المقدس کو دوبارہ فتح کیا تو مغرب و شمال کی سمت کے سوا حرم شریف میں شہر سے آنے جانے کے دوسرے سب راستے بند کیئے گئے اور اسی سلسلے میں ان دروازوں پر بھی تیغا کرادیا گیا ہو

ابن الفقیہ ایک باب الوادی کا بھی ذکر کرتا ہے (دیکھو صفحہ ۱۹۵) جو نام سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً حرم شریف کے مشرقی جانب "وادی جہنم" کی طرف کھلتا ہوگا۔ حرم کی دیوار کے اس حصّے میں اور "باب الذہب" سے ذرا جنوب میں ہٹ کر اب بھی ایک تیغا کیا ہوا دروازہ نظر آتا ہے جو غالباً ابن الفقیہ کے مذکورۂ بالا دروازے کے مقام پر ہے۔ اسی بند دروازے کی نسبت مجیر الدین نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ "احاطۂ حرم کی مشرقی دیوار میں باب الرحمہ اور باب توبہ کے جنوب میں ایک خوشنما دروازہ ہے جسے اب چونے پتھر سے چن دیا گیا ہے۔ قبۃ الصخرہ کے چبوترے کی جو سیڑھیاں درج البراق (یعنی براق کا زینہ) کہلاتی ہیں، ان کے مقابل میں یہ دروازہ واقع ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہی دروازہ تھا جس سے حضور نبی کریم علیہ التحیٰوۃ والتسلیم معراج کی رات داخل حرم ہوئے اور جو "باب البراق" موسوم ہوا۔ کچھ مدت پہلے اسے "باب الجنائز" بھی کہتے تھے کیونکہ گزشتہ زمانے
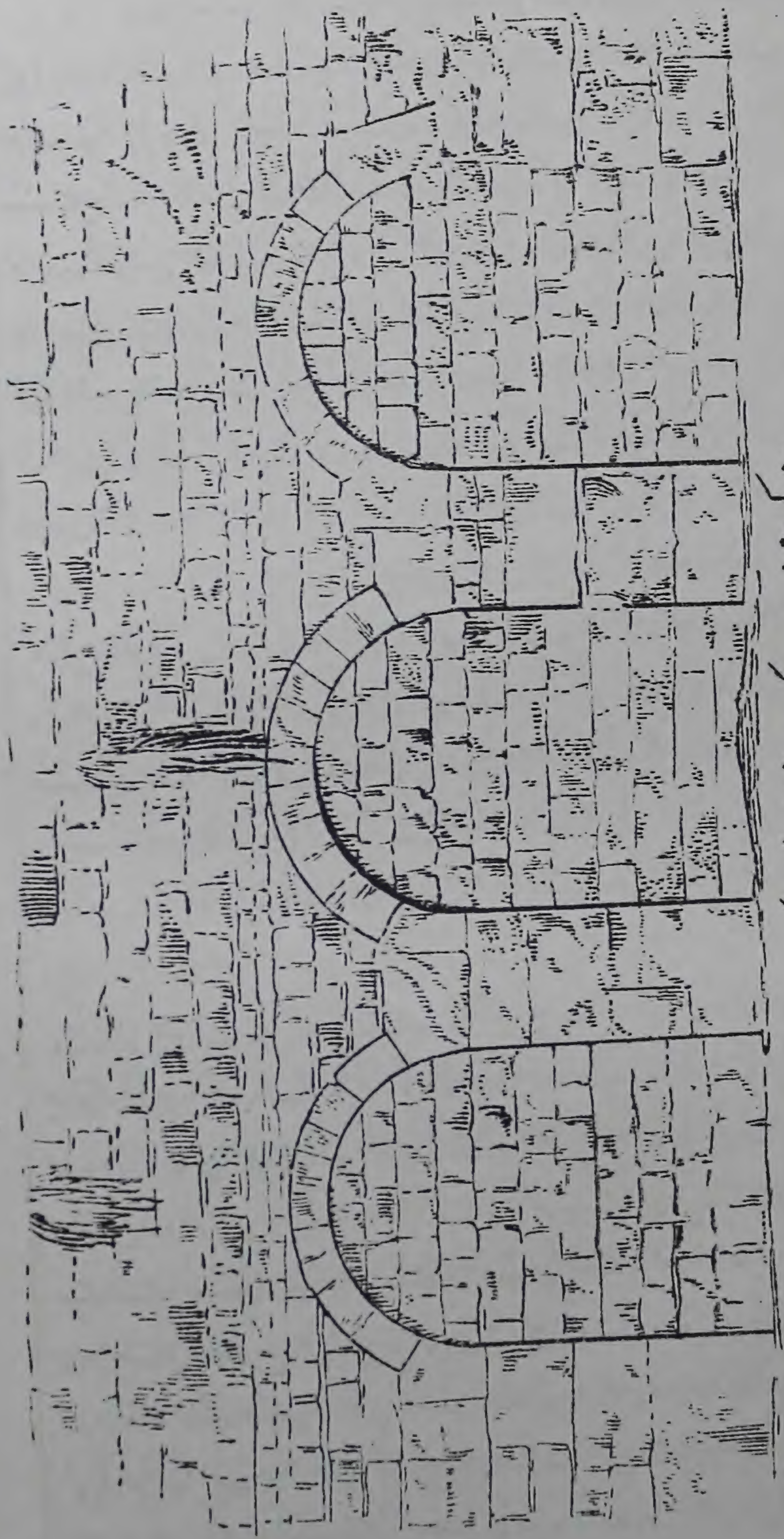
حرم کی جنوبی دیوار کے بیرونی رُخ، تین در کا دروازہ

باب پنجم

میں اسی راستے سے جنازے باہر جاتے تھے"۔ (مجیر الدین - ۳۸۰)

ظاہرا دیوار کے اسی حصے میں کسی جگہ ایک اور دروازہ "باب اریحا" بھی تھا جسے شہر کے اسی نام کے پھاٹک کے ساتھ خلط ملط کرنا نہ چاہیئے (دیکھو صفحہ ۲۵۸) اور جواب "باب استیفان" (St. Stephen) کہلانے لگا ہے۔ مجیر الدین اس دروازے کو محمد ابن کرام کے مدفن کے قریب بتاتا ہے جو کرامیہ فرقے کا بانی تھا اور ۲۵۵ھ (۸۶۹ء) میں یہاں دفن ہوا۔ پھر لکھتا ہے کہ "وہ دروازہ جسے "باب اریحا" کہتے تھے مدت سے غائب ہو گیا ہے اور فرنگیوں کے قبضے کے بعد سے اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بظاہر وہ جب کبھی ہوگا تو اس جگہ کے قریب کہیں ہوگا جو کوہ زیتون کی جانب کے مکانات کے آخری سرے پر ہے" (مجیر الدین - ۲۶۲)

ابن الفقیہ اور ابن عبدربہ کا "باب الرحمہ" اور مقدسی کے "بابین الرحمہ" (ع۲) ناصر خسرو کے باب الرحمہ اور باب التوبہ (ع۶) ہیں۔ (صفحہ ۲۱۲) یعنی مشرقی دیوار کے وہ بند پھاٹک جنھیں اس زمانے میں فرنگی "گولڈن گیٹ" ("باب الذہب") کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر مسلمانوں میں اب تک یہ باب الرحمہ اور باب التوبہ ہی مشہور ہیں۔ ان کا حال سیوطی نے حسب ذیل تحریر کیا ہے:-

"باب الرحمہ" مسجد اقصیٰ کے مشرق کی طرف اس دیوار میں واقع ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:- فضرب بینھم بسور لہ باب - باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب" (سورۃ الحدید - ع ۲)

اور اس کے آگے جو وادی ہے، اسے "وادی جہنم" کہتے ہیں۔ خود یہ دروازہ باب الرحمہ) حرم شریف کی چار دیواری کے اندر کے رخ ہے اور آیۂ مذکور میں جس دروازے کی نسبت وادی جہنم کی جانب ہونے کا اشارہ آیا وہ بند کرا دیا گیا ہے اور آئندہ اس وقت کھلیگا، جب اللہ تعالیٰ سبحانہ کی مرضی ہوگی۔ رہا باب التوبہ، تو یہ باب الرحمہ سے مل کر ایک ہی دروازہ

باب پنجم

بن جاتا ہے۔ لیکن دونوں میں سے کسی میں بھی آج کل آمد و رفت نہیں ہو سکتی۔ باب التوبہ کے قریب، اور باب الرحمہ اور باب الاسباط کے درمیان حضرت خضرؑ والیاسؑ کا مسکن ہے" (سیوطی ۲۶۵ مجیرالدین ۳۸۰) تر

ایم دووژسے کے قول کے مطابق جو فنِ تعمیر کی بنا پر رائے قائم کرتا ہے، یہ "گولڈن گیٹ" بائی زنطی عہد سے پہلے کا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں قرینہ غالب یہ ہے کہ بہت بعد میں یعنی کوئی چھٹی صدی عیسوی میں تکمیل کو پہنچا ہو۔ اس کا یہ فرنگی نام "گولڈن گیٹ" جہاں تک معلوم ہوا تیرھویں صدی سے پہلے نہیں ملتا، اور عہدِ وسطیٰ کے زائرین کی غلط فہمی کی بنا پر مشہور ہو گیا ہے جنھوں نے "ایکٹس سوم" میں یونانی زبان کی ناقص واقفیت کے باعث، لفظ ("Oupa wpaia") بمعنی "درِ خوشنما" کو وہ مقام تصور کر لیا جہاں بطرس ولی نے ایک لنگڑے کو اچھا کر دیا تھا۔ اور گو متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کرامت ضرور ہیکل کے کسی اندرونی دروازے یا محراب میں صادر ہوئی تھی، لیکن قدیم زائرین اور مجاہدین صلیبی نے حسبِ عادت اپنی خود رائی سے اس بائی زنطی عہد کی عمارت کو وہ دروازہ قرار دے لیا۔

مقدسی کا "بابِ برکاتِ بنی اسرائیل" (ص۔۔) ضرور شمالی دیوار کا وہ مشرقی سرے کا دروازہ ہے جسے ناصر خسرو (صفحہ ۲۱۱) باب الابواب کے نام سے یاد کرتا ہے (ص۔۔) اور محارباتِ صلیب کے زمانے سے ہمیشہ باب الاسباط مشہور رہا۔ اس دروازے کی نسبت سیوطی نے یہ تحریر کیا ہے: "باب الاسباط" حرم شریف کے پچھلے یعنی شمالی حصے میں، اور مسکن خضرؑ و الیاسؑ کے قریب ہی واقع ہے۔ خطیب و حافظ ابوبکر الواسطی کی کتاب فضائل بیت المقدس باب مسکن الخضرؑ" کا ذکر آتا ہے کہ وہ اس جگہ بنا ہوا ہے۔ لیکن صاحب مثیر العزام نے اولیاء اللہ کے تذکرے میں جو بیت المقدس کی سیاحت کے لیے اُس شہر میں آئے مسکن الخضرؑ کا تو حال لکھا ہے مگر اس دروازے کے موجود ہونے کا کوئی اشارہ نہیں کیا۔ کتاب الانس کا مصنف شہر ابن جوشب کی سند سے بیان کرتا ہے کہ مسکن الخضرؑ

نقشہ
مسجد اقصیٰ کا جنوبی سرا

اور احاطۂ حرم کی دیوار

قدیم دُہرے دروازے کے کھنڈر دکھانے کے لیے۔

دُہرا دروازہ
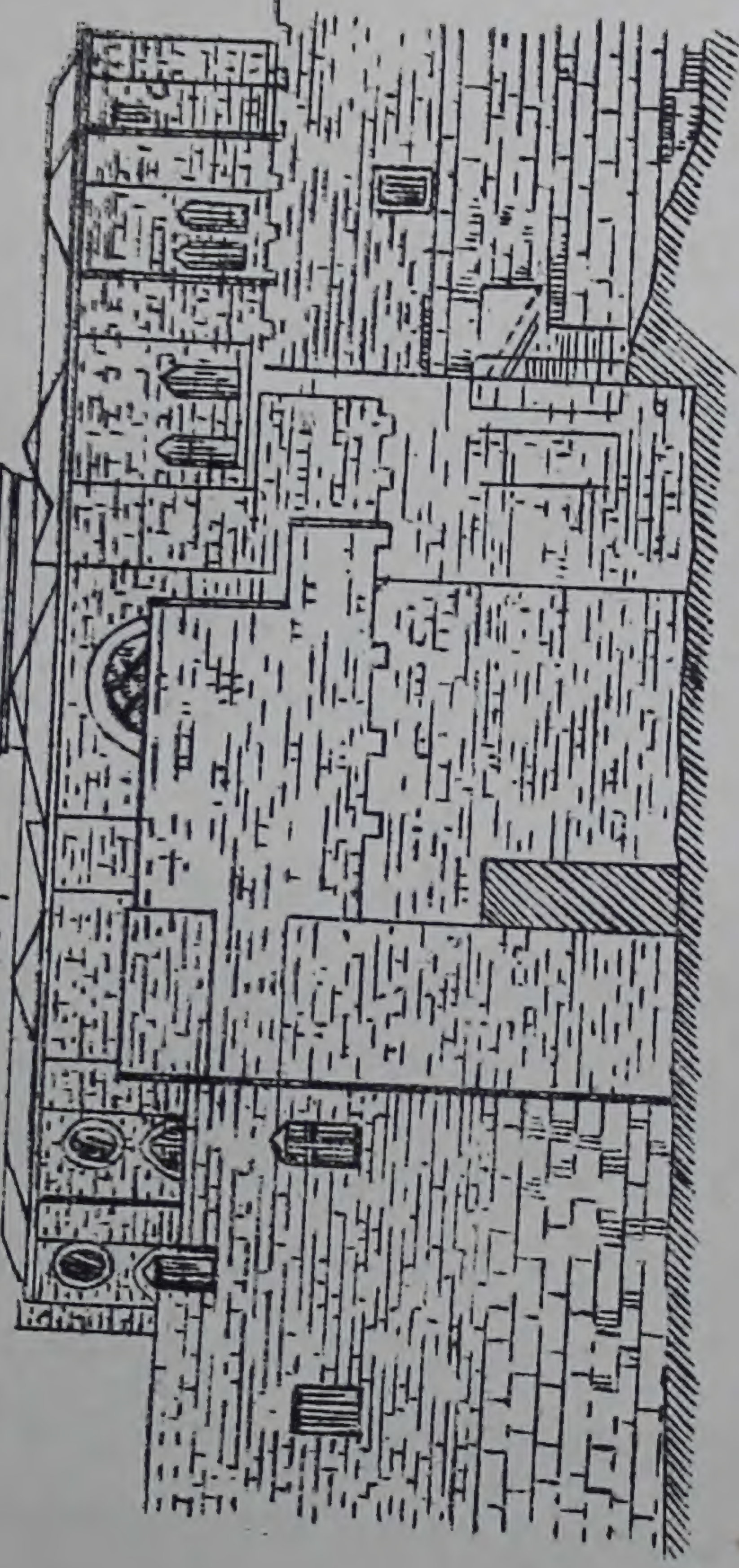
باب پنجم

باب توبہ اور باب اسباط کے درمیان کسی جگہ واقع ہے اور اسی سلسلہ میں لکھتا ہے
کہ حضرت خضرؑ جمعہ کی نمازیں پانچ مسجدوں میں پڑھا کرتے ہیں۔ یعنی مکہ معظمہ مدینہ منورہ
بیت المقدس، کی مسجدوں میں، چوتھے مسجد قبا میں (جو مدینہ منورہ سے دو میل
کے فاصلے پر واقع ہے) اور ہر جمعے کو شب کے وقت مسجد سینا میں"۔ (سیوطی
۲۶۶ - مجیر الدین ۳۸۱)

فقرۂ بالا سے خواہ مخواہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ابن الفقیہ اور ابن عبدربہ
کا باب الاسباط (صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶) نیز جیسے مقدسی نے بھی اسی نام سے لکھا ہے
(۱) اور جسے ناصر خسرو باب الابواب کے مغرب میں شمالی دیوار کو لیجانیوالا
دروازہ بتاتا ہے، وہ ضرور اس دروازے کا مرادف ہے جسے اب اور
محاربات صلیب کے زمانے سے باب الحطہ کہا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ
اوپر نظر سے گزرا ہوگا، سیوطی (۱۴۷۰ء کی تحریر میں) اس شمالی دروازے
سے وہ روایات منسوب کرتا ہے جو چار صدی قبل ناصر خسرو نے باب حطہ
کی نسبت تحریر کی ہیں اور اسے حرم شریف کے جنوب مشرقی کونے کا دروازہ
بتایا ہے۔ سیوطی لکھتا ہے کہ "باب حطہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسی سے
بنی اسرائیل کو عبادت گاہ میں داخل ہونے اور یہ دعا کرنے کا حکم ملا تھا کہ
"حطہ" یا اللہ "لذنوبنا"۔

علی ابن سلام ابن عبدالسلام کی سند سے جس نے اپنے باپ سے سنا کہ اس سے
محمدؐ ابن عبدالسلام نے حسب ذیل روایت بیان کی:-

مسجد اقصیٰ میں جو برنجی[2] کواڑوں کا پھاٹک ہے، وہ مشہور "باب الحل الاوسط"
ہے اور خسرو پرویز کی صناعت کی یادگار ہے۔ وہ برنجی پھاٹک جو حرم شریف کی
بڑی ڈیوڑھی کے سرے پر ہے وہ باب داؤدؑ ہے جہاں سے آنحضرتؐ مقام
صیہون کی منڈی کو (جو سلیمانؑ کی منڈی کہلاتی تھی) جاتے وقت گزرا کرتے تھے
رہا چھتے کا پھاٹک جسے آج کل (۱۴۷۰ء) باب حطہ کہتے ہیں، سو وہ پہلے اریحا

۱۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۶)

۲۔ موجودہ "باب السلسلہ"۔

باب پنجم

میں تھا مگر جب یہ شہر ویران ہوا تو اس دروازے کو حرم شریف میں منتقل کرلیا گیا ہو (سیوطی ۲۶۷ - مجیر الدین ۳۸۱)۔

ابواب ہاشمیہ جن کا مقدسی تذکرہ کرتا ہے (۲۷) نیز ممکن ہے کہ اسی نام کا وہ دروازہ بھی جسے معکوس ترتیب میں ابن عبدربہ نے بیان کیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۹۷) غالباً وہی دروازہ ہے جسے ناصر خسرو اپنے "باب الاسباط" کے مغرب میں اور شمالی دیوار سے "زاویۂ صوفیہ" کے راستے پر بتاتا ہے (۳۱) نظر برایں یہ وہ دروازہ ہوگا جسے آج کل باب العتم کہتے ہیں اور جو سیوطی کی وضاحت کے مطابق آج کل کی طرح اس وقت میں "باب شرف الانبیا" بھی کہلاتا تھا۔ اس کا زمانہ حال کا ایک اور نام باب الدویدار[1] ہے اور یہ حرم شریف کے شمالی رخ سے کھلتا ہے" (سیوطی ۲۶۷ - مجیر الدین ۳۸۲)۔

مقدسی کا باب الولید (۲۸) (جسے ابن عبدربہ نے دوسری ترتیب سے ذکر کیا ہے) شاید اس زمانے کا باب الغوانمہ (مغربی دیوار کے شمالی سرے پر) ہے جس کے متعلق سیوطی کی عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے لیکن اس کا یہ کہنا کہ اسی کو پہلے باب ابراہیم کہتے تھے، مقدسی کے آئندہ قول سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اس کی روایت کے بموجب باب ابراہیم (بظاہر باب الولید کے آگے جنوب کا دروازہ تھا۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ آپس میں نام بدل گئے ہوں جیسا کہ دوسری صورتوں میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ بہرحال سیوطی کی نوشتہ کیفیت یہ ہے:-

باب الغوانمہ (یعنی غانم[2] کے خاندان والوں کا دروازہ) دار النیابہ (یعنی عمال شاہی کے محل) سے ملا ہوا ہے۔ یہ حرم شریف کے مغربی جانب پہلا یا شمالی سرے کا دروازہ ہے۔ عہد ماضی میں اسے "باب الخلیل" موسوم کرتے تھے"۔ (سیوطی ۲۶۷ - مجیر الدین ۳۸۳)

---

[1] - دویدار یہ سے دویدار کا مکان مراد ہے اور اس لفظ کی اصل فارسی "دوات دار" بمعنی میر منشی ہے۔

[2] - شیخ غانم ابن علی نابلس کے قریب ۵۶۲ھ (م ۱۱۶۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ صلاح الدین نے جو خانقاہ بیت المقدس میں بنائی اور وہ "خانقاہ صلاحیہ" کہلاتی تھی اسکا صدر شیخ غانم کو مقرر کیا تھا۔

باب پنجم

لیکن یہ مطابقت اگر تسلیم کر لی جائے تو مقدسی کے باب ابراہیم کو اس زمانے کے باب السقر کا مرادف ماننا پڑے گا جس کے بارے میں ناصر خسرو نے لکھا ہے (۴۰) کہ اس کے وقت میں باب داؤد کے اوپر کی طرف مغربی دیوار میں صرف یہی ایک دروازہ تھا۔ (صفحہ ۲۱) اس طرح بہ احوال ظاہر یہ وہ پھاٹک ہے جسے فی زمانہ باب الناظر کہتے ہیں اور جس کی نسبت سیوطی نے حسب ذیل اطلاع ہم پہنچائی ہے:۔

باب الناظر وہ دروازہ ہے کہ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کبھی نہیں کھلا پہلے زمانے میں اسے "باب میکائیل ؑ" موسوم کرتے تھے اور ایک خبر کے بموجب اسی دروازے پر حضرت جبرئیل نے شب معراج براق کو باندھا تھا (سیوطی ۲۶۷۔ مجیر الدین ۳۸۳) ؎

اس دروازے کے جنوب میں اور حرم شریف کی موجودہ غربی دیوار میں بظاہر صلاح الدینؒ کے وقت کا بنا ہوا ایک دروازہ اور ہے کیونکہ سلطان ممدوح کے پہلے کی تصانیف میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ سیوطی اس کو آج کل ہی کے نام سے یاد کرتا اور حسب ذیل کیفیت لکھتا ہے:۔

"باب الحدید از سر نو (یا حال میں) تعمیر ہوا ہے۔ گزشتہ زمانے میں اسے ارغون الکاملی ؎ کے نام سے موسوم کرتے تھے جس نے مدرسہ ارغونیہ کی جو اس دروازے سے گزر کر بائیں ہاتھ کو ملتا ہے بنیاد ڈالی" (سیوطی ۲۶۸۔ مجیر الدین ۳۸۳) ؎

مقدسی کا "باب ام خالد" (۴۱) جسے ابن الفقیہ نے "دار ام خالد" کے نام سے یاد کیا ہے، غالباً وہ پھاٹک ہے جسے فی زمانہ باب القطانین (= پنبہ فروشان) کہتے ہیں یا ممکن ہے کہ اس سے اور شمال کو ہٹا ہوا وہی باب الحدید مراد ہو جس کا اوپر ذکر آیا لیکن یہ شناخت نسبتاً کم قرین قیاس ہے۔ سیوطی مقدم الذکر کی نسبت لکھتا ہے کہ باب القطانین ان دروازوں میں سے ہے جو از سر نو بنائے گئے ہیں۔ الملک الناصر ابن قلاعون وہ امیر تھا جس نے شروع میں اسے تعمیر کیا لیکن بعد میں یہ گر کے بالکل بیکار ہو گیا۔ جس وقت آخری نائب (یا والی شام

؎ والی شام متوفی ۷۵۸ھ (۱۳۵۷ء) ؎

باب پنجم

تنگیز الناصری[1] نے وہ دالان بنائے جو حرم محترم کی مغربی دیوار کے سہارے سہارے اول سے آخر تک چلے گئے ہیں، نیز سوق القطانین" کی بنیاد رکھی تو اسی کے ساتھ بلند کرسی دیکر یہ دروازہ بھی از سر نو بنا دیا جو ابتک سلامت ہے" (سیوطی ۲۶۸ - مجیر الدین ۴۳۸)

اس کے جنوب میں مڑتے ہی وہ دروازہ ملتا ہے جسے آج کل باب المتوضیٰ (= طہارت) یا باب المطارۃ (= بارش) پکارتے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی صلیبی زمانے کی بنی ہوئی ہے اور سیوطی نے اس کا "باب السقایہ" کے نام سے حسب ذیل حال لکھا ہے:-

باب السقایہ کو پرانا دروازہ بتاتے ہیں۔ گزشتہ سنین میں یہ گر کے کھنڈر ہو گیا تھا لیکن جس وقت مرحوم علاؤ الدین البصیر[2] نے وضو کے لیے حوض بنا کے وقف عام کیا تو اس ڈیوڑھی کی بھی درستی کرائی اللہ تعالیٰ اُسے آئندہ گرنے سے محفوظ رکھے (سیوطی ۲۶۸ - مجیر الدین ۳۸۲)

آخر میں مقدسی کا باب داؤد (۱) آتا ہے اور یہ حضرت داؤدؑ کا دروازہ کلاں ہے جس سے ناصر خسرو نے (۱) حرم شریف میں داخل ہو کر دروازوں کے شمار کا آغاز کیا ہے آج کل اسے باب السلسلہ کہتے ہیں اور اسی سے ملا ہوا باب السلام ہے جس کا مقدسی نے اپنے دیباچے میں باب السکینہ کے نام سے ذکر کیا ہے (دیکھو صفحہ ۲۰۹) اور ناصر خسرو نے بھی اسی نام سے (۱) اس کا حال لکھا ہے (صفحہ ۲۱۵) کہ اس میں ایک بڑا کمرہ اور بہت سی محرابوں کے ساتھ نماز کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ ان دونوں دروازوں کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے لیکن سیوطی کے زمانے میں یہ موجود تھے اور اس نے ان کی نسبت تحریر کیا ہے کہ "باب السلسلہ اور باب السکینہ پہلو بہ پہلو قائم ہیں۔ باب السلسلہ کو پہلے باب داؤد کہتے تھے، باب السکینہ اس مدرسے کے پھاٹک کے قریب کھلتا ہے جسے (مدرسۂ) بلدریہ کہتے ہیں اور قریب ہی جنوبی مینار بنا ہوا ہے۔ کلیۂ شاہی موسوم بہ مدرسۃ الاشرفیہ بھی اس دروازے کے شمال میں ہے" (سیوطی ۲۶۸ - مجیر الدین ۳۸۳)

حرم شریف کے مختلف دروازوں کی شناخت اور مطابقت جو ہمارے خیال میں آئی ذیل کے نقشے سے مجمل و جامع طور پر پیش نظر ہو جائے گی:-

---

(۱) تنگیز الہاشمی یا الناصری، سلطان الناصر محمد ابن قلاعون کے زمانے میں والی شام تھا۔ ۷۴۱ھ (۱۳۴۰ء) میں وفات پائی۔ (۲) اس کا ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں انتقال ہوا۔ دیکھو مجیر الدین ۲۰۶

مقدسی (سنہ ۹۸۵ء)	ناصر خسرو (سنہ ۱۰۴۷ء) حروف سے نقشہ بالمقابل صفحہ . . کے مواضع دکھائے ہیں	مجیر الدین (سنہ ۱۴۹۶ء)	زمانۂ حال (سنہ ۱۸۹۰ء) حروف سے نقشہ بالمقابل صفحہ . . کے مواضع دکھائے ہیں
(۱) باب حطہ	(۹) باب الحطہ (م)	باب النبی صلعم	باب النبی صلعم یا باب المغاربہ کے نیچے۔ (ع)
(۲) ابواب النبی صلعم	(۸) باب النبی صلعم (ک)	باب الاقصیٰ القدیمہ	باب الاقصیٰ القدیمہ۔ پرانا دوہرا دروازہ (ص)
(۳) ابواب محراب مریمؑ	(۷) باب العین (ط یا ی)	. . . .	قدیم اکہرا دروازہ تم یا تہرا دروازہ ن
(۴) ابواب الرحمہ	(۶) باب الرحمہ (ز) اور باب التوبہ (و)	باب الرحمہ اور باب التوبہ	باب الرحمہ (ک)، باب التوبہ (ی) اہل فرنگ کا "گولڈن گیٹ"
(۵) باب برکات بنی اسرائیل	(۵) باب الابواب (ہ)	باب الاسباط	باب الاسباط (ط)
(۶) باب الاسباط	(۴) باب الاسباط (د)	باب الحطہ	باب الحطہ (ح)
(۷) ابواب ہاشمیہ	(۳) باب زوایائے صوفیہ (ج)	باب الدوادریہ	باب العتم (ز)
(۸) باب الولید	————	باب الغوانمہ	باب الغوانمہ (د)
(۹) باب ابراہیم	(۲) باب السقر	باب الناظر	باب الناظر (ہ)
(۱۰) باب ام خالد	————	باب الحدید۔ باب القطانین	باب الحدید د، یا باب القطانین (ج)، یا باب المتوضیٰ (ب)
(۱۱) باب داؤدؑ	(۱) باب داؤدؑ اور باب السکینہ (ا)	باب السلسلہ و باب السکینہ	باب السلسلہ و باب السکینہ (ا)

باب پنجم

دالان

حرم شریف کے اندر چار دیواری کے سہارے سہارے جو دالان بنے ہوئے ہیں، وہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب اسی حالت میں اسی جگہ موجود تھے، جہاں اب نظر آتے ہیں۔ ہمارے سامنے ان کا سب سے پہلا حال مقدسی کا لکھا ہوا ہے اور وہ بیان کرتا ہے (صفحہ ۱۶۹) کہ "دائیں ہاتھ پر" (جس کے معنے ہوئے کے مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ نیز جانب عقب (یعنی شمالی دیوار کے ساتھ) حرم شریف میں دالان بنے ہوئے ہیں اور ان کی چھتوں میں اندر کے رخ میناکاری کی کیفیت بھی مصنف نے تحریر کی ہے"۔

وادی جہنم کے رخ حرم شریف کی جو مشرقی دیوار بلند ہے جس میں باب الرحمہ بنا ہوا ہے اس کے متعلق لکھا ہے کہ ادھر کوئی دالان نہیں اور نہ جنوبی دیوار کے اس حصے سے متصل کوئی دالان تھا جو مہد مسیحؑ (یعنی جنوب مشرقی کونے) سے لے کے اقصیٰ کی مشرقی دیوار تک وسیع ہے۔ ان تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدسی کے عہد میں اندرون حرم کی جہاں تک پہلوؤں کے دالانوں کا تعلق ہے، صورت بعینہ وہی تھی جیسی کہ آج کے دن نظر آتی ہے۔ مقدسی نے اس بات کے وجوہ بھی بتائے ہیں (صفحہ ۱۶۹) کہ مسجد اقصیٰ کو حرم شریف کی جنوبی دیوار کے وسط میں، جہاں تناسب قائم رہتا، کیوں نہیں رکھا گیا"۔

ایرانی سیاح ناصر خسرو (۱۰۴۷ء) ان دالانوں کی زیادہ صحیح جزئیات بہم پہنچاتا ہے جو مقدسی (۹۸۵ء) کی تحریر سے کلیۃً مطابقت رکھتی ہیں۔ ناصر خسرو کا بیان ہے کہ "مغربی دیوار سے ملے ہوئے اور باب داؤدؑ کے دائیں یا جنوبی پہلو تک دو بڑے دالان چلے جاتے ہیں اور ہر ایک میں انتیس ۲۹ سنگ مرمر کے ستون ہیں" (دیکھو صفحہ ۲۱۰) اب ان میں سے پہلا دالان تو میرے نزدیک

باب پنجم

وہ ہے جو باب داؤدؑ سے باب حطہ (موجودہ باب مغاربہ) تک چلا گیا ہے اور دوسرا اس باب مغاربہ سے لے کر جنوب مغربی گوشے تک جہاں وہ جنوبی دیوار کے بیالیس ستون والے دالان سے جا ملتا ہے۔ (دیکھو نقشہ بالمقابل صفحہ ۱۸۱x۰۰) باب داؤدؑ کے بائیں ہاتھ کو شمال میں شمال مغربی گوشے تک جو لمبا محرابوں کا طویل دالان تھا باب داؤدؑ (موجودہ باب السلسلہ) کے ساتھ ایک اور دروازہ باب السکینہ تھا جس سے قریب کے ایوان کو راستہ جاتا تھا اور اس ایوان سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں بہت سی محرابیں بنی ہوئی تھیں (صفحہ ۲۱۵) لیکن ان کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا نہ مقدسی نے جو ناصر خسرو سے صرف ساٹھ برس پہلے کا آدمی ہے اس کے موجود ہونے کا کوئی ذکر کیا حرم شریف کی شمالی دیوار کے ساتھ دالانوں میں مقدسی نے مینا کاری دیکھی تھی ناصر خسرو کے زمانے میں یہ دو الگ الگ دالانوں کی صورت میں تھے۔ شمال مشرقی گوشے کے پھاٹک (موجودہ باب الاسباط) سے جسے ناصر خسرو باب الابواب موسوم کرتا ہے اس پھاٹک تک جسے آج کل باب حطہ کہتے ہیں (اور ناصر خسرو کے ہاں اس کا نام "باب الاسباط" ہے) ایک دالان بنا ہوا تھا، جس کی محرابیں سنگین ستونوں پر قائم" تھیں (دیکھو نقشہ بالمقابل صفحہ ۱۸۱) پھر اسی پھاٹک کے مغرب میں، بظاہر شمال مغربی گوشے تک پھیلے ہوئے اور گویا مغربی دیوار کے دالان سے ملے ہوئے یکے بعد دیگرے دو دالان تھے (صفحہ ۲۱۲) اور زکریاؑ کا "بلند و خوشنما گنبد" انہی کے مغربی سرے پر یا کچھ ہٹ کے واقع تھا جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے؛

وادی جہنم کی طرف حرم شریف کی مغربی دیوار کے ساتھ کوئی دالان نہیں تھا اور جنوب مشرقی کونے سے لے کے سارے جنوبی پہلو پر، ناصر خسرو کے بیان کے مطابق "دو سو درع (= ۴۰۰ فیٹ) کے فاصلے تک" خالی دیوار بنی ہوئی تھی، جو مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار سے آملتی تھی، جیسی کہ آج کل بنی ہوئی ہے؛ ناصر خسرو کا بیان کردہ صرف ایک دالان (جس کی بیالیس[۴۲]

محرابیں تھیں، اور جنوبی دیوار کے سہارے مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار سے چار دیواری کے جنوب مغربی گوشے تک بنا ہوا تھا اور وہاں باہر کی مغربی دیوار کے دالان سے جا ملتا تھا) ایسا ہے کہ مقدسی کے ہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ دالان اسی جگہ پر تھا جہاں بعد میں عیسائیوں نے اپنا اسلحہ خانہ بنالیا تھا۔ (دیکھو صفحہ ۱۲۸)

ناصر خسرو کی سیاحت کے بعد محاربات صلیبی کی صدی اور پھر سلطان صلاح الدینؒ کی جدید تعمیر کا زمانہ آیا لیکن اس عہد کے حالات کے لیے ہمارا ماخذ صرف مجیر الدین کی کتاب ہے جو ۱۴۹۶ء میں تحریر ہوئی۔ اس نے دالانوں کو جس حالت میں دیکھا اور ان کی بنا یا تعمیر جدید کی نسبت جو تاریخیں لکھیں وہ ذیل کے اقتباسات میں مندرج ہیں:-

"چار دیواری کے اندر جانب مغرب جتنے دالان ہیں، وہ سب الملک الناصر محمد ابن قلاعون کے عہد (۱۳۱۰ء تا ۱۳۴۱ء) میں تعمیر ہوئے۔ باب مغاربہ سے باب سلسلہ تک کا دالان ۷۱۳ ہجری (۱۳۱۴ء) میں بنا۔ باب سلسلہ کے قریب کے مینار سے باب الناظر تک، جو دالان ہے وہ ۷۳۷ھ (۱۳۳۶ء) میں تعمیر ہوا اور باب الناظر سے باب الغوانمہ تک کا دالان ۷۰۷ھ (۱۳۰۷ء) میں بنایا گیا۔ شمالی دیوار سے ملے ہوئے دالانوں کی تعمیر ان عمارتوں کے ساتھ ہوئی جو ان میں سے ہر ایک کے بازو میں بنا دی گئی ہیں" (مجیر الدین ۳۷۶) مجیر الدین کے زمانے کے بعد ان دالانوں کی وقتاً فوقتاً مرمت ضرور ہوتی رہی ہوگی لیکن مجموعی طور پر یہ سب وہی ہمارے زمانے کے دالان ہیں جو ۱۴۹۶ء میں بعینہ اسی حالت میں تھے۔ (نقشہ بالمقابل صفحہ ۲۰۶)

حرم مبارک کا رقبہ و مساحت

حرم شریف کے عرض و طول کو اکثر قدیم مصنفوں نے بیان کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے بعض نے اس وسیع صحن کو خود ناپا تھا لیکن بعض نے شمالی دیوار

کے ایک پتھر کے کتبے سے عرض و طول نقل کر دیا تھا اگرچہ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کتبہ کس نے کندہ اور نصب کرایا۔ اس پتھر کا ۱۸۷۰ء میں کلیر مون گینو نے عرصے کے بعد کھوج نکالا۔ افسوس ہے کہ باد و باران سے اس کی سطح بہت کچھ خراب ہو گئی ہے (غالباً اس کی یہی حالت بہت پہلے یعنی ۱۵۱۳ء سے ہے کہ اب کتبہ صرف جزوی طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ بہر حال، ایم گینو کے قول کے مطابق جس قدر عبارت صاف پڑھی جاتی ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حرم شریف کی مسجد کا طول، سبعہ مائۃ و... ون و اربعۃ، درع ہے اور عرض چار سو پچپن درع۔ درع... درع ہے" ایم گینو کی رائے میں طول میں جو دہائی کا ہندسہ چھٹ گیا ہے وہ "ثلاثون" (= ۳۰) "یا ثمانون" (= ۸۰) کے سوا دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر طول ۷۸۴ تحریر ہے یا ۷۳۴۔ نیز درع کے متعلق ایم گینو کی رائے ہے کہ یہ شاہی درع نہیں ہو سکتا کیونکہ جتنی جگہ چھٹی ہوئی ہے اور حرف اڑ گئے ہیں ان میں عربی کا پنج حرفی لفظ "درع الملک" کندہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حروف کے جو شکستہ ٹکڑے نظر آتے ہیں وہ عربی لفظ "الملک" کے حروف سے نہیں ملتے۔

بہر حال ہمارے پاس اس بارے میں سب سے پہلی تحریر اندلسی عرب ابن عبدربہ کی ہے (صفحہ ۱۹۵) جو ۹۱۳ء کے قریب کسی زمانے میں لکھی گئی۔ یہ مصنف شمالی دیوار کی سنگی لوح کا کوئی ذکر نہیں کرتا لیکن حرم شریف کا طول ۷۸۴ اور عرض ۴۵۵ درع بتاتا ہے اور درع کو "امام" کا درع لکھتا ہے۔ لیکن ابن عبدربہ کی کتاب کے اچھے قلمی نسخے میسر نہیں آتے اور درع کی یہ تصریح صرف قاہرہ کے چھپے ہوئے نسخے کی سند پر مبنی ہے جس کی صحت ہرگز قطعی طور پر غیر مشتبہ نہیں سمجھی جا سکتی۔

ابن الفقیہ اور مقدسی جو اسی صدی کے آدمی ہیں جس کا یہ اندلسی عرب، وہ حرم شریف کی مساحت، کسرات کو چھوڑ کر، اجمالاً ہزار و سات سو درع

لکھتے ہیں اور مقدسی کی تحریر کے بموجب یہاں درع سے ہاشمی درع مراد ہے جو تقریباً ۱۸ انچ کا ہوتا تھا اس حساب سے پندرہ سو ضرب ۵۰۰ فیٹ کا طول و عرض بر آمد ہوتا ہے جو ہمارے زمانے کی سرسری مساحت یعنے پندرہ سو طول اور بالاوسط نو سو فیٹ عرض کے لگ بھگ ہے"۔

ایرانی سیاح ناصر خسرو، جو ۱۰۴۷ء میں بیت المقدس آیا، پہلا آدمی ہے جس نے اس لوح کا جو ایم گینو نے شمالی دیوار سے دوبارہ ڈھونڈ نکالی ہے صراحۃً ذکر کیا۔ یہ بیان جملہ امور متعلقہ پر بہت اچھی روشنی ڈالتا ہے اور اگر اس کے فارسی سفرنامے کے اعداد پر بھروسہ کر لیا جائے۔ (اور تمام قلمی مسودے ان اعداد میں متفق ہیں) تو یہی شہادت اس بات کا تصفیہ کردے گی کہ لوح پر طول کے متعلق اصلی عبارت کیا کندہ تھی۔ کیونکہ بظاہر ناصر خسرو کے زمانے تک کتبے کے حروف میں زیادہ خرابی نہیں آئی تھی۔ ناصر خسرو کا بیان حسب ذیل ہے:۔

"حرم شریف کی سب سے بڑی لمبائی شمال سے جنوب کی طرف ہے لیکن اگر مقصورہ (= مسجد الاقصیٰ) سے گھری ہوئی جگہ کو منہا کر دیا جائے تو صحن کی صورت قریب قریب مربع ہو جائے گی اور قبلہ جانب جنوب واقع ہوگا۔ میری خواہش تھی کہ حرم شریف کی مساحت لوں اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ پہلے اس جگہ کا ہر گوشہ و پہلو اچھی طرح دیکھنا چاہیے اور پھر کل کو دیکھ کر پیمائش کرنی چاہیے۔ لیکن حرم محترم میں کچھ روز رہنے اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے شمالی دیوار کی ایک کمان کے اوپر جو حضرت یعقوبؑ کے قبے سے زیادہ دور نہیں، ایک سنگی کتبہ مل گیا جس میں حرم شریف کا طول سات سو چار ارش (ہاتھ)، اور عرض ۴۵۵ ارش "حسب پیمانہ شاہی" مندرج تھا۔ شاہی گز یہاں وہی ہے جسے خراسان میں "گز شائرگاں"[1] (= سرکاری گز) کہتے ہیں اور جو معمولی ڈیڑھ ارش کے برابر یا اس سے کچھ کم ہوتا ہے" (ناصر خسرو۔ ۲۸ و ۲۹ و ۳۱) کو

[1] اس فقرہ میں بھی "گز" اور "ارش" مرادف الفاظ کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ دیکھو صفحہ ۱۵۵

اس معاملے میں ایک اور ماخذ ادریسی کا جغرافیہ ہے اگرچہ یہ کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ اس کا بیان ہے کہ حرم شریف کا طول ۲۰۰ باع اور عرض ۱۸۰ باع ہے اور باع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "پورے جوان آدمی کے کھلے ہوئے ہاتھوں کے درمیان کا فاصلہ" (دیکھو سین کی ڈکشنری) اب اگر باع کو ۶ فیٹ تصور کر لیا جائے تو اس سے ۱۲ سو فیٹ ضرب ۱۰۸۰ فیٹ کا طول و عرض نکل آئے گا۔

علی ہروی کی شہادت زیادہ باوقعت ہے جو ۱۱۷۳ء میں حرم شریف کی کیفیت کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ "میں نے ایک پتھر پر یہ کتبہ پڑھا کہ "حرم شریف کی کل زمین کا طول ۷۰۰ شاہی ذرع اور عرض ۴۵۵ ہے۔ یہ پتھر حرم شریف کی چار دیواری کی جو مسجد اقصیٰ کو گھیرے ہوئے ہے شمالی دیوار میں نصب ہے۔" (علی ہروی۔ نسخہ اوکسفورڈ۔ ورق ۳۷)

بارھویں صدی کے اواخر (یعنی سلطان صلاح الدینؒ کی دوبارہ تسخیر بیت المقدس سے چند سال قبل) سے جب کہ علی ہروی نے کتاب لکھی پھر کوئی تحریر ابن بطوطہ کے زمانۂ سیاحت (۱۳۵۵ء) یعنی چودھویں صدی کے وسط تک حرم شریف کی مساحت کے متعلق ہمیں نہیں پہنچی۔ ابن بطوطہ نے بیت المقدس کا حال لکھا ہے مگر اس نے اپنا سفرنامہ وطن واپس پہنچنے کے کئی سال بعد مختصر یادداشتوں کی مدد سے مرتب کیا تھا اور اسی لیے تعجب نہیں کہ وہ حرم کے طول کو عرض کی بجائے شرقاً غرباً اور عرض کو طول کے بجائے شمالاً جنوباً لکھ گیا ہے ان کی پیمائش اس نے شمالی دیوار کے پتھر کے کتبے سے نقل کی یا نہیں۔ اس کا کچھ حال نہیں لکھا۔ مسجد کی کیفیت کے سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ "کہتے ہیں اس سے بڑی کوئی مسجد نہیں شرقاً غرباً اس کا طول ذرع مالکیہ کے حساب سے ۷۵۲ ذرع اور عرض قبلے (جنوب) سے لیکر شمالی حد تک ۴۳۵ ذرع ہے۔" (ابن بطوطہ۔ اوّل۔ ۱۲۱)

مثیر الغرام کا مصنف پہلا شخص ہے جو اطلاع دیتا ہے کہ شمالی دیوار کا کتبہ اس کے زمانے میں پتھر کے گر جانے سے قدرے خراب ہو گیا ہے۔ ابو عبید الشہم

ہوگیا تھا۔ یہ ابن بطوطہ کی سیاحت سے چند سال قبل یعنی ۱۳۵۱ء کا ذکر ہے۔
ذیل کے اقتباس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ۱۳۵۱ء تک "طول" و "عرض"
کے الفاظ تو صاف پڑھے جاتے تھے لیکن درع کی قسم البتہ ایسی مشتبہ ہوگئی تھی
کہ وہ اسے ٹھیک نہ پڑھ سکا۔ واضح رہے کہ صاحب مثیر کی اس عبارت کو
بعد کے اکثر مصنفین خاص کر سیوطی (۱۴۷۰ء میں) اور مجیر الدین نے ۱۴۹۶ء میں
نقل کیا۔ اصل عبارت جو پیرس کے قومی کتب خانے کے متعدد نسخوں کو
سامنے رکھ کر صحیح کی گئی تھی، ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے سلسلہ جدید کی
جلد نوزدہم میں صفحہ ۳۰۵ پر چھپ چکی ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"ابن عساکر (متوفی ۱۱۷۶ء) بیان کرتا ہے کہ حرم شریف کا طول ۷۵۵
درع اور عرض ۴۶۵ درع ہے اور یہ حساب شاہی درع کے مطابق کیا گیا
ہے۔ ابو المعالی المشرف نے بھی اپنی کتاب میں ایسا ہی تحریر کیا ہے۔ لیکن
گزشتہ ایام میں خود میں نے حرم شریف کی شمالی دیوار میں دوادریہ کے برابر والی
ڈیوڑھی کے اوپر ایک پتھر کی لوح دیکھی تھی جس میں حرم شریف کا عرض و طول ان
راویوں کے قول کے خلاف درج تھا کیونکہ اس میں طول ۷۸۴ اور عرض
۴۵۵ درع کندہ تھا۔ مزید برآں کتبے میں درع کی قسم کی صراحت بھی تھی لیکن
مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ وہ مذکورۂ بالا درع (یعنی درع شاہی) تھا یا کوئی اور،
اس لیئے کہ اب وہ کتبہ مدھم ہوکر پڑھا نہیں جاتا۔ خود ہمارے زمانے میں جریب
سے حرم شریف کا رقبہ ناپا گیا تھا اور مشرقی دیوار کے سہارے اس کا طول
۶۸۳ اور مغربی دیوار کی جانب ۶۵۰ درع نکلا۔ ادھر عرض (یعنی شمال
اور جنوب کی دیواروں) کی پیمائش ۴۳۸ درع تھی مگر اس حساب میں بیرونی
دیواروں کا اعتبار شامل نہیں ہے۔"

مگر صاحب مثیر نے اس جگہ، جیسا کہ فوراً خیال ہوتا ہے اس درع
کا پتہ نہیں دیا جس سے اُس کے زمانے کی پیمائش میں کام لیا گیا تھا۔

اس اقتباس کو مجیر الدین نے بھی نقل کیا (صفحہ ۲۵۱) اور آگے چل کر
(صفحہ ۳۷۷ نسخہ قاہرہ) بیان کیا ہے کہ خود میں نے ۱۴۹۶ء میں دو مرتبہ

حرم شریف کی پیمائش کی کہ صحیح اعداد معلوم ہو جائیں یہ درع معماری تھا جس کا ان دنوں عام رواج تھا اور جس کی لمبائی ۲½ فیٹ کے قریب ہوتی تھی اس کے حساب سے مجیر الدین کی پیمائش کا نتیجہ یہ ہے :۔

" طول - محراب داؤد سے جنوبی دیوار کو ناپا گیا تو شمالی دیوار کے دالان کی عقب اور باب الاسباط کے قریب تک ۶۶۰ درع ہے مگر اس میں بیرونی دیواروں کا آثار نہیں ہے ؛ عرض مشرقی دیوار سے جہاں کہ وہ باب الرحمہ کے باہر کی قبروں پر سایہ ڈالتی ہے مدرسۂ تنکیزیہ کے حجروں کے نیچے اور مغربی دالانوں کے عقب تک ۴۰۶ درع ہے "

اس معماری درع کے حساب سے یہ طول و عرض ۱۱۱۵ و ۹۱۲ فیٹ کے مساوی ہوں گے ؛

ذیل کی فہرست میں مذکورۂ بالا پیمائشوں کا زمانہ وار خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ مسلمانوں کے ابتدائی زمانے سے مسجد اقصیٰ (اور اس لئے احاطۂ حرم شریف) کی جنوبی دیوار ہمیشہ اسی جگہ پر رہی جہاں کہ آج قائم ہے۔ اور مہد مسیح کی نسبت بھی جو جنوب مشرقی گوشے میں ہے، یہی کہا جا سکتا ہے۔ اور مقدسی نے بالکل ابتدائی زمانہ یعنی ۹۸۵ میں برکات بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے اور اس لئے شمال مشرقی گوشے کا مقام بھی نویں صدی سے لے کر اب تک زیادہ بدلا ہوا نہیں ہو سکتا۔ اور آخری بات یہ کہ مغربی دیوار کے اکثر ابواب کی بنا کا پتہ ہجرت کی بالکل ابتدائی صدیوں تک چل جاتا ہے، تو ان سب باتوں سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلیفہ عبدالملک کے عہد (یعنی ساتویں صدی عیسوی کے آخر) سے لے کے اب تک احاطۂ حرم کی حدود میں کچھ زیادہ رد و بدل ہوا ہو سکتا۔ اعداد کے اختلافات یقیناً کاتبوں کی غلطی سے واقع ہوئے ہیں اور کچھ درع کے اختلاف سے کہ ۱½ فیٹ کے ابتدائی ہاشمی درع سے متاخرین کے ۲ فیٹ کے شاہی درع اور پندرھویں صدی کے ۲½ فٹ کے معماری درع میں بہت کچھ کمی بیشی ہوتی رہی ہے ؛

پیمائشوں کی فہرست

۹۰۳ء ـ ابن الفقیہ ـ ۷۰۰ × ۱۰۰۰

۹۱۳ء ـ ابن عبد ربہ ـ اماَمی درع کی رو سے: ۴۵۵ × ۷۸۴

۹۸۵ء ـ مقدسی ـ شاہی ہاشمی درع کے حساب ۷۰۰ × ۱۰۰۰ (جو ۱۰۵۰ × ۱۵۰۰ فیٹ کے مساوی ہوا)

۱۰۴۷ء ـ ناصر خسرو ـ حسب کتبۂ دیوار شمالی، ۴۵۵ × ۷۰۴ شاہی درع کے حساب سے

۱۱۵۴ء ـ ادریسی ـ باع کے حساب سے ۱۰۸۰ × ۱۲۰۰ = ۱۸۰ × ۲۰۰ فیٹ ـ

۱۱۷۳ء ـ علی ہروی ـ شمالی دیوار کے کتبے اور شاہی درع کے حساب سے ۴۵۵ × ۷۰۰ درع

۱۱۷۶ء ـ ابن عساکر نقل کردہ صاحب مثیر شاہی درع کے حساب سے ۴۶۵ × ۷۵۵ ـ

۱۳۵۱ء ـ صاحب مثیر الغرام ـ کتبے کے حساب سے ۴۵۵ × ۷۸۴ درع لیکن
یہ درج نہیں کہ درع کونسا تھا؛

۱۳۵۱ء ـ صاحب مثیر الغرام ـ مشرقی دیوار کی پیمائش ۳۸۶ درع مغربی دیوار کی
۶۵۰ ـ عرض ۳۸۴ درع (مصنف نے درع کی ٹھیک قسم نہیں بتائی)؛

۱۳۵۵ء ـ ابن بطوطہ ''شاہی درع'' کے حساب سے ۴۳۵ × ۷۵۲ (عرض و طول
کی سمت سہواً باہم بدلی ہوئی ہے)؛

۱۴۹۶ء ـ مجیر الدین ـ معماری درع (= تقریباً ۲¼ فیٹ) میں اپنی پیمائش
سے: ۶۶۰ × ۴۰۶ جو ۱۴۸۵ × ۹۱۳½ فیٹ کے مساوی ہوا؛

۱۸۷۴ء ـ ایم کلیرمون گینو ـ شمالی دیوار کے کتبے کے بموجب، طول ۴۸۷ یا
۴۳۷ ـ عرض ۴۵۵ ـ درع میں جو، اس کا قیاس ہے کہ شاہی درع
نہیں ہو سکتے ـ

حوض اور تالاب

احاطۂ حرم کے نیچے کی چٹانوں میں مختلف مقام پر بہت سے حوض بنے
ہوئے ہیں جو پانی جمع رکھنے کے کام آتے تھے ـ متقدمین میں اکثر مصنفوں نے

ان کا حال لکھا ہے۔ عہد وسطیٰ میں جبرون کے قریب وادئ ارتاس کے "حضرت سلیمانؑ کے چشموں کا پانی ایک بند کے ذریعے ان حوضوں میں پہنچایا جاتا تھا اور یہ بند اصل میں پونٹیئس پائی لیٹ کا بنایا ہوا تھا (جوزیفس: اینٹ یجد ہم ۲۔ سلا) ان حوضوں کے بارے میں ناصر خسرو کا بیان حسب ذیل ہے:۔

"احاطۂ حرم کی ساری عمارتوں کی چھتوں پر سیسے کی چادریں چڑھی ہوئی ہیں فرش زمین سے نیچے بہت سے حوض اور چر چٹان کاٹ کر بنائے ہیں کیونکہ ہر جگہ حرم شریف کی سطح کے نیچے چٹانیں ہیں۔ ان حوضوں کی اتنی کثرت ہے کہ کتنا ہی زیادہ مینہ برسے پانی کا باہر بہ کر بیکار جانا غیر ممکن ہے اس لیے کہ سب کا سب حوضوں میں آکے محفوظ ہو جاتا ہے اور یہاں سے لوگ نکال نکال کے لیجاتے ہیں۔ پانی کو حوضوں تک لے جانے کی غرض سے سیسے کی نالیاں بنا دی گئی ہیں اور چر ان سے نیچے کی سطح پر ہیں جن میں سے ڈھکی ہوئی نالیاں گزرتی ہوئی حوضوں تک پہنچتی ہیں اور نہ پانی ضائع ہوتا ہے اور نہ اس میں کوڑا کرکٹ گرنے پاتا ہے۔

بیت المقدس سے تین فرسخ کے فاصلے پر میں نے "عیون سلیمانؑ" کے قریب ایک بڑا پانی کا بند دیکھا جس میں پہاڑیوں کے سب ندی نالے پر کر آتے ہیں۔ یہاں سے پانی کی ایک نہر حرم شریف تک لائی گئی ہے اور اسی لیے شہر کے سب حصوں سے زیادہ یہاں پانی کی افراط ہے۔ لیکن یوں بھی ہر گھر میں بارش کا پانی جمع رکھنے کی غرض سے (کیونکہ اسکے سوا اور کوئی ذریعۂ آب رسانی نہیں ہے) ایک حوض ہوتا ہے اور ہر شخص لازماً اپنی چھت کا پانی اس میں ذخیرہ کرتا ہے۔ حماموں اور دوسرے مقامات پر بھی جو پانی استعمال ہوتا ہے وہ سب بارش کا ذخیرہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ احاطۂ حرم کے نیچے کے حوضوں کو مرمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ سب پکی چٹانوں میں ترشے ہوئے ہیں

باب پنجم

اگر کہیں کوئی درز یا شگاف تھا بھی تو اسے ایسی مضبوطی سے چن دیا ہے کہ یہ حوض کبھی بیکار نہیں ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوایا تھا۔ ان کی چھتوں یا ڈھکنوں کی صورت نانبائی کے تنور کی مثل ہے اور ہر کھلی جگہ کو (کوئیں کے دہانوں کی طرح) اس ترکیب سے پتھر سے ڈھکا ہے کہ کوئی چیز اندر گرنے نہ پائے۔ بیت المقدس کا پانی دوسرے مقامات کی نسبت سب سے میٹھا اور پاک صاف ہے اور دو تین روز تک بارش نہیں ہوتی تب بھی نالیوں میں پانی بہتا رہتا ہے کیونکہ گو مطلع صاف ہو اور ابر کا نشان نہ ہو، تو بھی شبنم کے باعث تقاطر ہوتا رہتا ہے۔[۱] (ناصر خسرو۔ ۳۹)

وہ بڑا حوض جس کا ایک حصہ خود مسجد اقصیٰ کے نیچے کھود اگیا ہے، بیر وَرَقہ (یعنی پتے کا کنواں) کہلاتا ہے۔ وجہ تسمیہ میں سیوطی نے ایک عجیب روایت لکھی ہے (سنہ ۱۴۷۰ء) اور مجیر الدین وغیرہ بہت سے مصنفوں نے اس کو نقل کیا ہے اور یہ دراصل اسی بیان کی حشو و زوائد کے ساتھ تکرار ہے جو یاقوت (۱۲۲۵ء) نے معجم البلدان میں لفظ القلط کے تحت میں تحریر کیا ہے۔ یاقوت کا بیان آئندہ باب ہفتم میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ اس جگہ سیوطی کی روایت درج کی جاتی ہے اور آئندہ یاقوت کی تحریر سے اس کا مقابلہ کیا جا سکے گا:۔

"اب رہی، اوراق جنتہ کی روایت، تو اس کے متعلق بہت سے بیانات ہیں۔ اول ابو بکر ابن ابی مریم عطیہؒ ابن قیس کے واسطے سے بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تحقیق میری اُمت میں سے ایک شخص اپنے دو پاؤں پر جنت میں داخل ہو گا (اور واپس آئے گا) اور وہ زندہ یعنی دنیا کا رہنے والا ہو گا۔ تو اب روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایک کارروان بیت المقدس

۱۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۴ حاشیۂ ذیلی ۲

آیا کہ حرم شریف کی زیارت سے مشرف ہو۔ ان میں سے بنی تمیم کا ایک شخص شریک ابن حباشہ کوئیں سے پانی لینے گیا اور اتفاق سے ڈول نیچے گر گیا تو وہ اسے نکالنے کے لیے، خود نیچے اترا۔ اندر اسے ایک باغ کا دروازہ نظر آیا جس سے گزر کے وہ باغوں میں داخل ہوا اور چل پھر کے واپسی میں وہاں کے کسی درخت کا اس نے پتہ توڑ لیا اور اسے کان کے پیچھے رکھ کے کوئیں کے باہر چڑھ آیا۔ پھر یہ شخص حاکم شہر کے پاس گیا اور جو کچھ ان باغوں میں دیکھا تھا وہ اور اپنے جانے کا سب حال بیان کیا۔ تب حاکم شہر نے کچھ لوگ اس کے ساتھ کیے اور وہ بہت سے تماشائیوں کے ہمراہ کوئیں میں اترے لیکن کہیں دروازہ کا نشان نہ ملا اور نہ وہ باغوں تک پہنچ سکے۔ حاکم شہر نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں یہ سب قصہ لکھا اور وہ حدیث یاد دلائی کہ "میری اُمّت میں سے ایک شخص جیتے جی جنت میں داخل ہو گا ..." جواب میں امیر المومنینؓ نے تحریر فرمایا کہ "اس پتے کو دیکھا جائے اگر وہ سرسبز رہے اور پژمردہ نہ ہو تو بے شک جنت کا پتہ ہے جہاں کے پتے کبھی نہیں مرجھاتے۔ اور مذکورۂ بالا حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا گیا ہے کہ اس پتے میں کوئی خرابی واقع نہ ہو گی"۔

اس روایت کو دوسری طرح یوں بیان کرتے ہیں کہ "شریک ابن حباشۃ التمیمی بیت المقدس آیا کہ اپنے ساتھیوں کے لیے پانی لے جائے اور اس کا ڈول ہاتھ سے پھسل گیا اور اسے ڈول نکالنے کے لیے خود کوئیں میں اترنا پڑا۔ تب کسی شخص نے اُسے آواز دی کہ "تو میرے ساتھ آ" اور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے باغ فردوس میں لے آیا۔ پھر جب شریک کوئیں سے چڑھ کر واپس آیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ ماجرا بیان کیا اور رفتہ رفتہ یہ خبر امیر المومنین حضرت عمرؓ کے کان تک پہنچی اور اس وقت کعب موجود تھے جنھوں نے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ قول نقل کیا کہ اس قوم اسلام میں سے ایک شخص جنت کے باغوں میں

باب پنجم

داخل ہوگا اور پھر بھی (دنیا میں) زندہ رہے گا" اور آخر میں یہ بھی کہا کہ تم ان پتوں کو دیکھو اگر ان میں تغیر ہو تو وہ جنت کے پتے نہیں لیکن تغیر نہ ہو تو وہ بالیقین جنت کے پتے ہیں؛ اور ہمارا راوی عطیہ یقین دلاتا ہے کہ ان پتوں میں کبھی تغیر واقع نہیں ہوا؛ ایک اور روایت کے بموجب (جو الولید سے بیان کی گئی ہے' ایک شخص ابو النجم سلمیہ کے باشندوں کا امام (= پیش نماز) تھا جن میں اکثر بدوی قبائل تھے۔ اور ان میں سے بعض لوگوں نے ابو النجم سے کہا کہ ہم شریک ابن حباشہ کو جب کہ وہ سلمیہ میں رہتا تھا بخوبی جانتے تھے اور اس سے باغ جنت میں داخل ہونے کی اور وہاں جو کچھ اس نے دیکھا اور جس طرح وہ وہاں کے پتے لے کر آیا' یہ سب کیفیت پوچھتے رہتے تھے۔ اسی سلسلے میں (ان لوگوں نے بیان کیا کہ) ہم نے یہ بھی دریافت کیا کہ آیا اس کے پاس ان پتوں میں سے جو وہاں سے توڑ کے لایا تھا کوئی پتہ اب بھی باقی ہے اور جب اس نے اقرار کیا تو ہم نے اسے دیکھنے کی درخواست کی اور شریک نے اپنا قرآن شریف منگا کر اس کے اوراق میں سے ایک پتہ نکالا جو بالکل سبز تھا اور اسے ہمارے ہاتھ میں دیا۔ جب ہم نے اسے واپس دیا تو شریک نے اسے آنکھوں سے لگایا اور پھر قرآن شریف کے اوراق میں رکھ دیا۔ پھر جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی کہ یہ پتہ کفن کے اندر اسکے سینے پر رکھ دیا جائے اور اس کے آخری الفاظ یہ تھے کہ ہم کو خدا کا واسطہ دے کر ایسا کرنے کی تاکید کی تو الولید کہتا ہے' میں نے ابو النجم سے پوچھا کہ آیا تم نے اس پتے کی کیفیت بھی سنی تھی؟ ابو النجم نے کہا ہاں۔ اور وہ آڑو کے پتے کی مثل ہاتھ کی ہتھیلی کے برابر اور سامنے کی طرف سے نکیلا تھا۔" مصنف (یعنی سیوطی) کہتا ہے کہ اس بیر الورقہ کا دہن مسجد اقصیٰ میں دروازے کی بائیں ہاتھ کی طرف ہے جب کہ تم محراب کی جانب منہ کر کے مسجد میں داخل ہوئے" (سیوطی۔۔ ۲۷۰ - یہی روایت مجیر الدین نے بھی نقل کی ہے۔ صفحہ ۳۶۸) ٹو

باب پنجم

حرم شریف کے زمین دوز حوضوں کے سوا بیت المقدس میں تین تالاب با جوہڑ بھی تھے۔ مقدسی ۹۸۵ء میں تحریر کرتا ہے کہ بیت المقدس میں پانی کی افراط ہے۔ چنانچہ یہ بات ضرب المثل ہو گئی ہے کہ یروشلم میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اذان کی آواز اور پانی نہ ہو۔ واقع میں بہت کم کوئی مکان ہوگا۔ جس میں ایک یا زیادہ حوض نہ ہوں۔ شہر کے اندر تین بڑے تالاب ہیں:-

برکۂ بنی اسرائیل، برکۂ سلیمان اور برکۂ عیاد۔ ان میں سے ہر ایک کے قریب حمام بنے ہوئے ہیں اور گلیوں کی نالیاں بھی اپنا پانی یہیں پہنچاتی ہیں۔ مسجد اقصیٰ کے قطعے میں ۲۰ نہایت وسیع حوض زیرِ زمین موجود ہیں اور شہر کے بہت کم محلے ہوں گے جن میں عام حوض نہ ہوں اگرچہ ان میں بارش کا صرف وہ پانی آتا ہے جو گلی کوچوں سے بہ کے ان میں جمع ہوتا ہے۔ ایک وادی میں جو بیت المقدس سے ایک منزل پر ہے، پانی کا بند باندھا اور دو تالاب بنائے ہیں۔ جن میں جاڑوں کی بارش کی رو پہاڑوں سے بہ کر آتی ہے۔ ان تالابوں سے نہریں کاٹ کر شہر میں پانی لائے ہیں اور یہ نہریں موسم بہار میں چھوڑ دی جاتی ہیں کہ حرم شریف کے زمین دوز حوضوں کو نیز دوسرے حوضوں کو بھر دیں۔" (مقدسی - ۱۶۷)

بعد کے مصنفوں نے بھی مقدسی کے اس قول کو کہ نواحِ شہر میں تین حوض ہیں، یکے بعد دیگرے محض نقل کر دیا ہے اور آخری دو کی شناخت کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مگر واضح ہو کہ ان میں سے پہلا، برکۂ بنی اسرائیل تو وہی مشہور تالاب ہے جو آج بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور حرم شریف کے شمال مشرقی گوشے کے باہر واقع ہے۔ (دیکھو نقشہ بالمقابل صفحہ ۱۸۱ اور ۲۰۶)

علی ہروی نے اس کی روایتی وجہ تسمیہ اس طرح قلمبند کی ہے:-

برکۂ بنی اسرائیل احاطۂ حرم کے شمال میں واقع ہے کہتے ہیں کہ بخت نصر نے اسے بنی اسرائیل کے بریدہ سروں سے جنھیں اس نے قتل کیا تھا بھر دیا تھا۔ (نسخۂ اوکسفورڈ - ورق ۳۹)

باب پنجم

برکہ سلیمان اور برکہ عیاد آج کل ان ناموں سے موسوم نہیں ہوتے
برکہ سلیمان کی نسبت تو قطعی طور پر یقین ہے کہ یہ عہد وسطی کا "تعمیر اتالاب"
ہے جس کے ٹھیک مقام کا حال ہی میں پتہ چل گیا ہے (دیکھو پی ای ایف؛
"کوارٹرلی اسٹیٹ مینٹ" بابتہ ۱۸۸۹ء صفحہ ۱۱۵) کہ وہ کلیسائے سینٹ این
کے متصل تھا۔ روایات اس کے اور برکہ بنی اسرائیل کے کھدوانے کا کام
حضرت سلیمانؑ سے منسوب کرتی ہیں (دیکھو بوردو پلگرم وغیرہ وغیرہ)
برکہ عیاد حضرت عیادؓ ابن غنم کے نام سے موسوم ہے جو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی اور تسخیر بیت المقدس کے وقت
سیدنا حضرت عمرؓ کے ساتھ موجود تھے۔ مجیر الدین کے قول کے بموجب (صفحہ ۲۴۱)
انہی حضرت عیادؓ نے بیت المقدس میں ایک حمام تعمیر کرایا تھا سنہ ۲۰ھ
میں وفات پائی جو تالاب ان سے منسوب تھا وہ غالباً ہمارے زمانہ کا
برکہ حمام البطرق ہے جو یافہ دروازہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور
جیسے عام طور پر امیگ ڈالوں (یا شدہ جوزی فس) کا تالاب اور توراۃ
کا برکہ خرقیل سمجھا جاتا ہے کہ مختلف اوقات میں یہی تالاب ان ناموں سے
موسوم ہوتا رہا ہو۔
سیوطی نے سنہ ۱۴۷۰ء میں تحریر کیا اور مجیر الدین نے اسے نقل کیا ہے
(صفحہ ۴۰۹) کہ بیت المقدس میں جو تالاب ہیں ان کی نسبت وقرہ نے
ابن ابی سودہ سے روایت کی کہ بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے
ایک بادشاہ خرقیل نے بیت المقدس کے لیے ۶ تالاب بنوائے تھے
جن میں سے تین شہر کے اندر یہ تھے:- برکہ بنی اسرائیل، برکہ سلیمانؑ
اور برکہ عیاد۔ اور برکہ ماملہ اور الطرجیع کے نام کے دو تالاب شہر کے
باہر تھے۔ ان سب کے بنانے کا مقصد یہ تھا کہ اہل قدس کی آب رسانی
کے لیے پانی ذخیرہ رہے" (سیوطی ۲۷۰)
شہر کے باہر کے جن تالابوں کا اس بیان میں ذکر آیا، ان میں سے
برکہ ماملہ، شہر کے یافہ دروازے سے کچھ فاصلے پر جانب مغرب واقع ہے

اور برکات مرجیع وہ تالاب ہیں جو جنوب سے چند میل دور حضرت سلیمان کے چشموں کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جیسا کہ مقدسی وغیرہ کے اقتباسات (صفحہ ۲۳۶ و ۲۳۷) میں مذکور ہوچکا ہے۔ مجیر الدین ۱۴۹۶ء میں یہ اور اضافہ کرتا ہے کہ میرے زمانے میں برکۃ بنی اسرائیل اور برکۃ سلیمان کی شناخت نہ ہوسکتی تھی کیونکہ بیت المقدس کے لوگ ان ناموں سے ناواقف ہوچکے تھے'' (مجیر الدین - ۴۰۹)۔

کنیسۃ الکمامہ اور نصاریٰ کے دوسرے مآثر

کنیسۃ الکمامہ - بیت المقدس کے حالات لکھنے میں مسلمان مصنفوں نے قدرتی طور پر مسیحی مآثر کے احوال کو بہت کم جگہ دی ہے لیکن حضرت عمرؓ نے جس وقت ۶۳۷ء میں شہر پر قبضہ حاصل کیا تو کنیسۃ الکمامہ کی عظیم الشان عمارت جسے قسطنطین نے ۳۳۵ء میں بنایا اور خسرو پرویز نے ۶۱۴ء میں تاراج و خراب کیا اور ۶۲۹ء میں موڈس ٹس نے دوبارہ اس کی درستی کرائی'، وہ بجنسہٖ چھوڑ دیا گیا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے مقدسی کے زمانے میں بھی '' رفعت و شان میں شہرۂ آفاق اور خوبصورتی کے اعتبار سے کمال دلفریب عمارت تھی، کہ خوشنمائی میں خود قبۃ الصخرہ اور جامع دمشق سے مقابلہ کرتی تھی'' (دیکھو صفحہ ۱۴۱)

مورخ مسعودی نے بہت پہلے یعنی ۹۴۳ء میں اس گرجا کا ذکر کیا ہے۔ قدیم زمانے سے مسلمان اسے '' کنیسۃ الکمامہ '' یعنی کوڑی یا '' بٹوری'' کے گرجا کے نام سے یاد کرتے تھے اور یہ لفظ جان کر '' قیامہ '' کی بجائے اختیار کیا تھا۔ قیامہ کے معنی '' نشاۃ الثانیہ '' کے آتے ہیں اور عربی میں نصاریٰ کے ہاں یہی لفظ اس گرجا کے لیے جہاں حسب روایت نصاریٰ مسیح علیہ السلام

مدفون اور دوبارہ زندہ ہوئے) استعمال ہوتا تھا۔ وہ ڈھونگ جسے "آگ کا معجزہ" کہتے ہیں اسی گرجا میں تھا اور سب سے پہلے مسیحی زائر برنارڈ "دی وائز" (= العاقل) نے ۸۶۷ء میں اس کا حال لکھا۔ پس مسعودی کی کوئی اسی برس بعد کی یہ شہادت کہ یہ معجزہ نصاریٰ کے کنیسۃ الکمامہ میں ظہور میں آیا، جو قبۃ الصخرہ[۱] سے بالکل جدا اور مشہور و معروف عمارت تھی اس نظریے کا تار و پود بکھیر دیتی ہے کہ مسلمانوں کا قبۃ الصخرہ اصل میں قسطنطین کی بنائی ہوئی عمارت (کچہری) ہے۔ مسعودی اس معجزے کی نسبت بھی شکوک رکھتا ہے اور اس کا بیان حسب ذیل ہے:۔

شامیوں کے مہینے تشرین اول کی پانچ تاریخ کو بیت المقدس میں کنیسۃ الکمامہ کا تہوار منعقد ہوتا ہے۔ ملک ملک سے نصاریٰ اس کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس روز آسمان سے شعلہ آتش نزول کرتا ہے جس سے وہ اپنی شمعیں جلا لیتے ہیں۔ بہت سے مسلمان بھی تماشہ دیکھنے کی غرض سے اس میلے میں جاتے ہیں۔ اس موقع پر زیتون کے پتے توڑنے کی بھی رسم ہے۔ اس بارے میں نصاریٰ بہت سے قصے بیان کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ آگ بڑی حکمت سے دکھائی جاتی ہے جو ایک خاص راز ہے۔" (مسعودی۔ سوم۔ ص ۴۰۵)

اسی مصنف کا ایک اور فقرہ بھی قابل غور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳۲ھ میں بیت المقدس کے کتنے اور کون کون سے گرجا نصاریٰ کے ہاتھ میں تھے۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد کی تاریخ بیان کر کے مسعودی نے اس فقرے پر باب ختم کیا ہے:۔

سب سے پہلے حضرت سلیمان نے حرم محترم کی بنا ڈالی جو اسوقت "مسجد الاقصیٰ" ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حوالی کو برکت دے۔ جب یہ عمارت مکمل ہوگئی تو آنحضرتؑ نے اپنے واسطے مکان بنانا شروع کیا اور یہی وہ

---

[۱] مسٹر فرگسن ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہی عمارت اس زمانے میں "کنیسۃ الکمامہ" کہلاتی تھی۔

عمارت ہے جو زمانے میں کنیسۃ الکمامہ کہلاتی ہے۔ بیت المقدس میں نصاریٰ کا سب سے بڑا گرجا ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر میں اور بھی کئی نہایت محترم گرجا ان کے ہاتھ میں ہیں جیسے کہ کنیسۂ صیہون جس کا زبورِ داؤد میں ذکر آتا ہے اور وہ گرجا جسے الجسمانیہ کہتے ہیں اور جس کے اندر کہتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام کا مزار ہے۔" (مسعودی۔ اول۔ ۱۱۱)

الجسمانیہ "گیس سمین" کی بگڑی ہوئی (عربی صورت) ہے۔ اصل عبرانی لفظ کے معنی یہ تھے کہ "زیتون کشید کرنے کا باغ" لیکن اس کے عربی مرادف کے معنی ہیں "مقام تجسم" (یعنی اوتار بننے کی جگہ) اور اس سے انجیل کی تاریخ کے ایک بالکل دوسرے واقعے کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔" مقدسی نے ۹۸۵ء میں کنیسۃ الکمامہ کی کوئی کیفیت نہیں لکھی صرف ضمناً حوالہ دے دیا ہے۔" (دیکھو صفحہ ۱۵ و ۱۴۲)

یہ کسی قدر مشتبہ ہے کہ مصر کے دیوانے خلیفہ حاکم نے کنیسۃ الکمامہ کے ڈھا دینے کا مشہور حکم کس سنہ میں دیا تھا۔ مغربی مصنفین اسے بالعموم ۱۰۱۰ء کا واقعہ بتاتے ہیں۔ ابن اثیر کے وقائع میں اس کا ذکر ۳۹۸ھ (۱۰۰۸ء) کے واقعات میں مذکور ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:۔

"اس سال قہرمانِ مصر الحاکم بامر اللہ نے حکم دیا کہ کنیسۃ الکمامہ منہدم کر دیا جائے جو بیت المقدس کا گرجا ہے اور نصاریٰ عام طور پر اسے القیامہ کہتے ہیں۔ نصاریٰ کے اعتقاد کے موافق اسی گرجا میں وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح دفن کیے گئے اسی لیے اطراف عالم سے وہ اس کی زیارت کے واسطے یہاں آتے ہیں۔ الحاکم نے اپنی سلطنت میں اور بھی سب گرجوں کے انہدام کا حکم دے دیا تھا اور اسی کے مطابق عمل ہوا" (ابن اثیر۔ نہم۔ ۱۴۷)

لیکن مقریزی جو ابن اثیر سے اعتبار و وقعت میں کچھ کم نہیں لکھتا ہے کہ یہ ۴۰۰ھ (۱۰۱۰ء) کا واقعہ ہے جب کہ الحاکم نے کنیسۂ کمامہ کے گرا دینے کے لیے لکھا" اور یہ عام مغربی مصنفوں کے قول کے مطابق ہے

مگر مقریزی کے خلاف، مجیر الدین ابن اثیر کی تاریخ ہی تحریر کرتا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:۔ "۳۹۸ھ (= ۱۰۰۸ء) میں خلیفہ حاکم نے حکم دیا کہ کمامہ کو ڈھا دیا جائے لیکن اس کے فرزند المستنصر کے زمانے میں روم کے (نصرانی) بادشاہ کو اجازت مل گئی اور اسے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا" (مجیر الدین۔ ۲۶۹)

جس رومی بادشاہ کا اشارہ کیا گیا ہے وہ ایک قول کے مطابق شاہ کونس ٹین ٹاین مونوماکس تھا جس نے نیک فورس بطریق کی نگرانی میں ۱۰۴۸ء کے قریب گرجا کی از سر نو تعمیر کرائی لیکن دوسری روایات میں آتا ہے کہ یہ تعمیر جدید شہنشاہ میکائیل چہارم (پیف لیگونی) کے عہد میں ہوئی جس نے پانچ ہزار مسلمان قیدیوں کو چھوڑنے کی شرط پر المستنصر کی منظوری حاصل کی۔

۱۰۴۷ء میں ایرانی سیاح ناصر خسرو بیت المقدس کی سیاحت کو آیا اور صلیبیوں نے بعد میں جو ردّ و بدل اس گرجا میں کیے ان سے پہلے کی کیفیت وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"اس مبارک شہر میں نصاریٰ کا ایک گرجا ہے جسے وہ "بیعت (بیعت؟ مترجم) الکمامہ" کہتے اور نہایت محترم سمجھتے ہیں۔ ہر سال رومی سلطنت کے صدہا باشندے زیارت کے لیے یہاں آتے ہیں اور بائی زنط کا بادشاہ خود اس طرح چھپ کر آتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ ان دنوں جب کہ فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ مصر کا حاکم تھا قیصر روم اسی طرح بھیس بدل کر بیت المقدس آیا۔ حاکم کو خبر مل گئی اور اس نے اپنے ایک ساقی کو بلا کر حکم دیا کہ اس شکل و صورت کا ایک شخص بیت المقدس کی جامع میں تمھیں بیٹھا ملے گا۔ پس تو جا اور اس سے مل کر کہہ کہ حاکم نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ تو یہ نہ خیال کرے کہ میں یعنی حاکم خلیفۂ مصر تیرے آنے سے بے خبر رہا۔ لیکن وہ خوش و خرم رہے اور کوئی فکر نہ کرے کیونکہ میں اس کی نسبت کوئی بُرا ارادہ نہیں رکھتا" اسی حاکم بامر اللہ نے ایک مرتبہ حکم دیا تھا کہ یہ گرجا لوٹ لیا جائے۔ اور ایسا ہی ہوا اور یہ گرجا

باب پنجم

ویران ہو گیا۔ اور کچھ مدت اسی حالت میں پڑا رہا لیکن جب قیصر بائی زنطہ نے تحائف اور خدمت بجا لانے کے عہد و پیمان کے ساتھ سفیر بھیجے اور عہد نامہ کیا جس میں گرجا کو از سرِ نو اپنے خرچ سے، تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی تھی تو اس وقت بالآخر اجازت مل گئی ؛

آج کل یہ کنیسہ ایک فراخ عمارت ہے جس کے اندر آٹھ ہزار اشخاص کی گنجائش ہے اسے رنگین سنگ مرمر سے کمال کاریگری کے ساتھ بنایا اور تزئین و آرائش کی ہے۔ اندر کے رخ ہر جگہ سے بائی زنطی زربفت سے اسے آراستہ کیا ہے جس میں زری کے کام کی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور ان میں مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصویر بھی ہے جو مختلف اوقات میں گدھے پر سوار دکھائے گئے ہیں۔ دوسرے انبیاء جیسے حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور حضرت یعقوب کے فرزندوں کی تصویریں بھی ہیں۔ تصاویر پر اندروس کے تیل سے جلا کی ہے اور ہر شبیہ کے واسطے پتلے شیشے کی ایک تختی بنا کے اوپر لگا دی ہے جو بالکل شفاف ہے اس تدبیر سے پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی اور نقوش پر گرد و غبار جمنے نہیں پاتا۔ اور اس شیشے کو خدامِ (کنیسہ) روزانہ صاف کرتے رہتے ہیں ؛ علاوہ اس کے بیت المقدس میں اور بہت سے گرجا نہایت خوبی سے تعمیر کئے ہوئے موجود ہیں۔ مگر ان سب کا حال لکھنا بڑی طوالت کا موجب ہوگا۔ کنیسۂ کمامہ میں ایک تصویر کے دو حصے ہیں۔ ایک میں جنت اور ایک میں دوزخ کا سماں دکھایا ہے۔ اہلِ جنت، جنت میں اور دوزخی لوگ جہنم میں وہاں کے جملہ لوازم کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ دنیا میں اس کی مثل کوئی تصویر نہ ہوگی۔ گرجا کے اندر قسیس و رہبان کی جماعت کثیر بیٹھی انجیل اور نماز پڑھتی رہتی ہے اور یہ لوگ شبانہ روز اسی طرح مصروفِ عبادات رہتے ہیں ؛ (ناصر خسرو۔ ۵۹۔ ۶۱)؛

۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ حاصل کر لیا اور پرانے کلیسا کو یہ سمجھ کر کہ وہ حضرت مسیح کا مقبرہ بننے کے لائق نشان نہیں رکھتا اور

باب پنجم

حقیر عمارت ہے، انھوں نے ایک وسطی اور دو بغلی دالان بنا کے وسیع کر دیا۔ یہ اضافے غالباً بارھویں صدی کے پہلے نصف میں تکمیل کو پہنچے چنانچہ ۱۱۵۴ء میں ادریسی نے اس گرجا کی حسب ذیل کیفیت لکھی جو ظاہر ہے کہ زائرین کی زبانی حالات سنکے محفوظ کی گئی ہوگی:۔

"باف دروازے سے جسے باب المحراب کہتے ہیں اور جو بیان ہو چکا ہے کہ شہر کا مغربی دروازہ ہے، بیت المقدس میں داخل ہوں تو جانب مشرق ایک گلی سے گزرنا ہوگا جو اس عظیم الشان گرجا تک جاتی ہے جسے کنیسۃ القیامہ اور مسلمان "کنیسۃ الکمامۃ" کہتے ہیں یہ وہ گرجا ہے جہاں یونانی (= رومی) سلطنت کے مشرقی اور مغربی ہر حصے کے ملکوں سے لوگ حج کرنے آتے ہیں۔ اس (گرجا) میں مغرب کے سرے کے دروازے سے آپ داخل ہوتے ہیں اور اس کا اندرونی حصہ ایک گنبد کے نیچے وسط میں ہے گنبد پورے گرجا پر محیط اور ایک اعجوبۂ روزگار عمارت ہے۔ مذکورۂ بالا دروازے سے گرجا کی سطح نیچی ہے اور ادھر سے اندرون کنیسہ میں نہیں جا سکتے بلکہ شمال کی طرف ایک اور دروازہ ہے جس سے تیس زینے اتر کے گرجا کی نشیبی حصہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس دروازے کا نام "باب سنتا میریہ" ہے ؏

جس وقت اندرون کنیسہ میں آپ اتر آئے تو تابوت مقدس کی زیارت ہوتی ہے خود اس تابوت یا مزار شریف کے اوپر ایک گنبد نہایت مستحکم و خوشنما بنایا، اور بڑے تکلف سے آراستہ کیا ہوا ہے جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک باب سنتا میریہ کے رخ شمال کی طرف ہے اور دوسرا باب صلیبیہ کی طرف جنوب رویہ بنا ہوا ہے اسی دروازے کے اوپر گرجا کا گھنٹہ گھر ہے اور مقابل میں جانب مشرق وہ بڑا اور مقدس گرجا ہے، جہاں رومہ کے فرینک (یعنی یونانی سلطنت کے باشندے) عبادات و جماعت کی نمازیں ادا کرتے ہیں ؏ اسی مقدس گرجا کے مشرق میں مگر جنوب کی طرف ذرا ہٹا ہوا جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قید خانہ ہے جس میں وہ مقید رہے

اور سولی دیے جانے کی جگہ ہے۔ گنبد کے اندر اور ہر طرف انکی والدۂ ماجدہ حضرت مریمؑ اور حضرت یحییٰ[۱]، حضرت مسیحؑ اور دوسرے پیغمبروںؑ کی تصاویر منقوش ہیں۔ تابوت شریف کے اوپر فانوس آویزاں ہیں اور خاص مزار مبارک پر خصوصیت کے ساتھ تین سونے کے فانوس لٹکائے ہیں۔" (ادریسی ۔ ۶۰)

ایم ڈی ووگ (؟) نے محض فن عمارت کی بنا پر کنیسۂ قمامہ کی تعمیر کا جو زمانہ فرض کیا ہے[۱] گھنٹہ گھر کے ذکر ہی سے (جسے عربی میں "کنبار" کہتے تھے) وہ اس سے زیادہ قدیم ثابت ہوتا ہے۔ ہو نہ ہو گرجا کا یہی جنوبی بڑا دروازہ ہے (اور آج کل صرف اسی سے کام لیا جاتا ہے اور اسی کے شمال میں قریب ہی گھنٹہ گھر ہے) جسے ادریسی "باب صلیبیہ" کے نام سے یاد کرتا ہے یہ بات قابل یادداشت ہے کہ ادریسی کے زمانے میں گرجا کے تین دروازے تھے۔ ایک مذکورۂ بالا جنوبی۔ دوسرا اس کے مقابل "باب سنتا میریہ" شمال رو اور تیسرا مغربی دروازہ جس سے عمارت کے وسط میں جانا ہو سکتا تھا۔ یہ آخری دونوں دروازے اب موجود نہیں ہیں۔ "رہا کلیسائے یونانیاں" تو وہ ضرور اس زمانے کا "کیتھولی کون" ہوگا جو مزار شریف کے وسطی گنبد سے بالکل ملا ہوا مشرق میں واقع ہے اور آج تک یونانی فرقے کے قبضے میں ہے۔ یہ صلیبیوں کے بنائے ہوئے گرجا کا غربی نصف ہے۔

ادریسی کے چند سال بعد علی ہروی نے فلسطین کے مقدس مقامات کی کیفیت ۱۱۷۳ء میں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے قلمبند کی۔ وہ کنیسۂ قمامہ کا "صلاح الدین" کی فتح ثانی کے چند ہی سال بعد حسب ذیل مختصر احوال تحریر کرتا ہے:۔ کنیسۂ قمامہ دنیا کی عجیب ترین عمارتوں میں ہے۔ اسی کے اندر وہ قبر ہے جسے نصاریٰ "القیامہ" کہتے ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ جناب مسیحؑ کا احیا اسی مقام پر ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ یہاں پہلے

---

[۱] اپنی کتاب "Eglises de la "Terre Sainte میں صفحہ ۲۰۷ پر

"کمامہ" یعنی ہٹورا تھا' اس لیئے یہ جگہ کمامہ کہلانے لگی۔ اور شہر کے باہر بھی تھی جہاں گنہگاروں کے ہاتھ کاٹے اور قزاقوں کو سولی دی جایا کرتی تھی۔ جیسا کہ انجیل میں بھی مذکور ہے ولکن اللہ اعلم بالصواب ؂ اس جگہ نصاریٰ وہ چٹان بھی بتاتے ہیں جو ان کی روایت کے بموجب ٹوٹ گئی تھی اور آدم علیہ السلام اس کے نیچے سے برآمد ہوئے تھے کیونکہ وہ صلیب دئے جانے کے مقام کے نیچے تھی، جیسا کہ نصاریٰ کا قول ہے۱؎ یہاں حضرت یوسفؑ المعروف بہ "صدیق" کا باغ بھی بتاتے ہیں جس کی زیارت کے لیے بہت لوگ آتے ہیں۔ اسی گرجا میں (مقدس) آگ بھی نزول کرتی ہے ؂ واضح ہو کہ میں نے بیت المقدس میں فرینکوں کا طور طریق اور علوم دیکھنے اور سمجھنے کے لیے خود کئی موسم گزارے ہیں؟" (علی ہردی) (نسخۂ اوکسفورد۔ ورق ۱۴ ؂)

۵۸۳ھ میں سلطان صلاح الدینؒ نے صلیبیوں کو بیت المقدس سے مار کے نکال دیا اور بعض اقوال کی بموجب کنیسۂ کمامہ کو لوٹ کے کافی نقصان پہنچایا۔ ۱۱۹۲ء میں تیسری جنگ صلیب کے نائٹوں کو سلطان نے اجازت عطا کی کہ مزار شریف کی زیارت کریں اور سالسبری کے اسقف نے اس بات کی بھی منظوری حاصل کر لی کہ دو لاطینی راہب وہاں مقیم اور خطابت کی خدمت انجام دیں ؂ یاقوت نے ۱۲۲۵ء میں جو کیفیت گرجا کی تحریر کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حسب روایات صلاح الدینؒ کی فتح کے وقت اس کو لوٹ مار سے نقصان پہنچا تو بھی یاقوت کی تصنیف کتاب کے وقت وہ بالکل درست ہو چکی تھی جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہو گا۔ یاقوت نے علی ہردی کے قول کو نقل کر دیا ہے لیکن اپنی طرف سے بعض باتیں اضافہ کی ہیں اور آگ کے معجزہ کی عجیب ہی

۱؎۔ یہ عہد وسطیٰ کا مشہور مذہبی فسانہ ہے۔ ملاحظہ ہو "پیلسٹائن پلگریمز ٹیکسٹ" ایبوٹ ڈینیل۔ صفحہ ۱۴۔ چٹان میں اس کے برآمد ہونے سے جو شگاف پڑ گیا تھا وہ آج تک دکھایا جاتا ہے۔ روایت کے بموجب حضرت آدمؑ اسی چٹان کے نیچے مدفون ہوئے تھے جس پر حضرت مسیحؑ کو صلیب دی گئی تھی

صورت بیان کی ہے:۔

"الکمامہ" بیت المقدس میں نصاریٰ کا بڑا گرجا ہے۔ اس کی خوشنمائی کثیر مال و زر اور حیرت انگیز تعمیر کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ یہ شہر کے وسط میں واقع ہے اور گرد ایک دیوار کھینچی ہوئی ہے۔ اسی کے اندر وہ قبر ہے جسے نصاریٰ "القیامہ" کہتے ہیں کیونکہ ان کے اعتقاد کی رو سے حضرت مسیحؑ کا احیا اسی جگہ ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل نام "قیامہ" نہ تھا بلکہ "کمامہ" تھا کیونکہ شہر والے اس جگہ اُپلے تھاپتے تھے اور آبادی کے باہر کے چوروں کو پھانسی یہیں لا کے دیتے اور مجرموں کے ہاتھ کاٹتے تھے۔ لیکن جب سے حضرت مسیحؑ کو اس مقام پر سولی دی گئی، اس کا اتنا احترام جیسا کہ آج نظر آتا ہے، کیا جانے لگا۔ یہ سب واقعہ انجیل میں تحریر ہے۔ یہاں ایک چٹان کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ پھٹ گئی اور حضرت آدم اس میں سے نکل آئے کیونکہ سولی اس کی چوٹی پر دی گئی تھی۔ اسی جگہ نصاریٰ کے عقیدے میں حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کا باغ ہے اور لوگ زیارت کو آتے ہیں۔ گرجا کے ایک حصے میں ایک چراغ ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ مقررہ دن آسمان سے شعلہ اترتا اور اس کی بتی روشن کر دیتا ہے۔ اس بارے میں ایک شخص نے جو سرکاری عہدہ دار تھا اور سلطانی مصاحبین میں ہونے کے باعث نصاریٰ اس کو آنے سے نہ روک سکتے تھے (چنانچہ وہ یہ سارا معاملہ دیکھنے کی غرض سے گرجا میں ٹھہرا رہا) مجھ سے اپنا حسبِ ذیل مشاہدہ بیان کیا: "ایک مرتبہ قسیس نے آگ کے تردل میں دیر لگا دی جس کی نگرانی میں یہ کام ہونے والا تھا۔ پھر میری طرف پلٹ کر کہنے لگا کہ تیرا ہمارے پاس موجود رہنا، ہماری شریعت کے خلاف ہے، میں نے وجہ دریافت کی تو بولا، اس لیے کہ ہم ایسی بات کرتے ہیں جو ہمارے ساتھ والوں کے نزدیک تجھ جیسے آدمی سے مخفی رہنی چاہئے۔ اس واسطے مناسب ہوگا کہ تو ہمیں چھوڑ دے اور باہر چلا جائے۔ میں نے جواب دیا، اب تو میں ضرور دیکھوں گا کہ تو کیا کرتا ہے۔ کیونکہ میں نے شعبدوں

باب پنجم

کی ایک کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ تم کس ترکیب سے ایک شمع تریب لاتے ہو اور پھر پھرتی سے اس جگہ لٹکا دیتے ہو جسے لوگ نہیں دیکھتے اور نہ انھیں اس کا علم ہوتا ہے لہٰذا اسے بڑی کرامت یا معجزہ سمجھ لیتے ہیں۔" یہ روایت بھی جو (یاقوت کہتا ہے) کہ میں نے اس آتش متبرک کی نسبت سنی"۔ (یاقوت - چہارم - ۱۷۳ و ۱۷۴)۔

نصاریٰ کے دوسرے مآثر

دوسرے مسیحی مآثر کی نسبت مسلمان مصنفوں نے بیت المقدس کے حالات کی ضمن میں جو کچھ مختصر یادداشتیں چھوڑی ہیں، انھیں بھی اسی جگہ لکھ دینا مناسب اور باعث سہولت ہوگا۔

باغ "گیس سمین" جسے عربی میں "الجسمانیہ" کہنے لگے، مسعودی نے بہت پہلے ۹۴۳ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ادریسی اپنی ۱۱۵۴ء کی تصنیف میں اس مقام کی حسب ذیل کیفیت قلمبند کرتا ہے:۔

"مسجد اقصیٰ (اور احاطۂ حرم شریف) سے نکل کے آپ مشرق میں باب الرحمہ (= گولڈن گیٹ") پہنچتے ہیں، جو آج کل بند ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن اس کے قریب ایک اور دروازہ کھلا ہوا موجود ہے جو باب الاسباط کہلاتا ہے اور اس سے بہت آمدورفت رہتی ہے۔ اسی پھاٹک سے گزر کر تیراندازی کے میدان میں پہنچتے ہیں جہاں ایک نہایت خوشنما گرجا حضرت مریمؑ کے نام پر وقف ہے اور اس جگہ کو "الجسمانیہ" کہتے ہیں۔ اسی جگہ ان بی بی کی قبر جبل زیتون کے دامن میں بنی ہوئی ہے۔ باب الاسباط اور اس مقام کے درمیان تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہے"۔ (ادریسی ۸)۔

حضرت مریمؑ کی قبر کا دوسری مرتبہ ذکر علی ہروی کی کتاب میں آتا ہے جس نے ۱۱۷۳ء میں کہ بیت المقدس اس وقت تک اہل صلیب